پی بِتیاں

پنی مین باسی - ایم اے

الف

پی تِیاں

پی من باسی - ایم - اے

قیمت فی جلد
سوا تین روپے

"پی بتیاں" میں شائع شدہ افسانوں میں مقام کردار اور واقعات قطعی فرضی ہیں، حقیقی افراد مقامات اور واقعات سے ان کی کوئی مطابقت محض اتفاقیہ ہے جس کے لئے مصنف، پبلیشر یا پرنٹر پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

طباعت اوّل
ایک ہزار جلدیں

ج

شرد ساہتیہ سدن کی اوّلین پیشکش

پی تبیاں

افسانے

مصنّف

پی مین باسی ایم۔ اے

پبلیشر

شرد ساہتیہ سدن ۴-۲-۳۶۲ سلطان بازار
حیدرآباد۔ دکن۔۱

مطبوعہ:- رفیق مشین پریس کوچہ نسیم مچھلی کمان حیدرآباد دکن

ترتیب

برق میں آ نہیں سکتا یہ تڑپنا اپنا
دین اللہ کی ہے رنگ ہے اپنا اپنا

کیفی حیدر آبادی

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

(غالب)

انتساب

لُولُوانّا

کے نام

۱۲ر اگست ۱۹۵۷ء

پی۔ من۔ باسی

لولو آنا



پی بتیاں

★

اس نونہال کے نام

پی۔ من باسی نے اپنی

یہ کتاب معنون کی ہے

★

★

جن کے مشاہدات کی

جھلکیاں اس کتاب کی

ہر کہانی میں آپ

ملاحظہ فرمائیں گے

★



پروفیسر پریم بابو

تعارف

از

علامہ تمکین کاظمی

بی، من باسی صاحب سے میں پہلی دفعہ افسانہ "پاکستانی جاسوس" کے ذریعہ واقف ہوا۔ اس کے بعد ان کے بعض افسانے بھی میری نظر سے گزرے جن کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ بی، من باسی "بڑے رقیق القلب" درد مند دل کے مالک اور حساس و خود دار شخص ہیں۔ چنانچہ جب ملاقات ہوئی تو میرے خیال کی مزید تصدیق ان کی صورت شکل اور طور طریقوں سے بھی ہوگی۔

ایک افسانہ نگار یا کہانی نویس میں جو احساس ادراک اور وجدان ہونا چاہیئے وہ ان میں بدرجہ اتم موجود ہے تقریباً درجن بھر کتابیں انہوں نے لکھی ہیں جو چھپ چکی ہیں اور افسانے یعنی کہانیاں تو سینکڑوں لکھ چکے ہیں، جن میں سے بارہ کہانیوں کا مجموعہ "بی بیتیاں" ہے جو اب طبع ہو رہا ہے۔

میں نے ابتداً افسانہ نویسی کی ہے اور اب بھی کبھی کبھار افسانہ لکھ لیتا ہوں مگر افسانے پڑھنے سے ڈرتا ہوں اس لئے کہ افسانہ آج کل بڑا ہی گندہ ہو گیا ہے، شراب نوشی، زنا، جوا، غنڈہ پن کا پرچار افسانوں میں

کیا جانے لگا ہے اور افسانہ خوان طبقہ ان افسانوں کی وجہ سے برباد ہو رہا ہے

"پی بتیاں" کے افسانے پڑھ کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے اس لئے نہیں کہ من باسی نے سحر نگاری کی ہے بلکہ اس لئے کہ انہوں نے ایک تفہیم کے تحت افسانے لکھے ہیں اور اپنے کردار ایسے پیش کئے ہیں جو مخرب اخلاق قطعاً نہیں ہیں۔ کہانی کا کام سماج کو سدھارنا اور پڑھنے والوں میں سماجی ذمہ داری کا احساس پیدا کرانا ہے اور یہ ان کے ہر افسانے کا نمایاں پہلو ہوتا ہے۔

"ایک انار"..... اس افسانے میں غربت اور امارت کو بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ پھر مالداروں کی بوالہوسی بھی نمایاں کی گئی ہے۔ ایک کردار گنپت ریڈی کا بھی پیش کیا گیا ہے جو ماہر عیاش تھا اور بڑے ہی با اصول طریقے سے عیاشی کرتا تھا۔ اسی طرح عیاش باپ بیٹوں کا کردار بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے اور باپ کے خون سے بیٹے کے ہاتھ رنگین دکھائے ہیں اور بڑے اچھے طریقے سے ہر کردار پیش کیا گیا ہے۔

"کنواں" اس کہانی میں بڑے گھرانے کی بے اعتدالیاں پیش کی گئی ہیں مگر اصل کردار بھانومتی نامی ایک عورت کا نمایاں کیا گیا ہے جو ایک مل کے مزدور کی بیوہ تھی اور مل کے مالک کے حسن سلوک سے خوش حال ہو گئی تھی اور پھر اسی محسن کے درپئے آزار ہو کر اس نے انتقام لیا بلکہ اسی انتقام کی آگ میں خود بھی بھسم ہو گئی۔

یہ بڑی سبق آموز کہانی ہے اور "چاہ کن را چاہ درپیش" کی مکمل تشریح ہے

"سانپ" بڑھاپے کی شادی "ساٹھ سالہ میاں اور سولہ سالہ بیوی" کی

داستان ہے جسے من باسی نے بڑے ہی سلیقے سے بیان کیا ہے۔ اخلاص اور تنگ دستی فضول خرچی اور عیاشی کے نتیجے کے طور پر ایک بدنصیب چچا اپنی نوجوان بھتیجی کو ایک جاگیردار کے بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ اس کہانی میں چلبلا پن اور مستی پیدا کرنے کے لئے من باسی نے "زیب داستان" کی خاطر چند ٹکڑے اور بڑھاوے ہیں جو بہت ہی موزوں اور دلچسپ ہیں۔ غرض کہانی بڑی ہی دلچسپ اور عبرت آموز ہے۔

"تہمت" عیاشوں کو جہاں اور برائیاں گھیر لیتی ہیں وہاں یہ بھی ہوتا ہے کہ اکثر عیاش انجان پن میں اپنی ہی بیٹیوں سے ملوث ہو جاتے ہیں چنانچہ اس کہانی میں بھی ایک ایسے ہی عیاش کی سرگزشت پیش کی گئی ہے۔

کہانی اچھی ہے مگر آخر میں جو طریقہ من باسی نے اختیار کیا ہے اس سے مجھے اختلاف ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اس بدنصیب کو بتایا جاتا کہ یہ تیری ہی پاپ کی گٹھڑی ہے جسے تو اپنے سر پر لادنے کے لئے تیار ہو رہا ہے" تاکہ اُسے روحانی اذیت ہو اور وہ اپنے کئے کی ذہنی سزا پا سکے' غریب لڑکی پر تہمت اٹھانا غیر ضروری تھا' خیر اپنا اپنا خیال مگر افسانہ بڑا ہی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔

"ایک پنتھ دو کاج" خبیث جب پڑھ لکھ لیتا ہے تو اس کی خباثت اور بڑھ جاتی ہے اور اس کے انگ انگ سے خباثت برسنے لگتی ہے جس طرح نجس کتا پانی میں ڈوب کر نکلے تو نجاست ٹپکاتا ہوا پھرتا ہے اسی طرح یہ خبیث بھی خباثت کرتا جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک خبیث کی داستان ہے جو بے روزگار مگر تعلیم یافتہ تھا اس نے ایک شریف لیڈی ڈاکٹر کو دھوکا

وے کر شادی کر لینے کے بعد ایک شریف ڈاکٹر کی معصوم لڑکی سے بھی شادی رچانی چاہی۔

یہ کہانی بڑی ہی دلچسپ بہت ہی سبک اور رواں ہے اس میں زبان کی چاشنی کے ساتھ واقعات کی لطافت اور تکنکی کمال بھی موجود ہے۔

"سوچا تھا کیا......؟" "کنواں" کی طرح یہ کہانی بھی انتقام کی آگ میں انتقام لینے والے ہی کو بھسم کر دیتی ہے۔ اوم ایک پارٹی کا سینیر شخص ہے جو اپنے دوستوں میں لال بجھکڑ بنا رہتا ہے۔ رمیش ایک لڑکی سے محبت کرنے لگتا ہے جس کا قصہ وہ اپنی پارٹی میں سناتا ہے چونکہ اوم رمیش کو پسند کرتا ہے اور ایک آدھ مرتبہ اپنی بہن کے ساتھ اسے دیکھ بھی چکا تھا اس لئے یہ چاہتا ہے کہ رمیش اس کی بہن ہی سے بیاہ کرے۔ اب جو وہ ایک لڑکی کا قصہ سناتا ہے تو اوم اس خیال سے کہ رمیش کو اس لڑکی سے برگشتہ خاطر کرکے اپنی بہن سے شادی کرا دے اس لڑکی کو ہوٹل بلانے کے لئے کہتا ہے اور جب وہ لڑکی ہوٹل میں بلائی جاتی ہے تو اس کے آوارہ ہونے کا فتویٰ بغیر لڑکی کو دیکھے دیتا ہے جو در اصل اس کی بہن ہی ہوتی ہے۔

یہ لال بجھکڑ پن کا بڑا نفیس خاکہ ہے اور من باسی نے بڑی چابک دستی سے اس میں رنگ بھر دیا ہے

"ہیروئن" سینما جیسی کار آمد اور اہم اور بہترین چیز کا مصرف ہندوستان میں اتنا غلط ہوا اور ہو رہا ہے کہ اب تو لوگوں کو سینما اور فلم کے نام سے نفرت ہونے لگی ہے۔ حالانکہ نہ تو فلم بری چیز ہے اور نہ سینما مگر اس کا کیا علاج کہ ہندوستان میں یہ آلہ تفریح اور مشغلہ بیکاری اور سامان

بربادی بن گیا ہے اس کا سب سے خراب پہلو یہ ہے کہ ہزارہا نوجوان مرد عورت اس کے کارن برباد ہو رہے ہیں اور ہیرو یا ہیروئن بننے کے شوق میں اپنی صلاحیت دولت عصمت برباد کر رہے ہیں۔ ایسی ہی ایک شوقین دوشیزہ کی کہانی ہے جو فلمی ہیروئن بننے کے شوق میں ماری گئی اور من باسی کے ایک افسانے کی ہیروئن بن گئی۔

اس پیش پا افتادہ قصے کو بڑے سلیقے سے من باسی نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔

"جلی ہوئی دیا سلائی" یہ بڑی اچھی کہانی ہے اس میں من باسی نے بڑی عمدگی سے اپنے ذاتی خیالات پیش کئے ہیں۔ اس کی عمدگی کا اظہار مقبولیت سے ہوتا ہے یہ اتنی مقبول ہوئی کہ اس کا ترجمہ ہندی، مرہٹی، تلنگی اور بنگلہ زبانوں میں بھی ہوا ہے۔

ایک پروفیسر اپنے ایک شاگرد کی خاطر دیہات میں جاتے ہیں اور ایک باغ کی جھونپڑی میں رہ کر افسانہ نویسی کرتے ہیں جو اس افسانے کے ہیرو بنتے ہیں۔

کہانی حد درجہ دلچسپ اور غیر معمولی سبق آموز ہے خصوصاً پروفیسر کا کردار غیر معمولی بلند پیش کیا گیا ہے جو مثالی ہے۔ یہ کہانی بہ لحاظ تکنیک اور بلحاظ سلاست و روانی قابل ستائش ہے کاش من باسی ساری کہانیاں ایسی ہی لکھیں!

"لین دین" نظیر اکبر آبادی نے کہا ہے۔۔۔ ع:۔

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے!

لین دین اسی مصرعے کی تشریحی کہانی ہے،

ایک سیٹھ جی اپنی جوانی اور دولت کی نشہ میں بھولی بھالی معصوم دوشیزہ لڑکیوں کی عصمت برباد کرتے اور فخر سے سناتے پھرتے ہیں آخر میں سیٹھ جی کی لڑکی ان بیاہی حاملہ ہوتی ہے اور وہ اس کا حمل ساقط کراتے ہیں تو عین موقع پر مع ڈاکٹر دھر لئے جاتے ہیں اس کہانی کو بڑی چابک دستی سے لکھا ہے من باسی نے۔ اس کہانی کی زبان بہ نسبت دوسری کہانیوں کے نہایت ہی سبک اور شیریں ہے اردو کے ساتھ ہندی الفاظ بڑی چترائی سے استعمال کئے گئے ہیں۔

من باسی بڑے محتاط کہانی نویس ہیں سابقہ آٹھ کہانیوں میں کسی جگہ بھی انہوں نے ہیجان انگیز لفظ یا جملہ استعمال نہیں کیا ہے مگر اس کہانی میں انہوں نے نہ جانے کیوں ریل اور روپ کا پہلا معاملہ بڑی صفائی سے لکھ گئے ہیں جو کتاب کے ۱۸۲ صفحہ پر ہے یہ البتہ ہمیں کھٹکتا ہے اس کے قطع نظر کہانی بڑی ہی نفیس اور اسلوب بیان بڑا ہی ستھرا ہے۔

"صبح کا بھولا" غیرت و خودداری رشک و رقابت نفرت اور بیزاری کے ملے جلے جذبات اس افسانے میں نمایاں کئے گئے ہیں اتفاق سے ایک تعلیم یافتہ نوجوان کو قسمت ایک دن غیر تعلیم یافتہ متمول کے پاس ملازم رکھا دیتی ہے جو نہ صرف کسی زمانے میں اس کا اسکول کا ساتھی رہ چکا تھا بلکہ اس سے ہر لحاظ سے کمتر اور ذلیل تھا اور پھر اس نوکری کے قبول کرنے کے بعد رقیب بھی بن چلا کر رقیب بھی تھا مگر مفلس نوجوان نے ملی ہوئی نوکری کو ٹھکرا دیا۔

اس افسانے کا نام البتہ موزوں نہیں ہے ورنہ افسانہ خاصا ہے۔

"تار تار نقاب" اس افسانے میں "ہیروین" کی طرح فلمی ہیروئن کا جنون پیش کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ دوسرے واقعات کو مربوط کرکے ایک سنسنی خیز جاسوسی کہانی مرتب کی گئی ہے جو بڑی ہی دلچسپ ہے۔
"سکّے کے دو پہلو" بڑا لطیف افسانہ ہے اس میں ایک ڈاکٹر کی بلند کرداری اس کے ایثار خودداری اور شرافت کا مظاہرہ بڑی عمدگی سے کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ جلی ہوئی دیاسلائی کی طرح بہت ہی دل آویز اور پاکیزہ ہے۔

یہ تو رونمائی تھی "پی پتیاں" کی کہانیوں کی' مگر حقیقت یہ ہے کہ من باسی بڑے ہی اچھے افسانہ نگار ہیں' میں ان ہی افسانوں کو کامیاب اور اچھے افسانے سمجھتا ہوں جن میں صداقت ہو زندگی ہو کردار ہو' اخلاق ہو اور جن کا اثر پڑھنے والوں پر پڑے اور پڑھنے والوں میں کردار اور اخلاق پیدا کرے' یہ باتیں من باسی کے افسانوں میں بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔

من باسی شہوت انگیز ہوسناک عریاں اور بیہودہ خیالات سے دور بھاگتے ہیں ان کے افسانے کم از کم جنسی آگ بھڑکانے اور بدراہ کرنے والے نہیں ہوتے اور یہی ان کی انتہائی عمدگی ہے۔

فنی لحاظ سے بھی من باسی افسانوں کو نوک پلک سے سدھار دیتے ہیں' اسلوب بیان بھی عمدہ اور نہایت سلیس ہوتا ہے' الفاظ بھی بڑے خوبصورت استعمال کرتے ہیں اور پڑھنے والے کو بھاتے ہیں۔

یہ من باسی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے مجھے یقین ہے کہ

یہ مقبول ہوگا اور اس کے بعد میں باہمی اپنے بقیہ افسانوں کے مجموعے بھی شائع کر سکیں گے جو یقیناً مقبول ہوں گے۔ فقط

تمکین کاظمی

۶/ اگست ۱۹۵۰ء
سلطان شاہی حیدرآباد دکن

۲

"ایک انار..."

صبح کالج آتے ہی میں نے سو روپے کا ایک چیک بنک سے بھنوالانے کے لئے کالج کے چپراسی عامر جاوٗش کو دیا تھا۔ اب چار بج چکے تھے تو بھی اس کا پتہ نہ تھا۔ مجھے گھر لوٹنا تھا۔ میں نے محاسب کو طلب کیا تاکہ اس سے معلوم کروں کہ آیا اس نے کسی دوسرے کام میں تو عامر جاوٗش کو نہیں لگا دیا اور محاسب جب میرے سامنے آکھڑا ہوا تو میں نے یہی سوال اس سے پوچھا۔

"نہیں تو ـــــ" محاسب نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "عامر تو مجھے بھی بتا کر دس بجے کا باہر گیا ہوا ہے کہ وہ آپ کا چیک کیش کرانے جا رہا ہے"۔ اور ساتھ ہی محاسب نے عامر جاوٗش کی ایمان داری پر مختصر تبصرہ کرتے ہوئے مجھے مطمئن رہنے کو کہا۔ "آپ کا تو محض سو روپے کا چیک ہے اس عامر سے تو میں نے ہزار ہزار دو دو ہزار روپے کے چیک بھنوا منگائے ہیں۔ ضرور کوئی غیر معمولی وجہ ہو گئی ہوگی جو وہ اب تک نہ لوٹ سکا۔ ورنہ عامر تو بڑا ایمان دار ہے"۔

اور میرے ایما پر جب محاسب نے بنک ٹیلیفون کیا تو بنک والوں نے بتایا کہ عامر تو چیک کے سو روپے لے کر ساڑھے گیارہ بجے ہی بنک سے چلا گیا تھا۔ پھر بھلا وہ ابھی تک کیوں نہیں لوٹا؟ میں اور محاسب ایک دوسرے کا مونہہ تکنے لگے۔ عامر کی عدم واپسی کی وجہ مطلق ہماری سمجھ میں نہ آسکی۔

گھر جانے سے پہلے میں نے محاسب سے عامر کا رہائشی پتہ پوچھ لیا۔ اور اپنی سائیکل لئے چل پڑا۔ نامپلی کی ایک بوسیدہ گلی میں وہ رہتا تھا۔ محاسب کے بتائے ہوئے مکان کے سامنے جب میں سائیکل سے اترا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اس گندے مکان کے شکستہ دروازے میں ایک نہایت ہی حسین لڑکی دلکش ساری پہنے کسی فلمی اداکارہ کے انداز میں بال سنوارے ایک خاص ادا سے کھڑی تھی۔ اس کی عمر کوئی پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہ رہی ہوگی۔ گلاب سا کھلا ہوا اس کا چہرہ اور دلفریب آنکھیں مجھے دعوت نظارہ دے رہی تھیں میں مبہوت سا کھڑا دیکھتا کہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے زیب تن کی ہوئی بیش بہا ساڑی اس کے گلے کی زینت بنا ہوا قیمتی ہار ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں اور کانوں میں زمرد کے بندے ڈول رہے تھے۔ میں اسے دیکھ رہا تھا اور وہ معصومیت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ تیس روپے ماہوار تنخواہ پانے والے ایک چپراسی کے جھونپڑے میں اتنی پر جلال اور امیر لڑکی کی موجودگی واقعی میرے لئے باعث حیرت تھی۔ میں اس کے حسن و رعنائی سے کچھ ایسا مرعوب ہو گیا کہ عامر کے متعلق اس سے کچھ نہ پوچھ سکا۔ اور سیدھا آگے بڑھ کر گلی کے دوسرے راستہ سے گھر لوٹ آیا۔ راستہ بھر میں اس خوش جمال لڑکی ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ تنخواہ کے علاوہ عامر جاوش کی آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ہمارے سامنے وہ بارہا اپنی مفلوک الحالی اور بے بسی کا رونا رو چکا تھا۔ ہم کالج کے پروفیسر اس کی ایمانداری اور فرمانبرداری کے قائل تھے۔ اور گاہے گاہے اس کو قرض دے کر یا تہوار بار کے بہانے "بخشش" دے کر آڑے وقت اس کی مالی امداد کرتے رہتے تھے۔ پھر اس خوش پوش ماہ پارہ کے اخراجات کا بھلا وہ کیوں کر کفیل

ہو سکتا تھا؟

انہیں خیالات میں گھرا ہوا جب میں گھر پہنچا تو وہاں انیل میرا منتظر تھا۔ یہ ایک یتیم ہونہار لڑکا تھا۔ وقار آباد مشن اسکول سے میٹرک پاس کرکے وہ ہمارے کالج میں داخل ہو گیا تھا۔ ہر شام خانگی طور پر میرے ہاں پڑھنے آیا کرتا تھا۔ اس وقت اُسے دیکھتے ہی مجھے خیال ہوا کہ کیوں نہ انیل کو عامر جاوِش کے گھر بھجوا کر پوری کیفیت معلوم کراؤں۔ اور میری خواہش پر انیل سائیکل لئے بخوشی روانہ ہو گیا۔ لباس بدلتے ہوئے، چائے پیتے ہوئے بھی عامر جاوِش اور اس کے بوسیدہ مکان کے دروازے پر کھڑی ہوئی اس نوعمر دوشیزہ کے اطراف ہی میرے خیالات طواف کر رہے تھے۔ اسی قسم کے خیالات میں غلطاں لان پر آ کر میں ایک آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔ کافی وقت گزر جانے پر بھی انیل اب تک نہ لوٹا تھا۔ میری آنکھیں پھاٹک ہی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اب کچھ اندھیرا چھا چلا تھا۔ اسی دوران میں ایک جیپ کار میرے مکان کی سمت آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس میں دو تین جوانوں کے ساتھ ایک پولیس افسر بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے کوئی تعجب نہ ہوا۔ میرا ایک دوست طالب سی آئی ڈی انسپکٹر تھا۔ اکثر شام کو جب وہ خالی ہوا کرتا، اپنی جیپ میں میرے ہاں آ کر گپ شپ اُڑایا کرتا۔ یا عقبی بڈمنٹن کورٹ پر کھیل کود کر ہم وقت گزار دیا کرتے تھے جب جیپ کار پھاٹک کے اندر داخل ہو کر رُک گئی تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس میں سے طالب کی بجائے کوئی اور سب انسپکٹر اترا اور اس کے پیچھے دو جوان عامر جاوِش کو ہتکڑیاں لگائے ہوئے نیچے اتر پڑے۔ اپنے کالج کے ایک وفادار چپراسی کو اس حالت میں دیکھنے کے لئے میں بالکل آمادہ نہیں تھا۔ وہ لوگ میری

طرف آرہے تھے اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے انھیں دیکھ رہا تھا سب انسپکٹر آتے ہی میرے قریب پڑی ہوئی ایک بید کی کرسی بے پروائی سے کھینچ کر بغیر اجازت حاصل کئے اس میں دھنس گیا اور بغیر مجھ سے تعارف حاصل کئے میرے سامنے رکھی ہوئی تپائی پر اس نے اپنا ہینڈ بیگ رکھ دیا اور اپنی جیب سے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ سلگاتا ہوا بولا "پروفیسر صاحب کیا آپ اس جاوش کو جانتے ہیں؟" ایک لمبا کش لے کر سگریٹ کا دھواں ناک اور مونہہ سے خارج کرتا ہوا وہ آگے بولا "یہ جاوش اپنے آپ کو آپ کے کالج کا چپراسی بتلاتا ہے" کچھ لمحے میں ساکت ہی بیٹھا رہا تو وہ معاملہ پر روشنی ڈالتا ہوا کہنے لگا "پچھلی رات سنٹرل ہوٹل جام باغ روڈ میں ایک مسافر کے قتل کا یہ موذی مرتکب ہوا ہے اور تلاشی میں اس کی جیب سے سو روپے نکلے۔ اپنے بیان میں اس نے لکھوایا ہے کہ وہ روپے آپ کے ہیں۔"

میں نے عامر جاوش پر ایک نگاہ ڈالی۔ آنسو تھے کہ ڈھلا ڈھل اس کی آنکھوں سے اُمڈے چلے آرہے تھے وہ اس وقت بھی کالج کی وردی پہنے ہوئے تھا جس پر جگہ جگہ داغ دھبے پڑے ہوئے تھے۔ مجھے شبہ ہوا شاید پولیس والوں نے اسے کافی زدوکوب کیا ہوگا سب انسپکٹر کو کوئی جواب دینے کے بجائے میں عامر سے مخاطب ہوا "دس بجے کے گئے ہوئے تم کہاں غائب ہو گئے تھے۔؟"

عامر آنسو پوچھتا ہوا بولا "صاحب آپ کا چیک بھنوانے کے بعد گھر جا کر میں نے کھانا کھایا اور کالج واپس آرہا تھا کہ گلی کے موڑ پر ہی ان لوگوں نے آکر مجھے پکڑ لیا۔ اسوقت سے ان کے پھندے میں پھنسا ہوا ہوں۔ یہ ادھر اُدھر گھسیٹے پھر رہے ہیں" پھر وہ ہچکیاں لیتا ہوا بولا "یقین جانئے صاحب میں بالکل بے قصور ہوں مجھے اس قتل کا کوئی علم نہیں۔"

یہ سنتے ہی سب انسپکٹر کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے اس نے تپائی پر سے اپنا ہینڈ بیگ ایک جھٹکے سے کھینچ لیا اور اس میں سے کوئی چیز نکالتا ہوا بولا "دیکھئے پروفیسر صاحب۔ اسے ملاحظہ فرمائیے۔ مقتول کی لاش پر یہ پڑا پایا گیا۔ اور پرانے اخبار میں لپٹا ہوا ایک پوسٹ کارڈ وہ مجھے دکھانے لگا۔

میں نے دیکھا خون میں لت پت ایک پوسٹ کارڈ تھا جس پر عامر جاؤش کا نامبلی کا پتہ درج تھا۔ یہ خط شاید اس کے کسی عزیز نے گاؤں سے بھجوایا تھا' اور اس سے کچھ روپے طلب کئے تھے۔ حیدرآباد ڈاک خانہ کی کل کی مہر اس کارڈ پر موجود تھی۔ میں نے اس کارڈ کو اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد عامر پر ایک نگاہ ڈالی۔ اس کی حالت قابل رحم تھی۔ لیکن اس پر رحم کھانے کے بجائے وہ سب انسپکٹر چیں بہ جبیں ہو کر بولا "اگر ہم اسے گرفتار نہ کر لیتے تو یہ فرار ہو چکا ہوتا۔ ظاہر ہے یہ کارڈ آنے پر اسے روپیوں کی ضرورت پڑی' اور رات کی تاریکی میں اس ظالم نے اس مسافر کی ہتیا کر ڈالی اور یہ سو روپے اس سے اڑا لیئے۔ اگر ہم اسے گرفتار نہ کر لیتے تو یہ روپیہ لے کر گاؤں بھاگ گیا ہوتا۔" یہ کہتے ہوئے سب انسپکٹر نے ایک غراتے ہوئے کتے کی طرح اسے دیکھا! ور وہ کارڈ اس نے میرے ہاتھ سے قریب قریب جھپٹ ہی لیا۔

عامر مسکین صورت بنا کر بولا "قسم لے لیجئے اس کارڈ کو میں نے آج ہی۔ اور ان لوگوں کے پاس ہی پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ مانا کہ وہ میرے ایک عزیز نے مجھ ہی کو بھجوایا تھا لیکن وہ مجھ تک پہنچا ہی نہیں۔"

اس پر سب انسپکٹر حقارت سے ہنسنے لگا میں نے اسے بتایا کہ رات کی واردات کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن صبح عامر کو کالج میں

ڈیوٹی پہ دیکھ کر اس کی حالت سے مطلق یہ شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس نے رات میں کسی کو قتل کر دیا ہو گا۔ وہ بڑا ہی بے فکر اور ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ اب رہا ان سو روپیوں کا معاملہ تو میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ میرے ہیں۔ ایک چیک بھنوانے میں نے عامر کو دس بجے بنک بھجوایا تھا اور اس کے ثبوت میں اپنا چیک بک لا کر میں نے کاؤنٹر رسید سب انسپکٹر کو دکھائی۔ اور وہ کچھ مطمئن سا ہو گیا۔

"عامر کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے۔" میرے اس عجیب سوال پر سب انسپکٹر میرا منہ تکنے لگا۔

"جی نہیں صاحب" اس نے ہاتھ جوڑے ہوئے بتایا۔

"تمہارے ساتھ کون کون رہتا ہے۔" میں نے دوسرا سوال پوچھا۔

"کوئی بھی نہیں صاحب" وہ ایک دم بول اٹھا۔ اور پھر لڑکھڑاتی زبان سے کہنے لگا۔ "ہاں پچھلے ہفتہ سے میرا ایک دوست مورو میرے ہاں آ کر ٹھہرا ہوا ہے۔"

"اور کوئی ؟" میرے اس سوال پر وہ کچھ سہما ہوا سا دکھائی دینے لگا۔ اس کے دروازے پہ دیکھی ہوئی پری چہرہ لڑکی کے بارے میں جاننے کی مجھے کرید ہو رہی تھی اور اسی مقصد سے میں یہ سوال عامر سے پوچھ رہا تھا سب انسپکٹر اس انداز میں بیٹھا ہوا ہماری باتیں سن رہا تھا کہ عامر کے قابل گرفت جواب پر اسے قابل کر دے۔ میرے آخری سوال کا جواب دینے میں عامر نے کچھ توقف کیا۔ جیسے پس و پیش میں ہو کہ بے بتائے لیکن اسے پوچھے ہی بنی۔

"آج صبح سے مورو کی لگائی آئی ہوئی ہے۔" اس نے الفاظ چبا چبا کر کہا۔

"یہ مورو کون ہے اور کیا کرتا ہے۔" سب انسپکٹر نے ایک خسرانہ انداز میں دریافت کیا۔

"یہ وقار آباد میں نوکری پر تھا۔ اب بیکار ہے اور روزگار کی تلاش میں یہاں

آیا ہوا ہے۔" عامر نے سہمے ہوئے جواب دیا۔

"اور اس کی وہ انگوٹھی؟" سب انسپکٹر نے گرج کر پوچھا۔

"مجھے کچھ پتہ نہیں صاحب۔" عامر نے عاجزی سے روتے ہوئے کہا۔

"تو سے بہا کر تم بچ نہیں سکتے۔" سب انسپکٹر اپنے عہدے کی دھونس جماتا ہوا بولا "سچ سچ بتاؤ اس مورو کا پورا نام کیا ہے؟"

"مورو کشور ولد کشو لو" عامر آنسو پوچھتا ہوا بولا۔

"یہ وقار آباد کا وہی غنڈا تو نہیں جو جیل بھی جا چکا ہے؟" سب انسپکٹر نے دریافت کیا۔

"جی ... جی ہاں" --- عامر نے کہا۔

سب انسپکٹر کرسی سے اٹھتا ہوا جوانوں سے بولا "چلو اس کے گھر چلیں"۔ اور وہ جوان ہتکڑیوں میں جکڑتے ہوئے عامر کو جیپ کار کی طرف گھسیٹنے لگے۔ میرے سو روپے اس سب انسپکٹر نے کیا لوٹانے تھے۔ الٹا گواہوں کی فہرست میں میرا نام لکھ مارا۔ اور مگرمچھ کے آنسوؤں کی مصداق رٹے ہوئے الفاظ میں معذرت چاہتا ہوا چلا گیا۔

عامر کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا جب لمبے وہ تنگ جیپ کار میں ٹھونس رہے تھے وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ جب امداد طلب نگاہوں سے اس نے میری طرف دیکھا تو میرا دل دہل گیا مجھے اپنی لاچاری پر شرم آ رہی تھی۔

پولیس کی جیپ چلے جانے پر بڑی دیر تک آرام کرسی میں بیٹھا ہوا میں اس سانحہ پر غور کرنے لگا پھر مجھے خیال ہوا اگر فی الحقیقت عامر بے قصور ہے تو کیوں نہ اس کے چھٹکارے کے لئے طالب سے مدد حاصل کی جائے لیکن عامر کے نام آیا۔

ہو اخط لاش کے پاس پائے جانے میں کیا راز مضمر ہے؟ یہ غنڈہ مورد کون ہے اور اس پُراسرار لڑکی سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اس اجنبی لڑکی کے حالات معلوم کرنے کے لئے میں بے قرار ہو رہا تھا..... لیکن یہ انیل اب تک کیوں نہیں لوٹا؟ اس کی واپسی میں غیر معمولی تاخیر کی وجہ میری سمجھ میں نہ آئی اور مجھے فکر ہونے لگی۔ میں یہ سوچ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ پہلے عامر جاوُش کے گھر جاکر انیل کی عدم واپسی کا سبب معلوم کرنا چاہیئے اور بعد میں ضرورت پڑنے پر طالب سے مل کر اس معاملہ میں جہاں تک اس کے لئے ممکن ہو اس کی مدد حاصل کرنی چاہیئے۔ اس خیال سے میں باہر نکل پڑا۔

اب رات ہو چکی تھی جب میں عامر جاوُش کے گھر کے سامنے رُکا تو اس کے دروازے پر مجھے قفل چڑھا ہوا دکھائی دیا۔ وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک بجلی کے کھمبے کے نیچے کچھ مزدور پیشہ لوگ اکٹھے ہو کر کسی بات پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے میں ان کے پاس جا پہنچا۔ وہ مجھے گھور گھور کے دیکھنے لگے۔ دریافت کرنے پر انہوں نے مجھے بتایا کہ ابھی ابھی عامر کے گھر پولیس والے تلاشی لینے آئے تھے۔ وہ اسے گرفتار کر کے لے گئے ہیں۔ اس پُراسرار لڑکی اور مورو کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی غرض سے کچھ تامل کے بعد میں نے پوچھا۔ "اور عامر کے ساتھ جو لوگ رہتے تھے وہ کہاں گئے؟"

ان لوگوں میں سے ایک کرخندار قسم کا آدمی آگے بڑھا اور مجھ سے پوچھنے لگا "بابوجی، معاف کیجئے گا کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں اور اس سلسلہ میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

دوسرے ایک نوجوان نے کرخندار قسم کے آدمی کا تعارف کراتے ہوئے

کہا۔ "آپ میر محلہ ہیں ۔۔"

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا "بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔ میں اُسی کالج میں پروفیسر ہوں جہاں عامر چاؤش چپراسی کا کام کرتا ہے۔"

"اچھا اچھا" میر محلہ نے قدرے مطمئن ہو کر کہا "پھر تو آپ عامر کی رہائی ہی کے حق میں ہوں گے ۔۔۔ بابو جی جہاں تک ہمارا خیال ہے عامر جیسا نمازی پرہیزگار آدمی ایسا کام نہیں کر سکتا۔ اس قتل میں ضرور مودو کا ہاتھ ہوگا۔"

"یہ مودو کون ہے اور اس کا عامر سے کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اجی یہ ہے بدمعاش ہے۔" میر محلہ مودو کے حالات پر روشنی ڈالتا ہوا بولا۔ "رہنے والا تو ظہیر آباد کا ہے۔ اپنے باپ سے جھگڑا کر کے کچھ دنوں پہلے عامر کے ہاں آ ٹھیرا تھا۔ پھر وقار آباد میں کہیں نوکری کر لی تھی۔ وہاں بھی ٹک نہ سکا۔ سیٹھ بھگت رام کے ہاں چوری کر کے یہاں بھاگ آیا تھا۔ اس معاملہ میں جیل بھی کاٹ چکا ہے ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی چھوٹا ہے" پھر قدرے رازدارانہ لہجہ میں ہلکی آواز میں بولا "اور ہاں بابو جی! آج صبح عامر کے مکان میں ایک نئی چھوکری بھی دیکھی گئی تھی۔ کچھ لوگوں کے پوچھنے پر عامر نے بتلایا تھا کہ وہ مودو کی لگائی ہے۔ لیکن پولیس کی آمد سے قبل وہ کہیں فرار ہو گئی اور وہ مودو کا بچہ بھی دن بھر سے غائب ہے۔ ہمارا تو یقین ہو چلا ہے بابو جی کہ جس جرم میں پولیس بیچارے عامر کو گھسیٹے پھر رہی ہے اس میں ان دونوں کا ہاتھ ہوگا۔"

لیکن میر محلہ نے شانتی کہوں کی اس ساری گتھا میں مجھے انیل کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ کیا وہ عامر کے یہاں آیا ہی نہیں تھا؟ یا اس مکان کو مقفل پا کر اپنے گھر واپس چلا گیا ہوگا۔ لیکن ہر حال میں اسے مجھے آکر اطلاع کرنا ضروری تھا۔

آخر وہ کہاں چلا گیا؟ پھر میں نے میر محلہ سے پوچھا۔ "ایڈیٹر صاحب مقتول کی لاش کے پاس عامر کے نام آیا ہوا کوئی پوسٹ کارڈ بھی پایا گیا تھا؟"

یہ سن کر جیسے وہ کسی سوچ میں گھر گیا۔ پھر اچھل کر بولا۔ "پھر تو یقینی طور پر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ سب مورد ہی کی کارستانی ہے۔ بابو جی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کل جب ڈاکیہ عامر جاوید کا کارڈ لے کر آیا تھا تو عامر گھر پر موجود نہیں تھا۔ اور مورد اس کے دروازہ میں کھڑا ہوا تھا۔ میری موجودگی میں ڈاکیہ نے عامر کا کارڈ مورد کو تھما دیا تھا۔ عامر کو پھانسنے کے لئے ضرور مورد نے کوئی چال چلی ہے۔"

پھر کچھ دیر ہم لوگ عامر کو بچانے کے سلسلہ میں مشورہ کرتے رہے۔ میں نے روپے پیسے کی مدد کا انہیں یقین دلایا اور گھر لوٹنے سے قبل میر محلہ کو اپنا رہائشی پتہ سمجھانا نہیں بھولا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ عامر ضرور بے قصور ہے۔ طالب کے ہاں جانا مجھے غیر ضروری معلوم ہوا لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ پُراسرار لڑکی یکایک کہاں روپوش ہو گئی تھی؟ اور انیل اس وقت تک یہاں کیوں نہیں پہنچا تھا؟

جب میں پھاٹک سے اندر داخل ہوا تو لان پر پڑی ہوئی کرسیوں پر مجھے مبہم سے سائے دکھائی دے گویا کوئی دو شخص بیٹھے ہوئے تھے جیسے ہی میں قریب پہنچا وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں متجسس دیکھنے لگا۔ ایک تو انیل تھا اور دوسرا ...... وہ تو ساری پہنی ہوئی کوئی لڑکی تھی۔ بالکل نزدیک پہنچ جانے پر اس لڑکی کو پہچاننے میں مجھے زیادہ وقت صرف نہیں کرنا پڑا۔ یہ وہی دوشیزہ تھی جس کے عامر کے ہاں سے پُراسرار طور پر غائب ہو جانے پر میں حیران

تھا۔ لیکن یہ لڑکی میرے بنگلے میں کیوں گر آگئی اور اس کے ساتھ انیل کی موجودگی ــــ! میرا استعجاب حد سے متجاوز ہونے لگا لیکن میں اپنے جذبہ تجسس پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا اور پریم بھاؤ سے بولا۔ "کون.... انیل! باہر کیوں بیٹھے ہو؟ دیوان خانہ میں جا بیٹھے ہوتے ــــ"

میں آگے بڑھ گیا اور دونوں میرے پیچھے پیچھے دیوان خانہ میں آ گئے۔ انیل خاموش ہی تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہے پر سوچ رہا ہے کس طرح کہے اور کہاں سے آغاز کرے۔ در اصل مجھ میں کا افسانہ نگار اس وقت پوری طرح چوکس اور بیدار ہو چکا تھا اور میں متمنی تھا کہ اس پُر اسرار حسین لڑکی کے متعلق سب کچھ جان لوں۔ میرا اشتیاق بڑھ گیا تھا۔ میں صوفہ پر بیٹھ گیا۔ اور لبوں پر مسکراہٹ نمایاں کئے ہوئے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔

"معاف کیجئے پروفیسر صاحب"! انیل انکساری سے کہنے لگا "میں آپ کی اجازت بغیر انہیں آپ کے بنگلے میں لے آیا ہوں لیکن آپ میرے بزرگ ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اس معاملہ میں آپ ہی صحیح طور پر میری اعانت فرمادیں گے۔ میں آپ کو پوری داستان سناتا ہوں۔"

وہ دونوں میرے سامنے کھڑے ہوئے تھے اور میں انھیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ انیل اس انداز میں مجھ پر نظریں جمائے ہوئے تھا کہ اس وقت میرے چہرے پر ہویدا جذبات اور تاثرات سے میرے دل کی تھاہ پالے۔ شاید وہ یہ جاننے کے لئے مضطرب تھا کہ اس وقت میں کس موقف میں ہوں۔ وہ جس راز کا انکشاف کرنے چلا ہے آیا میں اسے سننا گوارہ بھی کروں گا یا نہیں؟ وہ اپنے چہرے پر بیکراں اضطراب لئے کھڑا تھا۔ اور اس کی اوٹ میں وہ لڑکی تھی۔ اپنی دلفریب آنکھوں

میں خاموش چپک بیٹے وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا آسمان سے کوئی پری میرے دیوان خانہ میں آتر آئی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے جس قدر میں اُسے پُراسرار سمجھ رہا تھا اس سے بھی زیادہ اس وقت وہ مجھے معصوم دکھائی دے رہی تھی۔

"بیٹھ جاؤ انیل ـــــ" سامنے کے صوفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے پُرسکون لہجہ میں کہا "کچھ ستالو۔ تم تھک گئے ہو گے۔ میں چائے منگواتا ہوں یہ دیوی کیا پینا پسند کریں گی۔ چائے یا کافی ـــــ؟"

میرے اس مخلصانہ برتاؤ سے انیل کی باچھیں کھل گئیں۔ اس معصوم لڑکی کے گلاب سے چہرے پر بھی شیریں مسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی جیسے کسی درد سے اُسے آرام مل گیا ہو۔ میں نے گھنٹی بجائی اور ملازم کو چائے لانے کا کہنے سے قبل میں نے دوبارہ اس لڑکی سے پوچھ لیا "چائے تو پی لیا کرتی ہونا؟"

"جی ہاں!" اس نے ہلکی آواز میں کہا۔

انیل میرے سامنے والے صوفہ پہ بیٹھ گیا۔ وہ انیل کے پاس نہیں بیٹھی بلکہ علیحدہ ایک کرسی پہ بیٹھ گئی۔ دونوں اس وقت مسرور دکھائی دے رہے تھے۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے اس لڑکی سے پوچھا۔

وہ قدرے محجوب سی ہو گئی اور شیریں مسکراہٹ سے بولی "جی مجھے کومل کانتی کہتے ہیں" پھر معصومیت سے کہنے لگی "میں نے آج شام آپ کو عامر چاؤس کے مکان کے سامنے سے گذرتے دیکھا تھا۔ آپ کچھ دیر وہاں رک بھی گئے تھے اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے ـــــ" اس نے یہ جملے ایسے معصوم اور طفلانہ انداز میں ادا کئے جیسے کوئی ننھا بچہ اپنے خاندانی بزرگ

کے پاس بیٹھا بھولی بھولی باتیں کر رہا ہو۔ اس کے انگ انگ سے بھولپن اور معصومیت ٹپک رہی تھی۔ میرے شبہ نے خلوص اور عقیدت کی شکل اختیار کرلی۔ وہ ایک معصوم بیٹی یا مقدس بہن کی مانند میری طرف دیکھ رہی تھی۔ بھلا اس لڑکی کا اس قتل سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ لیکن..... لیکن، عامر چاؤش تے تو بتایا تھا کہ وہ مورو کی بیوی ہے۔ اتنے میں چائے آگئی اور میں نے ایک ایک پیالی بنا کر انہیں دی اور اپنی پیالی میں چینی ڈالتا ہوا بولا۔ "کہو انیل تم کون سی داستان ادھوری یا پوری سنانے چلے تھے" میں نے انیل سے کہا اور کومل کانتی کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن اب اس کی مسکراہٹ کہیں مفقود ہو چکی تھی اور وہ قدرے متین دکھائی دینے لگی تھی۔ اس وقت کی اس کی سنجیدگی سے خودداری اور لحاظ کی بہ نسبت ہیبت اور اضطراب مترشح تھا جس سے میں نے اندازہ لگایا انیل جو واقعات سنانے جا رہا تھا ان میں شاید کومل کانتی کی کسی کمزوری کو اسے منکشف کرنا پڑے گا۔ اس خیال سے چائے ختم ہوتے ہی میں نے انیل سے کہا۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم لوگ باہر لان پر ہی بیٹھیں ——"

انیل نے کوئی جواب نہیں دیا وہ میرے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ کومل کانتی بھی اپنی چائے ختم کر چکی تھی، مگر وہ بیٹھی ہی رہی۔ اس کے اس رویہ پر میں نے ملازم سے کہا۔ "ہم لوگ باہر بیٹھتے ہیں۔ اس درمیان میں تم ان دیوی کو کھانا کھلادو۔ ہم کچھ دیر بعد کھائیں گے۔" اور انیل کو لئے میں باہر نکل گیا۔ میں نے محسوس کیا کومل کانتی نے ایک اطمینان کی سانس لی اور جب ہم دیوان خانہ سے باہر نکل رہے تھے تو وہ اپنی کرسی سے اُٹھ کر میری جگہ صوفہ پر جا بیٹھی۔

ہم لان پر آگئے آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے میں نے کہا۔ "انیل جہاں تک

میرا خیال ہے یہ لڑکی مورو کی بیوی ہے۔ تم اسے اس طرح یہاں کیوں لے آئے؟"

انیل پاس کی بید کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا "عامر اور اس کے اڑوس پڑوس کے لوگوں کا بھی یہی خیال ہے لیکن یہ صریحاً غلط ہے۔ کومل کانتی بڑی مصیبت زدہ لڑکی ہے۔ یہ میرے ہی ساتھ وقار آباد کی مشن سکول میں زیر تعلیم تھی۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ ابھی ابھی میں اس کی پوری آپ بیتی سُن چکا ہوں جو میں من وعن آپ کو سُناتا ہوں"۔

اور انیل نے ایک طویل کہانی مجھے سنائی جسے میں بڑی دل چسپی سے سنتا رہا جس کا اختصار اس طرح ہو سکتا ہے:۔

وقار آباد کے ایک غریب برہمن ہری رام کے ہاں کومل کانتی نے جنم لیا تھا۔ ماں بچپن ہی میں انتقال کر چکی تھی۔ باپ سیٹھ بھگت رام کے ہاں ملازم تھا۔ بہی کھاتہ لکھنا اور سیٹھ کے گھر کے نجی کام کرنا یہی اس کی ملازمت تھی۔ شام کے وقت وہ ایک مشنری پادری کو ہندوستانی پڑھایا کرتا تھا۔ ہری رام کی پڑھائی سے مشنری پادری مطمئن تھا اور اس نے خوش ہو کر کومل کانتی کی تعلیم کی ساری ذمہ داریاں اپنے سر لے لی تھیں۔ ہری رام بہت کمزور اور بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کی غیر معمولی کمزوری اور بڑھاپے کا سبب سیٹھ بھگت رام کا بھاری سا قرض تھا جو وہ اپنی بیوی کی علالت کے دوران میں گاہ بگاہ اٹھاتا رہا تھا۔ اس قرض کی ادائیگی وہ قسطیں میں ماہ بماہ کرتا رہتا تھا اور مشنری پادری سے جو رقم ملتی تھی اس میں بسر اوقات کر لیتا تھا۔ وقار آباد کے مشن سکول ہی میں کومل کانتی کی ملاقات انیل سے ہوئی تھی۔ یہ دونوں ساتھ پڑھتے تھے، ساتھ کھیلتے۔ ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ جب تک ایک دوسرے کو دیکھ نہ لیتے انھیں چین نہ آتا تھا۔ ہائی اسکول کا امتحان

پاس کر کے انیل پھر کالج میں داخل ہونے کے لئے حیدرآباد چلا گیا۔ جاتے وقت وہ کومل کانتی سے ملنا نہیں بھولا تھا۔

ایک دن مشنری پادری کے بنگلے کے برآمدہ میں ہری رام کومل کانتی سے باتیں کر رہا تھا کہ سیٹھ بھگت رام بنگلے کے سامنے سے گذرے۔ انہوں نے ہری رام کو اور اس لڑکی کو بڑا گھور گھور کے دیکھا۔ دوسری ہی صبح ہری رام کی طلبی ہوئی۔ "ہمارا دھرم بھرشٹ کرنے والے پادریوں کے ہاں تمہارا کیا کام ہے؟" سیٹھ بھگت رام نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔ "اور وہ لڑکی کون تھی جس کے ساتھ تم باتیں کر رہے تھے؟"

ہری رام نے کوئی بات نہیں چھپائی۔ اس نے سچ سچ بتا دیا۔ "شری منت! ساری تنخواہ تو یہاں قرض کی ادائیگی میں کٹ جاتی ہے۔ آخر گذر اوقات کرنے کے لئے کچھ تو ذریعہ چاہیئے۔ اس لئے مشنری پادری کو ہندوستانی پڑھا کر کچھ کما لیتا ہوں۔ اور جس لڑکی کو شری منت نے وہاں مجھ سے باتیں کرتے دیکھا ہے وہ آپ کے سیوک ہی کی بیٹی ہے، مشنری پادری نے مہربان ہو کر اس کی تعلیم و تربیت کی تمام ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔"

سیٹھ بھگت رام ششدر رہ گیا۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا ایسے دلکش خدوخال والی لڑکی اس کنگال برہمن کی ہو سکتی ہے۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر ان کی باچھیں کھل گئیں۔ حالاں کہ ان دنوں کومل کانتی کم سن ہی تھی، لیکن انہوں نے سوچا لڑکی حسین کھلتی ہوئی کلی ہے۔ کئی دنوں سے وہ رنڈوے تھے اور ایک مدت سے اس قسم کے شکار کی تلاش میں تھے۔ سیٹھ کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ لیکن ظاہراً انہوں نے ترش لہجے میں کہا "ہری رام تم پنڈت ہوتے ہوئے دھرم کو بھرشٹ کر رہے ہو۔ ان مشنریوں کی تعلیم کا اثر زہر کی صورت میں اس معصوم

بچی کی رگ رگ میں سرائیت کر جائے گا۔ کل تم مرگھٹ سدھاروگے اور تمہاری بیٹی کرسٹان بن جائے گی۔ آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں۔ تم ہمارے وفادار منیم ہو۔ کومل کانتی کی تعلیم و تربیت کی تمام ذمہ داری آج سے ہم لیتے ہیں۔ جاؤ اُسے لے آؤ۔ وہ ہمارے ہی ہاں رہے گی۔ اس کا سارا خرچ ہم برداشت کریں گے۔"

سیٹھ کا تیر ٹھیک نشانے پر لگا۔ بھولا برہمن جھانسے میں آگیا اور اسی دن مشنری ہوسٹل سے وہ کومل کانتی کو لے آیا اور وہ سیٹھ بھگت رام کے راج محل میں داخل کر دی گئی۔ معصوم کومل کانتی! اس بھولی چڑیا کو بھلا کیوں کر احساس ہوتا کہ اس کے اطراف کس فریب کا جال تنا جا رہا ہے۔ سیٹھ جی نے ظاہرداریوں میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ایک سنسکرت پنڈت اس کی تعلیم کے لئے رکھے گئے۔ بوڑھا ہری رام یہ سب دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا اور سیٹھ بھگت رام کو دعائیں دیتا تھا۔ اس خوشی و مسرت میں ایک دن اُس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں موند لیں۔ پھر کیا تھا سیٹھ جی کے لئے خود بخود میدان صاف ہو گیا۔ دن گذر رہے تھے اور کومل کانتی طفولیت کو پس پشت چھوڑ شباب کی منزل میں قدم رکھ رہی تھی۔ بوڑھا ہوس پرست سیٹھ کئی دنوں سے صبر کی سل سینہ پر دھرے ہوئے تھا۔ وہ اب جلد سے جلد اس بے بس لڑکی کے کنوارپن کو لوٹنے کا متمنّی ہو گیا۔

یہیں کومل کانتی کی مورو سے ملاقات ہوئی۔ مورو سیٹھ بھگت رام کا نوکر تھا۔ ظہیر آباد کے کیشو نام کے تاجر کا وہ بیٹا تھا۔ کیشو بڑا شرابی اور بدچلن تھا۔ باپ بیٹے میں ہمیشہ ٹھنی رہتی تھی۔ آخر روز روز کی تُو تُو مَیں مَیں سے تنگ آ کر مورو گھر سے فرار ہو گیا۔ اور دو چار جگہ متفرق قسم کی نوکری ڈھونڈا کرتا ہوا وہ سیٹھ بھگت رام سے متعارف ہوا اور پھر ان ہی کا ہو رہا۔ سیٹھ کے مویشیوں کی وہ

نگرانی کیا کرتا تھا۔ جیسے جیسے کومل کانتی جوان ہوتی گئی اس کے حُسن کا نکھار بڑھتا گیا۔ اور مورو بھی اس پر لٹّو ہو گیا۔ لیکن ایک خدمت گار۔ جامہ سے باہر نہیں ہوا۔ موقع کا انتظار کرنے لگا۔ بہر حال بھگت رام کی نیت وہ تاڑ گیا تھا۔ سایہ کی طرح کومل کانتی کے پیچھے لگا رہتا۔

پنڈھر پور کی جترا شروع ہو چکی تھی۔ سیٹھ جی کا سارا خاندان ہر سال اس جترا میں شرکت کیا کرتا تھا۔ اس مرتبہ بھی سب اس تیرتھ کو روانہ ہو گئے۔ صرف سیٹھ جی نے ناسازی طبع کے بہانے ٹال دیا۔ کومل کانتی ان کے خدمت کے لئے رہ گئی اور مویشیوں کی دیکھ بھال جو کرتی تھی مورو بھی ٹھیر گیا۔ سیٹھ جی کا پیمانۂ صبر تو لبریز ہو ہی چکا تھا۔ بارش کا موسم اور کالی کالی گھٹاؤں نے اودھم مچایا۔ شام کو جب سنسکرت کے پنڈت پڑھا کر چلے گئے تو کومل کانتی اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے ہی لیٹے وہی سبق دہرانے لگی۔ مورو نے دیکھا کہ سیٹھ آج کچھ بے قرار سا ہے۔ رات میں مورو ڈھور ڈنگروں کے کوٹھے میں سوتا تھا۔ لیکن اس رات وہ سیٹھ کی خوابگاہ کے پاس ہی دبک کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا پہلے تو سیٹھ عالم اضطراب میں برآمدہ میں ٹہلتا رہا۔ پھر اپنے کمرے میں آ کر اس نے کوئی دوائی کھائی۔ باہر نکل کر دبے پاؤں کومل کانتی کے کمرے تک گیا۔ دروازہ بند تھا۔ کھڑکی میں سے سیٹھ نے اندر جھانکا۔ معصوم لڑکی بستر پر اوندھی لیٹی اپنا کوئی پاٹھ حفظ کر رہی تھی۔ کچھ عرصہ سیٹھ کھڑکی ہی میں کھڑا رہا اس کے حسن و جمال سے آنکھیں ٹھنڈی کرتا رہا پھر کومل کانتی کے دروازہ پر رک کر اسے پکارنے لگا۔ وہ ابھی تک اپنا سبق یاد کر رہی تھی۔ پہلے تو اسے تعجب ہوا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے دروازہ کھول دیا تو اپنے محسن تپاسمان سیٹھ بھگت رام کو وہاں کھڑے پایا۔

"کیا کر رہی ہو کومل" سیٹھ نے اس پر حریصانہ نظریں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"پاٹھ پڑھ رہی ہوں۔ پنڈت جی نے کہا تھا کل امتحان لیں گے۔" کومل نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ اُسے کیا پتہ تھا کہ اس کے سامنے بھیڑ کی کھال پہنے ہوئے ایک خونخوار بھیڑیا کھڑا ہوا ہے۔ انسان کے لبادے میں ایک شیطان روپوش ہے۔

اب سیٹھ پیار بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا۔ "ذرا میرے کمرے میں آؤ۔"

"اس وقت" کومل نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ ذرا دیکھوں پنڈت حرام کی تنخواہ لیتا ہے یا ٹھیک سے کچھ پڑھاتا بھی ہے" سیٹھ نے کہا اور واپس جانے لگا۔ کومل کانتی نے اپنی کاپی اور کتاب اٹھائی اور سیٹھ کے پیچھے ہو لی اِس وقت تک مور دھج چوکنا ہو گیا۔ جب اس نے یہ سنا کہ وہ اپنی خواب گاہ میں کومل کانتی کو بلا رہا ہے تو لپک کر وہ اس سے پہلے ہی خواب گاہ میں داخل ہو گیا اور سیٹھ کے پلنگ کے نیچے چھپ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سیٹھ خوابگاہ میں داخل ہوا لیے سنسکرت کی کتاب اور کاپی لئے اس کے پیچھے پیچھے کومل کانتی بھی اندر آ گئی۔ سیٹھ پلنگ پر بیٹھ گیا اور اس نے کومل کو بھی پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کومل اسے باپ کی جگہ تصور کرتی تھی۔ بلا جھجک اسکے پاس بیٹھ گئی۔

"ہوا میں خنکی ہے ذرا دروازہ بند کر دوں" کہتا ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ بند کر کے اس نے کنڈی چڑھا دی۔

"یہاں سے یہاں تک پڑھ چکی ہوں" وہ معصوم لڑکی کتاب کے ورق کھول کر دکھاتی ہوئی بولی۔

سیٹھ اب کے بیٹھا نہیں۔ سامنے ہی کھڑا رہا پھر آگے بڑھ کر اس نے اپنے داہنے ہاتھ سے کومل کانتی کی ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے پوچھا۔ "جوانی کا بھی کوئی سبق پڑھا ہے کیا؟"

"جی!" بے بس کومل شیر کے شکنجہ میں پھنسی ہوئی ہرنی کی طرح لرز کر بولی۔ اس نے دیکھا سیٹھ کی آنکھیں خمار آلود ہو رہی تھیں۔ اس کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ کومل پلنگ پر پیچھے کی طرف ہٹنے لگی۔

"کتنا پیارا نام ہے کومل ..... کانتی! واقعی تم اسم بامسمیٰ ہو۔ میں تم پر جان دیتا ہوں۔ پیاری کومل میں تمہیں اپنی رانی بناؤں گا۔" وہ اُسے اپنی گرفت میں لیتا ہوا بولا۔

کومل مارے خوف کے کانپنے لگی۔

"ڈرو نہیں میری جان آؤ میرے قریب آؤ ـــ" اور پلنگ پر گر کر اس نے ایک دم کومل کو اپنی گود میں سمیٹ لیا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں چھوڑیئے مجھے۔ مجھے جانے دیجئے" کومل تڑپ رہی تھی اور سیٹھ دست درازیاں کر رہا تھا۔ اب مورو نے زیادہ انتظار نہیں کیا۔ وہ پلنگ کے نیچے سے نکل آیا۔ پوری طاقت سے اس نے سیٹھ کی گردن پکڑ کر اسے نیچے گرا دیا اور اس کے سینہ پر سوار ہو کر بے دردی سے اس کے مونہہ اور پیٹ پر گھونسے مارنے لگا۔ سیٹھ کا مونہہ لہو لہان ہو گیا۔ کومل کانتی موقع غنیمت جان کر کمرے سے نکل بھاگی تھی۔ سیٹھ کی مرمت سے فارغ ہو کر مورو نے گھر کی نقدی پر ہاتھ صاف کیا اور پھر کومل کانتی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے چھپ گئی تھی۔ مورو اس کے کواڑ کھٹ کھٹا کر اُسے باہر بلانے لگا۔

"کومل کانتی سیٹھ مر چکا ہے۔ پولیس یہاں آ کر ہمیں پکڑے گی۔ ہماری خیر اسی میں ہے کہ ہم یہاں سے بھاگ چلیں۔"

خوف زدہ ہو کر کومل باہر نکل آئی۔ آسمان پر گھنگھور گھٹائیں گھر آئی تھیں

اور کچھ بوندا باندی بھی ہونے لگی تھی۔ مورو کی نیت صاف نہیں تھی۔ لیکن اس جگہ وہ کومل پر کسی قسم کا جبر یا سختی نہیں کر سکتا تھا۔ گرفتاری کا خوف جو تھا۔ وہ اُسے حیدرآباد لے آیا۔ اس نے سوچا تھا کہ کومل کانتی کو ہمیشہ گرفتاری کا خوف دلا کر وہ من مانی کرتا رہے گا۔ مورو کا ارادہ اس بھولی لڑکی کو داشتہ بنائے رکھنے کا تھا۔ لیکن قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ سیٹھ بھگت رام کو رات ہی میں ہوش آگیا۔ وہ مورو پہ لعنت بھیجتا ہوا پولیس اسٹیشن جا پہنچا اور مورو کے خلاف رپورٹ درج کرادی۔ وقارآباد پولیس نے مورو کی تلاش میں اپنے جوان دوڑائے۔ وائرلیس سے حیدرآباد پولیس کو اطلاع دی گئی۔ سیٹھ بھگت رام نے اپنی رپورٹ میں کومل کا کہیں ذکر نہیں کیا تھا صرف مورو پر زدوکوب کرنے اور چوری کا الزام لگایا تھا۔ بدقسمت مورو حیدرآباد اسٹیشن پہ گرفتار ہوگیا۔ پولیس کے نرغے میں گھرا وہ انسپکٹر کے سامنے مع کومل کانتی کے پیش ہوا۔ انسپکٹر صاحب کے ظہیرآباد والے ایک رنگیلے دوست اس موقع پر اُن کی بغل میں بیٹھے غپ شپ ہانک رہے تھے۔ وہ اس نمکین لڑکی کو دیکھ کر اس پہ لٹو ہوگئے۔ سیٹھ بھگت رام کی رپورٹ کے مطابق کچھ نقدی مورو کی تلاشی لینے پر برآمد ہوئی اور پنچ نامہ کرکے اُسے وقارآباد بھجوادیا گیا۔ روانگی سے قبل مورو نے ضمانت پر رہا ہونے کی جدوجہد کی۔ اس نے اپنے دوست عامر چاؤش سے بھی مدد چاہی۔ عامر تو آمادہ تھا پر اس کی ضمانت مسترد کردی گئی۔ مورو پر مقدمہ چلا اور اُسے سزا ہوگئی۔

اِدھر کومل کی سنئے۔ اس شمع پر مرمٹنے والوں میں جس ایک نئے پروانے کا اضافہ ہوا تھا وہ تھا گنپت ریڈی۔ اس نے اپنے دوست انسپکٹر صاحب سے

استدعا کی کہ اس پنچھی کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ کومل کانتی سے پوچھ گچھ کر کے انسپکٹر صاحب نے یہ پتہ لگا لیا تھا کہ وہ ایک لاوارث لڑکی ہے جسے مور واغوا کر کے لایا تھا۔ سیٹھ بھگت رام کی رپورٹ میں بھی اس کا کہیں تذکرہ نہیں تھا۔ اب وہ مالِ غنیمت تھی۔ اُسے دیکھکر طبیعت تو انسپکٹر صاحب کی بھی للچائی۔ لیکن ان دنوں وہ اپنی جائز اور ناجائز ساری آمدنی ایک ذاتی زیرِ تعمیر کوٹھی میں لگانے پر تلے ہوئے تھے۔ اور انہیں ہر وقت نقد روپے کی شدید ضرورت محسوس ہوتی رہتی تھی۔ زر اور زن میں سے آج کل انہیں اوّل الذکر کی سخت ضرورت تھی۔ اس لئے آخر الذکر کو انھوں نے اس پر ترجیح دے رکھی تھی۔ پھر کیا تھا۔ کومل کانتی کی بولی لگائی گئی اور وہیں ان کی میز پر گنپت ریڈی نے دو ہزار کے کرنسی نوٹ گن دیئے اور اس چھوکری کو اپنی جیپ کار میں ڈال کر ظہیر آباد روانہ ہو گیا۔

ان دنوں ریاست حیدرآباد میں کمیونسٹوں کا بڑا زور تھا۔ گنپت ریڈی پوشیدہ طور پر کمیونسٹوں کو ہتھیار فروخت کیا کرتا تھا اور اس طرح اسے خوب آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔ ایسے خفیہ کاروبار کے لئے اس نے ظہیر آباد کے کسی غیر آباد حصے میں ایک وسیع باغ میں مکان بنوا کر رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ یوں تو اس کے تمام عزیز و اقارب حیدرآباد میں رہا کرتے تھے۔ اس مکان میں چند مخصوص ملازمین کو ہمراہ لئے وہ سکونت اختیار کئے ہوئے تھا۔ ان مخصوص ملازمین میں کیشو بھی شامل تھا۔ مورو کا عیاش اور بد اطوار باپ کیشو تجارت میں دیوالیہ ہو کر گنپت ریڈی کی نوکری کرنے لگا تھا۔ وہ اس کا راز دار ملازم تھا۔ گنپت ریڈی اسے کافی محنتانہ دے دیا کرتا تھا۔ ہوس پرست کیشو وہ ساری رقم شراب اور رنڈی بازی میں پھونک دیتا تھا۔ اس دفعہ گنپت ریڈی جو حیدرآباد سے لوٹا تو بہت بڑا ہاتھ

مار کے لوٹا تھا۔ کیشو لو نے دیکھا کہ نوٹوں کے پلندوں کے ساتھ وہ ایک پکھیرو بھی پھانس لایا تھا شیطان کیشو لو کومل کانتی کو دیکھتے ہی دل پکڑ کر رہ گیا۔ پھر جیسے جیسے دن گذرنے لگے وہ اس معصوم چڑیا کو پھانسنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔

گنپت ریڈی ایک سمجھ دار عیاش تھا۔ وہ حسن و شباب کا پرستار اور قدر داں تھا۔ مجبور اور لاچار لڑکیوں کا کنوارپن لوٹنے سے اسے قطعی نفرت تھی، ایک طرفہ عیش کا وہ ہرگز قائل نہ تھا کئی دوشیزاؤں کو وہ ان کی دوشیزگی سے عاری کر چکا تھا لیکن صرف ان کی رضا و رغبت پر معصوم کلیوں کو مسلنا اس کا مسلک نہیں تھا۔ اس نے اس کھلتی ہوئی کلی کو بھی چٹکنے کا موقعہ دیا۔ وہ کومل کانتی کے ناز اٹھانے لگا۔ اس کے ساتھ خلوص و پیار کا برتاؤ کرنے لگا۔ اس کے لئے اعلیٰ قسم کی ساڑیاں خریدیں۔ بھانت بھانت کے دل کش ملبوسات سلوائے، گہنے پاتوں سے اسے مرصّع دیکھ دیکھ کر خوش ہونے لگا۔ غرض اس نے نت نئی دل چسپی کے سامان کومل کانتی کے لئے مہیا کر دئے تھے۔ کیشو لو ہنوز ناپاک ترکیبوں کے سوچنے میں منہمک تھا۔ ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آئی کہ اگر گنپت ریڈی کو گرفتار کرا دیا جائے تو اس بلبلِ ناتجربہ کار کو وہ آسانی سے قابو میں کر سکے گا۔ پھر یہ ماہ پارہ اسی کے بس میں ہوگی۔ اس

خوف ناک اور شرم ناک ترکیب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کیشو لو کمربستہ ہو گیا۔ اُسے اس خیال کا مطلق احساس اور خوشی نہیں تھی کہ وہ گنپت ریڈی کے جرائم سے حکومت کو آگاہ کر کے کچھ کارِ خیر کر رہا ہے بلکہ وہ اپنی غرض کے لئے اپنے محسن آقا کو ہر خطرے میں جھونک دینے پر تلا ہوا تھا۔ اور ایک

دن اس نے سی آئی ڈی والوں کو گنپت ریڈی کے خفیہ کاروبار سے آگاہ کر دیا اور موقع کا انتظار کرنے لگا۔ پولیس آئی اور گنپت ریڈی نے بڑی موٹی رقم دے کر چھٹکارا پا لیا لیکن کیشو نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اس نے حیدرآباد کوتوالی میں ساری کارروائی لکھ بھیجی ایک ہفتہ بعد گنپت کے گھر پر پولیس نے بڑا کامیاب چھاپہ مارا اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ اُسے ذرا بھی شبہ نہ ہوا کہ جس جال میں وہ پھنس گیا ہے اس کے اطراف یہ کیشو ہی نے تنا تھا۔ ہتکڑیاں لگا کر اُسے پولیس والے لیجانے لگے تو کومل کانتی سہمی ہوئی دروازے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ ایسی دل نواز محبوبہ کی موجودگی میں گنپت ریڈی کے لئے اپنی یہ رسوائی اور جگ ہنسائی ناقابل برداشت ہو گئی جب اس نے کومل کانتی کی آنکھیں بھیگی ہوئی دیکھیں تو تڑپ کر رہ گیا اس نے اپنے وفادار خادم کیشو سے گڑگڑا کر التماس کیا کہ وہ کومل کانتی کو حیدرآباد میں اُس کے عزیزوں کے ہاں پہنچا دے جب جیل سے وہ رہا ہو کر آئے گا تو وہاں سے اُسے واپس لے آئے گا۔ پولیس والوں نے اسے اپنی لاری میں سوار کرایا اور لاری چل پڑی۔ کومل کانتی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے دل میں ایک طوفان اٹھا ہوا تھا۔ لیکن کیشو کا عجیب حال تھا گویا اس پر کڑی پابندیاں لگانے والا اس کا ظالم باپ ابھی ابھی لاکھوں کی جائداد چھوڑ کر چل بسا ہو۔ اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے کومل کانتی کو ہمراہ لیا اور حیدرآباد روانہ ہو گیا۔ کومل کانتی اس وسیع دنیا میں اپنے آپ کو پھر تنہا اور مصیبت زدہ محسوس کرنے لگی۔ اسے اس بوڑھے سے خوف معلوم ہو رہا تھا۔ یکایک اس وقت انیل کی یاد آئی۔ یہ تو اُسے معلوم تھا کہ حیدرآباد کے کسی کالج میں انیل

پڑھتا ہے۔ لیکن اسے یہ امید بالکل نہیں تھی کہ وہ ایلی کو پا بھی سکے گی۔ پر اس کے دل میں اس کی کوئی بجھتی ہوئی چنگاری چھپی پڑی تھی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں کی مصداق کیشو لو کو کومل کانتی دستیاب ہوئی تھی۔ وہ اب جلد سے جلد اس کے کنوارپن کو لوٹ لینے کے لئے بیقرار ہو رہا تھا۔ جب وہ حیدرآباد اسٹیشن پر اترا تو گنپت ریڈی کے عزیز و اقارب کے گھر جانے کے بجائے، کومل کانتی کو لئے وہ جام باغ روڈ کے سینٹرل ہوٹل میں آٹھیرا۔ اُسے مسرت ہو رہی تھی کہ وہ مہ لقا آج اس کا بیڑہ گرائے گی جس کے لئے وہ ایک عرصہ سے تڑپ رہا تھا۔ بھلا لبوں تک پہنچا ہوا جام اس کے ہاتھوں سے اب کون چھین سکتا تھا۔ ہاں لیکن وہ بھول رہا تھا کہ کومل کانتی ایک معصوم لڑکی ہے جس پر پربھو کی وہ تنہائی میں پرستش کیا کرتی ہے وہ ہمیشہ ہر خطرے سے اسے بچا لیتا ہے۔ جیسے جیسے دن ڈھلنے لگا کیشو لو کا پیمانۂ صبر لبریز ہوتا گیا۔ وہ اپنے پروگرام کو رنگین بنانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ شراب و کباب کا انتظام کرنے کی غرض سے باہر جاتے ہوئے وہ کومل کانتی سے یہ کہہ گیا کہ وہ گنپت ریڈی کے رشتہ داروں کا پتہ لگانے جا رہا ہے۔ جلد ہی لوٹ آئے گا۔

اس دوران میں سزا بھگت کر مدو جیل سے باہر آ چکا تھا۔ وہ اپنے دوست عامر جائسی کی کھولی ہی میں رہنے لگا تھا۔ اُسے دو باتوں کی تلاش تھی، ملازمت اور کومل کانتی۔ وہ ان کی کھوج میں حیدرآباد کے شاہراہوں اور گلیوں کی خاک چھاننے لگا۔ ایک دن اسی طرح سرگرداں پریشان پھرتا ہوا وہ جام باغ روڈ سے گذر رہا تھا کہ ایک کھڑکی پر اس کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ وہ ٹھٹھک کر غور سے دیکھنے لگا۔ شام کے دھندلکے میں بھی اس نے پہچان لیا،

وہ کومل کانتی تھی۔ کیشو لو کے باہر جانے کے بعد کومل کھڑکی سے لگی شاہراہ پر دیکھ رہی تھی کہ کاش اس راہ سے انیل گذرتا ہوا اُسے نظر آ جائے۔ انیل کے بجائے مورو کو دیکھ کر کومل کانتی کو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کی مصداق خوشی ہی ہوئی۔ کیشو لو کی بدنیتی کو وہ تاڑ گئی تھی۔ بہرطور وہ اس کے چنگل سے نکل جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنی عمر کے اس دور سے گذر رہی تھی جس میں قدم رکھتے ہی ہر لڑکی کو اپنی نسوانیت کا احساس اور عصمت و عفت کے تحفظ کا خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ مرد کی اچھی بُری نظروں کو بھانپ لیتی ہے۔ لہذا کیشو لو کی قید سے نجات پانے کی خاطر اس معصوم لڑکی نے مسکراہٹ کے ساتھ مورو کو اشارہ کیا اور اوپر اپنے کمرے میں بلا لیا۔ جب مورو اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ اُسے اُسی لمحے اُسی حالت میں اغوا کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن کومل نے اسے صبر سے کام لینے کو کہا۔ اس نے اسے بتایا کہ ایک بدچلن بوڑھے نے اُسے یہاں لا رکھا ہے۔ اس حالت میں اگر وہ مورو کے ساتھ نکل پڑیگی تو ہوٹل والوں کو ضرور شبہ ہو گا۔ مناسب یہ ہو گا کہ تاریکی چھا جانے پر اس ارادہ کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ کومل نے اس وقت مورو کو کچھ نقدی بھی دی۔ جیل سے چھوٹا ہوا مورو اس قدر روپیہ پا کر باغ باغ ہو گیا۔ ہماری جیلوں میں قیدی کی اصلاح ہونے کے بجائے دوسرے جرائم پیشہ لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر اُسے زیادہ خطرناک بن جانے کے کثیر مواقع ملتے رہتے ہیں۔ کومل کانتی سے ملی ہوئی رقم سے مورو نے دوسری چیزوں کے علاوہ ایک چاقو بھی خریدا تا کہ رات کی تاریکی میں ضرورت پڑنے پر وہ اسے استعمال کر سکے۔

بوڑھا کیشو لو سر شام ہی لوٹ آیا تھا، وہ واقعی بغل میں شراب کی بوتل دبائے ہوئے تھا۔ اس نے کاگ اُڑایا، بوتل کومل کانتی کے سپرد کر کے اسے ساقی کے فرائض انجام دینے پر اصرار کرنے لگا۔ گنیت ریڈی کے ہاں رہ کر کومل کانتی اس میٹھے زہر سے کچھ کچھ شناسا ہو چکی تھی۔ وہ اس قدر جانتی تھی کہ اسے زیادہ مقدار میں چڑھانے پر آدمی اس کے نشہ میں مدہوش ہو کر نکما ہو جاتا ہے۔ کیشو لو سے وہ خوف زدہ تو ہو ہی رہی تھی۔ اس نے خیر اسی میں سمجھی کہ بوڑھے کو بدمست بنا کر اپنی لاج بچالے۔ وہ اپنے لبوں پر شوخ مسکراہٹ لئے جام بھر بھر کر کیشو لو کو پلانے لگی۔ بوڑھا حد سے زیادہ پی گیا اور اپنی چنچل محبوبہ سے کچھ دست درازی کرنے کے قابل نہ رہا۔ کچھ دیر اول فول بکتا رہا۔ کومل پر حریصانہ نظریں ڈالتا ہوا اسے اپنی گرفت میں لینے کی ناکام جا و جبار کرنے لگا۔ لیکن مدہوشی بڑھتی ہی گئی۔ آخرش ناتواں اور نڈھال ہو کر وہ گر پڑا۔ کومل نے ایک اطمینان کی سانس لی۔ اور اسے ایک چادر اُڑھادی۔ کچھ عرصہ بعد مورو چھپتا چھپاتا اندر آگیا۔ مورو کے ساتھ چلنے کے لئے وہ اپنے زیورات کا اٹیچی اور نقدی سے بھرا ہوا ہینڈ بیگ لئے بیٹھی تھی۔ مورو جب کومل کانتی کے قریب پہنچا تو فرش پر پڑے ہوئے کیشو لو نے چادر میں حرکت کی اور کچھ شرابیوں کی بڑ ہانکنے لگا۔ مورو پر ہیبت چھا گئی کہ مبادا اس کا رقیب اس پر حملہ کردے۔ اس نے اپنا چاقو نکال لیا اور ایک دم اس پر جھپٹ پڑا اور پوری طاقت سے وہ چار کرنے وار کر دئے۔ اس وقت کومل کانتی نے دیکھا کہ مورو کی جیب سے ایک پوسٹ کارڈ وہاں لاش پر گر پڑا۔ وہ اسے اٹھانا چاہتی تھی لیکن وہ بوڑھا کیشو لو چادر میں لپٹا ہوا بل کھانے لگا تھا جس سے

اس کا دل خوف سے لرز اٹھا۔ مورو اس کا سامان لئے اسے گھسیٹتا ہوا نیچے اتر پڑا۔ وہ رات انہوں نے عامر جاؤش ہی کی کھولی میں بسر کی۔ عامر جاؤش کے استفسار پر مورو نے اسے کہہ دیا کہ وہ اس کی جورو ہے جو اچانک میکے سے آگئی۔ بھولا بھالا عامر بلا کسی حجت کے اس پر یقین کر گیا۔ اس چھوٹی سی بوسیدہ کوٹھری میں وہ تینوں سو رہے۔ مورو نے عامر سے کہا تھا کہ وہ کل اپنی لگائی کے لئے علیحدہ مکان کا انتظام کرے گا۔

جب دن نکلا تو غریب عامر حسب معمول اپنی نوکری پر چلا گیا۔ اب تنہائی پاکر مورو کومل کانتی سے چھیڑ خانی کرنے لگا۔ کومل کانتی کی اس وقت کی حالت آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصداق تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب اس شہدے سے کس طرح چھٹکارا پائے۔ کومل نے یہ اندازہ لگایا کہ اس کی سج دھج دیکھکر مفلوک الحال مورو کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ اس کے حسن و شباب کی نسبت اس کا قیمتی لباس اور بیش بہا زیورات مورو کی نگاہوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ کومل کانتی نے بڑی دور اندیشی سے کام لیا۔ کمال چالاکی اور پریم بھاؤ سے اس نے مورو کو اپنے بس میں کیا۔ اس نے کچھ روپے اس کے حوالے کئے اور ایسے لب و لہجہ میں جس سے مورو یہ سمجھے کہ بس اب وہ اس کی اور صرف اسی کی ہو کر رہنا چاہتی ہے، کہنے لگی کہ پہلے روزگار تلاش کرو اور پھر کوئی اچھا سا مکان کرایہ پر حاصل کرو جہاں کہ وہ عیش و عشرت میں زندگی بسر کر سکے۔ ایک پری چہرہ نازک اندام معشوقہ اور اس قدر نقد روپیہ مل جانے پر مورو کی حالت اس بھک منگے کی سی ہو گئی جسے کئی دنوں کے فاقوں کے بعد کثیر مٹھائیوں سے اس قدر شکم سیر کر دیا گیا ہو کہ بس پیٹ اب پھٹا اب پھٹا۔ وہ کچھ مطمئن سا ہو گیا اور وقتی طور پر

اس کی نفسانی خواہش سرد پڑ گئی۔ اور اپنی جان نواز محبوبہ کے من کو رام کرنے کی خاطر وہ روزگار اور مکان کی تلاش میں اسی وقت روانہ ہو گیا۔ شاید اس کے اطمینان کی وجہ اس کا یہ خیال ہو کہ اس کے شکنجے میں پھنسی ہوئی اس بلبل کو اب کون رہا کرا سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ آج کے دن کو رنگین بنانے کی غرض سے بھٹک کر کسی مے خانے میں جا بیٹھا ہو۔ جو اُس وقت کا گیا ہوا وہ ہنوز نہیں لوٹا......

یہ ہے وہ داستان جو انیل نے مجھے سنائی۔

"آگے جو ہوا وہ شاید آپ جانتے ہی ہیں" انیل کے اس جملے نے مجھے چونکا دیا، جیسے میں ایک خواب دیکھ کر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

"لیکن درمیان میں تم کہاں غائب ہو گئے تھے! میں ابھی تمہاری ہی تلاش میں گیا تھا" میں نے اظہار حیرت کرتے ہوئے پوچھا۔

انیل کہنے لگا۔ "عامر چاؤش کا مکان ڈھونڈتا ہوا جب میں گلی میں پہنچا تو وہاں کومل کانتی کو دروازے میں کھڑی دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ بھی مجھے فرشتہ رحمت سمجھ کر حیران کن مسرت سے دیکھنے لگی تھی۔ اس نے مجھے اندر بلا کر استدعا کی کہ میں اسے اس جہنم سے نکال کر کہیں لے چلوں۔ جیسے کسی پیدائشی اندھے کو دفعتاً آنکھیں مل جائیں تو وہ کافی دیر تک اپنی بصارت پر یقین نہیں کرتا۔ میرا بھی وہی حال ہو رہا تھا۔ حیدرآباد چلے آنے کے بعد دو مرتبہ میں کومل کانتی سے ملنے وقارآباد گیا تھا لیکن اس کا کہیں سراغ نہ مل سکا تھا۔ ...... اب وہ میرے سامنے کھڑی تھی اور گڑگڑا رہی تھی کہ میں جہاں کہیں چاہوں اُسے لے چلوں۔ دوبارہ جب رکشا کر میں وہاں پہنچا تو خوش قسمتی سے گلی سنسان تھی۔ میں اُسے لئے ایک ہوٹل میں جا پہنچا۔ اچانک اس طرح کومل کانتی کے مل جانے پر آپ نے میرے سپرد کی ہوئی خدمت

بھی میں فراموش کر گیا۔ لیکن جب کومل نے اپنی ساری آپ بیتی مجھے سناڈالی تو میں نے محسوس کیا کہ اس کا اس طرح ہوٹل میں ٹھیرنا خالی از خطرہ نہیں۔ پھر مجھے آپ کا اور آپ نے مجھے سونپی ہوئی خدمت کا خیال آیا۔ مجھے آپ پر بھروسہ ہے۔ میں کومل کانتی سے سچی محبت کرتا ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ آپ ضرور ہماری مدد کریں گے اس لئے بے کھٹکے میں اُسے آپ کے ہاں لے آیا۔ اور بھگوان کی کرپا سے آپ نے ہمیں پناہ دی ہے"

انیل کو ہمراہ لئے جب میں اندر پہنچا تو یہ معلوم کر کے مجھے تعجب زا خوشی ہوئی کہ کومل کانتی نے تنہا کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ صوفہ پر نیم دراز حالت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت تھک گئی ہوگی بے چاری۔ اتنی کم سنی میں وہ کیسے کیسے بھیانک سروپ دیکھ چکی تھی لیکن "پربھو" نے اس کی حفاظت کی اور ہر آفت سے اُسے بچاتا رہا۔ میں نے عقیدت کی نگاہوں سے اُس ننھی گڑیا کو دیکھا۔ انیل کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ میں انہیں ساتھ لئے ڈائی ننگ روم میں جا پہنچا ہم تینوں ابھی کھانا کھا ہی رہے تھے کہ ملازم نے میر محلہ کی آمد کی اطلاع دی جیسے امتحان کے تمام پرچے خوش اسلوبی سے حل کرنے والے طالب علم کو نتیجہ کے دن اخبار دیکھنے سے قبل یقین ہوتا ہے کہ اس کا نام فسٹ کلاس میں پاس ہونے والے طلباء کی فہرست میں چھپا ہو گا۔ اسی مطابق مجھے بھی یقین تھا کہ اسوقت میر محلہ کوئی خوش خبری ہی لئے آیا ہو گا۔ میں نے اُسے وہیں کھانے کی میز پر بلا لیا۔ جب اسے شریک طعام ہونے کی میں نے دعوت دی تو اس نے انکساری کے ساتھ انکار کر دیا۔ اور میرے اصرار پر صرف میٹھے کے پلیٹ پر اکتفا کر کے رہ گیا۔ اس دوران میں وہ کومل کانتی کو گھور گھور کر دیکھنے لگا تھا تب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ میں نے کومل کانتی

کی موجودگی میں اس کرخندار کو یہاں کیوں بلا لیا، لیکن میں اپنی غلطی نبھا گیا۔

"یہ میری بڑی بیٹی ہے۔ سب سے بڑی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کرخندار جی نے دونوں ہاتھ جوڑ دئیے۔

"اب سناؤ کیا خبر لائے ہو؟" میں نے اس کو کومل کانتی کی طرف مزید گھورنے کا موقع نہیں دیا اور ایک دم پوچھ بیٹھا۔

"آپ کے جانے کے بعد موہن آیا تھا" میر محلہ اپنی کارکردگی پر روشنی ڈالتا ہوا بولا "ہم سب نے مل کر اُسے ڈانٹ ڈپٹ کی۔ وہ پہلے تو اس قتل پر لاعلمی کا اظہار کرتا رہا۔ لیکن جب میں نے کل والے پوسٹ کارڈ کا تذکرہ کیا تو بچّہ جی کی چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ پھر ہم نے اُسے عامر چاؤش کی بے بسی اور گرفتاری کا قصہ سنایا تو وہ تھانے چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ وہ شاید دن بھر تاڑی پیتا رہا تھا۔ اس کے مونہہ سے کڑی شراب کی بھبک آ رہی تھی ہمارے کپڑے پسینے میں تر بتر تھے جسم پر اور لباس پر کہیں کہیں کیچڑ کے دھبے بھی لگے ہوئے تھے۔ ہم اُسے تھانے لے گئے اور تھانہ دار جی کو کل والے پوسٹ کارڈ کی بات بتا دی۔ انہوں نے کڑے لفظوں میں موہن سے باز پرس کی اور ہمارے سنگ اُسے لاش کی شناخت کرانے لے گئے۔ کیا بتاؤں صاحب پھر کیا ہوا ——؟"

آگے کی بات بتاتے ہوئے میر محلہ جیسے خوفزدہ ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے میز پر سے پانی کا بھرا ہوا گلاس اٹھا لیا اور ایک ہی سانس میں غٹ غٹ پی گیا۔ پھر انگلیوں سے مونہہ اور اپنی دراز مونچھوں کو پونچھتا ہوا بولا "موہن بُری طرح لاش سے لپٹ گیا اور دھاڑیں مارتا ہوا رونے لگا۔ پھر لاش کے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے تھام کر بولا" باپو باپو ـــ میں نے تمہیں قتل کیا۔ مجھے پتہ نہیں تھا باپو کہ

چادر لپیٹ کر تم سو رہے تھے۔ ہاں بابو میں نے — میں نے ہی تمہاری ہتیا کی ہے۔ ان ہی ہاتھوں سے بابو! میں نے تمہیں قتل کیا ہے۔"

یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے میر محلہ نے بڑی شاندار ایکٹنگ کی جیسے سچ مچ وہ اس وقت مورد تھا اور کوئی لاش اس کے سامنے پڑی ہوئی تھی۔ اس کے اس بیان کو سُن کر ہم بھی لرز کر رہ گئے۔ کومل کانتی کی آنکھوں کے سامنے گویا وہ پورا نظارہ پھرنے لگا تھا۔ پانی پیتے ہوئے اُسے ایک ٹھسکا لگا اور معذرت چاہتی ہوئی وہ اندر چلی گئی۔ جس واقعہ کے تصور ہی سے ہمارے کلیجے دہل گئے اسے وہ معصوم لڑکی اپنی نظروں کے سامنے حقیقت میں ہوتا ہوا دیکھ چکی تھی۔ شاید وہ اسے دوبارہ سننا بھی برداشت نہ کر سکی اور وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔

میر محلہ آگے کہنے لگا۔ "پھر کیا تھا۔ تھانہ دار نے مورد کو لاش سے جدا کیا اور اس کی جیب سے چاقو برآمد کر کے اُسے ہتھکڑی لگا دی۔" اتنا کہہ کر گلاس میں پانی کی جو مقدار بچ گئی تھی اُسے وہ پینے لگا۔ شاید مورد کی اس وقت کی حالت اور اس قیامت خیز نظارہ کے تصور سے اس پر بھی ہیبت طاری ہو گئی تھی۔ انیل بھی سہما ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں اُن سے مخاطب ہو کر بولا۔

"اخلاق کی پستی اور عیش پرستی انسان کو کس طرح تباہ کر دیتی ہے اس کی یہ ایک روشن مثال ہے۔"

"تھانہ دار بولا —" میر محلہ اپنے چہرے اور گلے کا پسینہ خشک کرتا ہوا کہنے لگا۔ "کل بڑا صاحب آنے پر عامر چاؤش کو چھوڑ دے گا۔"

"دُکر خدا رجی" میں نے اس کا شکریہ ادا کرنے کے انداز میں کہا۔ "آپ نے ہمیں یہ خوشخبری سنائی ہم صرف خالی خولی آپ کا شکریہ ادا نہیں کرتے، بلکہ

کل اپنے ہاں ہونے والی خوشی کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ یہ جو ابھی اندر گئی ہے نا، میری بڑی بیٹی، کل اس کی شادی ہے۔ یہ آپ کے سامنے میرا ہونے والا داماد بیٹھا ہے۔ ان دونوں کی کل شادی ہوگی، آپ ضرور آئیے گا بھولئے گا نہیں۔"

اور کرخندار نے اس عزت افزائی پر پھر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

نوٹ

"کنواں" کہانی میں ایک کردار "نلنی" پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی گئی۔ اس کہانی میں صرف اس کی علالت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس معصوم نلنی نے "ایک انار۔۔۔" کہانی کی ہیروئن "کومل کانتی" سے بھی زیادہ، اس دکھ بھرے سنسار کے بھیانک روپ دیکھے ہیں۔

پریم بابو کو نلنی کہاں اور کس طرح ملی تھی، یہ جاننے کے لئے نلنی کی پردرد لیکن دلچسپ کہانی اسی مجموعہ میں "جلی ہوئی دیا سلائی" کے عنوان سے ملاحظہ فرمائیے۔

"کنواں" کہانی میں "چھوٹے سرکار" سے مل کر آپ خوش ہوں گے۔

پبلیشر

کنوال

نلنی، فیلخانہ کے خاندانی حکیم منظر علی صاحب کے زیر علاج تھی۔ پچھلی رات سے اس کی حالت کچھ اطمینان بخش تھی اور آج دوائی تبدیل کرانی تھی۔ اس لئے ناشتہ کے بعد سب سے پہلا کام میرے لئے، اس کی دوائی لانا تھا۔ میں نے دوا کی شیشی کوٹ کی جیب میں ڈالی اور سائیکل اٹھا کر جانے لگا۔ ابھی اپنے گھر کے سامنے ہی تھا کہ راجہ بہادر نرسنگ پرشاد کا ملازم آداب بجا لایا اور جیب سے ایک ملفوف خط نکال کر اس نے میری طرف بڑھا دیا۔

"کیا راجہ بہادر کا کچھ پیام لائے ہو؟" میں نے لفافہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں۔ چھوٹے سرکار نے رات میں یہ خط دیا تھا کہ صبح ہوتے ہی آپ کو پہنچا دوں۔"

"اچھا اچھا!" میں نے لفافہ جیب میں رکھتے ہوئے کہا اور سائیکل پر سوار ہو کر حکیم منظر علی صاحب کے مطب کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں آہستہ آہستہ سائیکل چلا رہا تھا لیکن میرے دماغ میں بڑی تیز رفتاری سے متفرق خیالات گھوم رہے تھے۔ "چھوٹے سرکار!" میرے لبوں کو جنبش ہوئی اور ایک طنز سے میں مسکرانے لگا۔ چھوٹے سرکار سے مراد اجیت کمار۔

راجہ بہادر نرسنگ پرشاد کا لاڈلہ پوتا۔ جسے میں روزانہ ایک گھنٹہ پڑھانے جایا کرتا ہوں۔ اس طرح رقعے بھجوانے کی اسے ایک عادت سی ہوگئی ہے۔ اسی لئے میری نظر میں ان رقعوں کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ آخر ہوتا ہی کیا ہے ان رقعوں میں جو میں انہیں اہمیت دیتا۔ جب بھی میں بڑے اشتیاق سے رقعہ نکال کر پڑھتا تو اس میں اس قسم کا مضمون پاتا "سر! آج ہم عثمان ساگر پکنک کو جارہے ہیں آپ پڑھانے کے لئے تشریف لانے کی زحمت گوارہ نہ فرماویں" یا پھر کسی رقعہ میں ہوتا "سر! آج ورنگل والی آنٹی آئی ہوئی ہیں۔ ہم ان سے بات چیت کریں گے۔ پڑھنے کے لئے وقت نہ نکلے گا" اور کوئی رقعہ تو یہ مضمون لئے ہوئے ہوتا "مائی ڈیر سر! آپ بڑے اچھے ہیں آج ہمیں پڑھنے کا مطلق موڈ نہیں ہے ذرا چھٹی دے دیجئے" بھلا اس قسم کے رقعوں سے آدمی بیزار نہ ہو جائے تو کیا کرے۔ اس بیزاری کو قابل برداشت سمجھ کر میں چھوٹے سرکار کا اس لئے مشکور ہوتا کہ یہ بھلا آدمی قبل از وقت اطلاع تو دے دیتا ہے جو میں اس بچے ہوئے گھنٹے کو اپنے دوسرے مصرف میں لے آتا ہوں اب بھی ملازم نے مجھے رقعہ تھمایا تو ویسے ہی بغیر پڑھے میں نے اسے جیب میں رکھ لیا۔ اور ایک طرح سے خوش ہی ہوگیا کہ چلو اب یہ ایک گھنٹہ نلنی کی تیمارداری میں وقف کردوں گا۔

فی الحقیقت میں چھوٹے سرکار کی پڑھائی سے بالکل تنگ آچکا تھا' نالاں ہوگیا تھا۔ بار بار چھٹیاں لینے کی اس کی یہ عادت مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ شروع شروع میں تو میں درگذر کرتا رہا۔ لیکن آخر کب تک۔ جب رقعوں کی تعداد بڑھتی ہی جانے لگی تو میں نے ایک روز راجہ بہادر سے شکایت بھی کردی تھی "اگر چھٹیوں کا یہی عالم رہا تو چھوٹے سرکار خاک نہ پڑھ سکیں گے۔ پھر ان کے اس پڑھنے کے سوانگ

پراس قدر روپیہ کیوں ضائع کیا جائے ـــــ ؟

یہ سن کر پہلے تو راجہ بہادر کچھ مسکرانے لگے تھے۔ لیکن پھر یکایک، شاید ان کے دل میں جذبات کا ہجوم برپا ہو گیا اور وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو کر رہ گئے تھے' یہاں تک کہ اس وقت کچھ دیر کے لئے شاید وہ میری موجودگی بھی فراموش کر گئے تھے۔ ان کے آنکھوں سے ڈھلا ڈھل آنسو بہتے دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ چند ثانئے اسی طرح آنسو بہانے کے بعد انھوں نے ملتجی نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر گلوگیر آواز میں کہا تھا "پروفیسر صاحب میں ہر قیمت پر اس معصوم بچے کو سدھارنے پر کمر باندھے ہوئے ہوں مانا کہ وہ ایک دم نہیں سدھر سکے گا۔ لیکن کیا کروں اس کا باپ بھی زندہ نہیں۔ میں اسے مطلق ڈانٹ ڈپٹ نہیں کر سکتا نہ ہی سخت سست کہہ سکتا ہوں۔ بلکہ کوئی اس سے اگر ترش روئی سے کلام کرے تو میرا کلیجہ موہنہ کو آجاتا ہے۔ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی لئے میں نے معمولی منشی یا ٹیچر کے بجائے اس کی پڑھائی آپ کو سونپی ہے۔ کوشش کیجئے۔ بس پریم اور میٹھی بولی سے اسے راہ راست پر لائیے۔ پرواہ نہیں' اس کی مرضی کے مطابق گاہے گاہے چھٹیاں بھی دے دیا کیجئے ـــــ" اور پھر باتوں ہی باتوں میں اس دن راجہ بہادر نے مجھے اجیت کے بگڑ جانے کے عجیب حالات اس انداز میں سنائے تھے کہ میرا دل دہل گیا تھا۔

راجہ بہادر کے گھر میں دو چراغ روشن تھے ـــــ منورما اور مہیش کمار! منورما بڑی ذہین اور حسین لڑکی تھی۔ انیسویں سال میں جب اس نے قدم رکھا تو راجہ بہادر کو اس کے لئے موزوں بر کی تلاش ہوئی ست نارائن نامی ایک نوجوان راجہ بہادر کا پروردہ تھا۔ ست نارائن کے بچپن میں اس کا باپ راجہ بہادر کی

گرنی میں کسی حادثہ کا شکار ہو گیا تھا۔ اس لئے بطور ہمدردی کے راجہ بہادر نے اس یتیم لڑکے، اس کی بیوہ ماں بھانومتی اور ایک چھوٹی بہن کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی ست نارائن کوئی زیادہ پڑھ لکھ نہیں سکا تھا لیکن راجہ بہادر کی سرپرستی میں اس نے تجارت میں کافی تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ جب وہ بالغ ہو گیا تو راجہ بہادر نے ایک آئل مل اس کے نام کر دی۔ ایک علیحدہ مکان تو حادثہ کے دنوں میں ہی وہ بھانومتی کے نام سے خرید چکے تھے اور اسی مکان میں انہوں نے اس خاندان کے رہنے سہنے کا انتظام کر دیا تھا۔ راجہ بہادر کے اس حسن اخلاق سے بھی بھانومتی مطمئن نہ ہو سکی۔ اپنے اجڑے ہوئے سہاگ کی قیمت اسے پوری پوری وصول نہیں ہوئی تھی۔ اب جن دنوں راجہ بہادر منورما کے لئے لڑکا تلاش کر رہے تھے، ایک روز بھانومتی ان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے راجہ بہادر کے آگے دامن پسار کر استدعا کی کہ منورما کی شادی ست نارائن سے کر دی جائے۔

راجہ بہادر اس بڑھیا کے حوصلہ پر "چراغ پا ہو گئے" اور انہوں نے غضبناک ہو کر نہ صرف بھانومتی کی درخواست کو ٹھکرا دیا بلکہ اسے ذلیل بھی کیا۔

"چھوٹا منہ بڑی بات! کہاں راجہ بھوج اور کہاں کا نگڑا تیلی! خبردار جو آئندہ ہم سے برابری کرنے کی کوشش کی ——"

بھانومتی نے گو اس وقت یہ ذلت خاموشی سے برداشت کر لی تھی، لیکن وہ چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح بل کھا کر رہ گئی تھی اور جاتے ہوئے یہ کہہ گئی کہ وہ اس تحقیر کا ضرور بدلہ لے گی اور راجہ بہادر کے خاندان کو ذلیل و خوار کر کے ہی دم لے گی۔ اس کی یہ ڈینگ سن کر راجہ بہادر نے ایک فلک شگاف قہقہہ بلند کیا تھا...... لیکن بھانومتی کی اس دھمکی کو پندرہ سال گذر

جانے پر راجہ بہادر جیسے ایک خواب سے چونک پڑے تھے ——— ہڑ بڑا کر غفلت کی نیند سے جاگ اٹھے تھے۔ ان کے دماغ میں سوئیاں چبھنے لگی تھیں ——— بھانومتی کی جس دھمکی کو وہ ایک پھسپھسی ڈینگ سمجھ رہے تھے وہ عملی صورت میں ظاہر ہو چکی تھی۔ جس کو وہ ہیچ تصور کر رہے تھے اس بھانومتی نے اپنا درجہ ان سے بلند و بالا کر لیا تھا اور راجہ بہادر کی حیثیت اس کے مقابلہ میں ہیچ ہو کر رہ گئی تھی۔ اور ان کا خاندان ذلیل و خوار ہو چکا تھا۔ بھانومتی نے ایک عجیب اور انوکھے طرز پر ان سے بدلہ لیا تھا۔ بڑے اوچھے ہتھیار استعمال کر کے اس نے راجہ بہادر کے خاندانی گھمنڈ کو پاش پاش کر دیا تھا ——— راجہ بہادر کی زبانی، بھانومتی کی اس چال اور ان کی اپنی تباہی کا حال سن کر میں انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔

مہیش کمار اپنی بہن منورما سے چار سال چھوٹا تھا۔ راجہ بہادر اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ انھوں نے اس کی شادی دو تین جگہ طے کرنے کی کوشش کی لیکن مہیش جو کسی اور کو دل دے بیٹھا تھا ہر جگہ اپنی ناپسندیدگی ظاہر کرتا رہا۔ لاڈلے بیٹے کی ہٹ دھرمی کے آگے راجہ بہادر کی ایک نہ چل سکی۔ خاندان کا روشن چراغ اور ساری جائداد کا اکلوتا وارث۔ انہیں اس کی خوشیوں کا خیال تھا۔ انہوں نے اس کی ضد پوری ہونے دی۔ اور مہیش کے کالج میں پڑھنے والی ایک شوخ و چنچل دوشیزہ "کیرتی" کو بہو بنا کر لے آئے۔ کیرتی نے یہ ظاہر کیا تھا کہ چونکہ اس کے والدین اس کی آزادی کے خلاف ہیں، وہ کسی اور جگہ اس کی مرضی کے خلاف اس کا بیاہ رچانا چاہتے ہیں اس لئے شادی میں وہ شرکت نہیں کریں گے۔ لہٰذا شادی میں کیرتی کا کوئی

عزیز یا رشتہ دار شریک نہ ہوا تھا۔ کیرتی مہیش سے والہانہ محبت کرتی تھی۔ اسے اس قدر پریم تھا کہ مہیش کی خاطر وہ اپنے اقربا سے باغی ہو چکی تھی۔ اور سب کو ٹھکرا کر وہ مہیش کی بن چکی تھی۔ غرض کیرتی کالج چھوڑ چھاڑ راجہ بہادر کی نازبردار بہو بن چکی تھی جیسے جیسے دن بیتتے گئے کیرتی کے پنکھ نکلنے لگے اور وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی چلی گئی۔ اس نے مہیش کمار پر کچھ ایسا جادو کر دیا تھا کہ وہ چار دیواری کا ہو کر رہ گیا۔ ادھوری تعلیم چھوڑ کر کیرتی کے ناز اٹھانے کے لئے وقف ہو گیا۔ چند دنوں تک راجہ بہادر چشم پوشی کرتے رہے کہ نئی نئی شادی ہوئی ہے جوانی کا جوش ہے آگے چل کر سب ٹھیک ہو جائیگا۔ لیکن مہیش مزید ایک ایک قدم تباہی کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اب حد سے زیادہ شراب پینے لگا تھا اور ساقی گری کے فرائض کیرتی خود انجام دیا کرتی تھی۔ بس شراب اور کیرتی۔ ان دو کے سوا دنیا کی کسی اور شئے سے اسے سروکار نہیں رہا تھا۔ راجہ بہادر کے کاروبار سے اسے ذرہ بھر دلچسپی نہیں تھی۔ آخر پانی سر سے گذرتا دیکھ کر راجہ بہادر سے چپ نہ رہا گیا۔ ایک روز انہوں نے اسے سمجھانا چاہا اور پند و نصائح کے چند گھونٹ پلانے چاہے۔ انہوں نے اسے اپنے کمرے میں طلب فرمایا۔ مہیش ان کی خدمت میں حاضر ہونے ہی والا تھا کہ کیرتی نے بڑے ناز و انداز سے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور پریم بھری باتیں کرتے ہوئے بڑی تیز شراب کے دو چار پیگ اسے پلا دئے۔ وہ نشہ میں مدہوش لڑکھڑاتا ہوا راجہ بہادر کی خدمت میں پہنچا۔ اور ان کی نصیحت سن کر بجائے اظہار ندامت اور پشیمانی کرنے کے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا۔ راجہ بہادر آگ بگولہ ہو گئے۔ اور انہوں نے اسے گھر سے نکل جانے کا حکم صادر فرما دیا۔ کیرتی گویا

پہلے ہی سے اس دن کی منتظر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے قیمتی زیورات، جواہرات اور کافی نقدی پیشتر ہی سے اپنے والدین کے ہاں منتقل کرا دی تھی۔ اب وہ ہیش کو بھی ساتھ لئے وہاں جا بسی۔ اور ...... اس دن راجہ بہادر کو پتہ چلا کہ یہ الھڑ دوشیزہ جسے وہ بڑی امیدوں اور آرزوؤں کے ساتھ بہو رانی بنا کر لائے تھے۔ بھانو متی کی بیٹی اور ست نارائن کی بہن تھی۔ اس نے یہ خطرناک کھیل ماں کے سکھائے پڑھائے کھیلا تھا۔ شباب، حسن اور غمزہ عورت کے بڑے کامیاب ہتھیار ہیں۔ بھانو متی کی سازش سے کیرتی نے ان ہی ہتھیاروں سے ہیش کو شکار کیا تھا اور اس طرح راجہ بہادر کا گھر اجاڑا گیا تھا ——— اس طور پر اپنی دھمکی کو پورا کرنے کی خاطر بھانو متی نے کیرتی کے ذریعہ فریب کا جال بچھا کر راجہ بہادر کے خاندان کا چراغ ہی گل کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ماں کا دل ٹھنڈا کرنے کی غرض سے کیرتی نے اپنے جذبات کی ہولی کر کے اپنی جوانی کا ناس کر لیا تھا۔ اپنے جیون کو تباہ کر ڈالا تھا۔ انہیں دنوں اجیت نے جنم لیا ——— اس معصوم کو ابتدا ہی سے کیرتی اور بھانو متی نے ایسی گندی تربیت دی کہ وہ نکما اور نا اہل بن کر رہ گیا۔ دانستہ طور پر بیجا لاڈو پیار سے اسے تباہ کر دیا گیا۔ اس دوران میں ست نارائن نے تجارت میں کافی دولت اکٹھی کر لی تھی۔ جنگ چھڑ جانے پر اس نے ملٹری کے بڑے بڑے ٹھیکے لئے اور دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں کی جائداد بنا ڈالی۔ مدراس کے ایک جج کی بیٹی سے اس کی شادی ہو گئی ——— عیش و عشرت میں دن گذرنے لگے۔ ایک چاند سی بچی تولد ہوئی اس کا نام سوشیلا رکھا گیا اور اس کی پرورش پرداخت میں بڑی دور اندیشی اور احتیاط ملحوظ رکھا جانے لگا۔ تعلیم و تربیت

پر پورے خاندان کی ساری توجہات صرف ہونے لگیں اور ست نارائن کی بڑی خوشحالی میں گذر بسر ہونے لگی۔

کسی محفل یا دعوت میں علاوہ دیگر معزز مہمانوں کے جب راجہ بہادر کا خاندان اور بھانومتی کا خاندان مدعو ہوتے تو حاضرین، ست نارائن کی بچی سوشیلا کی خوب تعریفیں کرتے۔ اس کی ذہانت و فراست اور خوش اخلاقی پر سب عش عش کرنے لگ جاتے۔ برعکس اس کے راجہ بہادر کے پوتے اجیت کی شرارتوں اور بداطواریوں پر سب اسے لعن طعن کرتے۔ ساتھ ہی مہیش اور ست نارائن کا موازنہ کیا جاتا اور یہی دو خاندان اس دعوت یا تقریب کے موضوع گفتگو بن جاتے۔ مہیش تو سرے ہی سے ایسی محفلوں میں بہت کم شریک ہوتا تھا۔ ایسے مواقع پر اکثر وہ شراب میں دھت گھر ہی پر پڑا رہتا۔ اگر شرکت بھی کرتا تو "لال پری" بغل میں دابے۔ سب کی تحقیر آمیز نظریں اس پر اور اس کے بچے اجیت پر پڑتیں ـــــ ست نارائن بڑی شان و کروفر سے آتا۔ چہرے پر شیریں مسکراہٹ لئے حاضرین سے ملتا۔ اُن کی پوچھتا اپنی سُناتا۔ اس طرح اپنا خوب اثر جما لیتا اور محفل پر چھا کر رہ جاتا۔ اور سب یہی کہتے کہاں ست نارائن کہاں مہیش اچہ نسبت خاک را با عالم پاک! احتیٰ کہ کوئی بگڑا دل تو راجہ بہادر کے مونہہ پر ان کے خاندان کی شان میں گستاخی کر جاتا۔ کوئی یہ تک کہہ دیتا کہ اس سے تو بہتر تھا کہ راجہ بہادر لاولد ہی مرجاتے ـــ ایک تو گرفتار پرندے کی طرح راجہ بہادر تڑپ تڑپ کر رہجاتے۔ آخر برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے؟ راجہ بہادر آنکھوں دیکھے کانوں سنتے، اور دل مسوس کر رہ جاتے۔ ایسے وقت بھانومتی اپنے چہرے پر طنز آمیز مسکراہٹ لئے انہیں ایسی نگاہوں سے دیکھتی کہ ان کے کلیجے پر تیر و نشتر چل جاتے اور بعض اوقات دعوت ادھوری ہی چھوڑ کر راجہ بہادر گھر چلے جاتے۔

اجیت اٹھارہ سال کا ہو چکا تھا اور اپنی بداخلاقیوں سے خاندان کے

مونہہ پر خوب کالک مل چکا تھا۔ ان ہی دنوں مہیش ایک شب حد سے زیادہ چڑھا کر سیڑھیوں سے گر کر مر گیا۔ بھانومتی نے یہ مشہور کرا دیا کہ اجیت جیسی ناخلف اور بدچلن اولاد پا کر وہ مطمئن نہیں تھا اس لئے اس نے خودکشی کر لی۔ یہ خبر بجلی کی طرح چاروں سمت پھیل گئی اور راجہ بہادر کے کلیجے پر سانپ لوٹنے لگے۔ بیٹا جان سے گیا۔ رہی سہی آن بھی ختم ہو چکی تھی۔ بھانومتی نے خوب گن گن کر بدلے لئے تھے۔ راجہ بہادر کا خاندان ذلت کی عمیق غار میں گر چکا تھا۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً زہر کھا کر سو رہتا۔ لیکن یہ ان ہی کا دل تھا کہ انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ حوصلہ سے کام لے کر وہ ان مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے تن کر کھڑے ہو گئے۔ خاندان کے ٹمٹماتے دئے کو بجھنے نہ دینے کی سعی کرنے لگے ـــــ اجیت کو ننہیال سے اپنے ہاں لے آئے اور ہر قیمت پر اُسے سدھارنے کے لئے کمربستہ ہو گئے ـــــ اسی سلسلہ میں مجھے اجیت عرف چھوٹے سرکار کی پڑھائی کا موقع دیا گیا ـــــ

راجہ بہادر نے چھوٹے سرکار کی تباہی کے راز کی یہ کہانی سنا کر اپنے اُبلتے ہوئے آنسو پیتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ میں اس دردناک نظارے سے تڑپ سا گیا تھا۔ یہ وہ منظر تھا جسے میرا حافظہ مدت العمر بھلا نہیں سکتا۔

میں انہیں خیالات کی ادھیڑ بن میں حکیم منظر علی صاحب کے مطب کے احاطہ میں داخل ہو گیا۔ سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑے کرتے ہوئے میری نظر ایک جانی پہچانی "بے بی آسٹن" پر جا پڑی۔ اس خوش وضع چھوٹی سی کار کو میں روزانہ ہی دیکھا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت اسے ایک مطب کے احاطہ میں دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ یہ وہی آسٹن گاڑی تھی جس میں سوار ہو کر "مس سوشیلا" کالج آیا جایا کرتی تھی۔ وہی مس سوشیلا جسے

حسن و ذہن عطا کرنے میں قدرت نے بڑی دریا دلی برتی تھی۔ اس لڑکی پر ہمارا کالج فخر کیا کرتا تھا۔ اس کا پورا نام تھا مس سوشیلا ست نارائن۔ یہ بھانومتی کے بیٹے ست نارائن کی اکلوتی لاڈلی کنیا تھی۔ اس وقت سوشیلا کی کار کو مطب کے احاطہ میں دیکھ کر مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں یہ غریب بیمار تو نہیں ہو گئی یہ سوچتا ہوا میں حکیم صاحب کے کمرے میں جا پہنچا۔ لیکن ان کی نشست خالی تھی۔ نسخہ بنانے والے صاحب نے بتایا کہ وہ ایک خطرناک کیس کا معائنہ کرنے جوبلی ہل گئے ہوئے ہیں۔ بس اب آتے ہی ہوں گے زنانہ اور مردانہ مریضوں کی انتظار گاہیں مریضوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں اس لئے میں حکیم صاحب کے کمرے میں ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے بیٹھے ہوئے کوئی دو ہی منٹ ہوئے ہونگے کہ حکیم صاحب تشریف لے آئے

"فرمایئے کیا حال ہے نلنی دیوی کا ——!" انہوں نے اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

میں حالت سنانے لگا۔ اتنے میں زنانہ انتظار گاہ کی خادمہ ایک پرچہ لئے آئی۔ اس پرچہ پر سرسری نظر ڈال کر بڑی انکساری سے حکیم صاحب بولے "پروفیسر صاحب براہ کرم آپ دو منٹ کے لئے پردے کی اوٹ میں اس چھوٹے کمرے میں ہو جائیے۔ ایک شریمتی جی مجھ سے فوراً ملنا چاہتی ہیں۔"

"بہت اچھا۔" کہتا ہوا میں پردے کے پیچھے چلا گیا، جہاں ایک کرسی کے علاوہ بستر بھی لگا ہوا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ تو میں دیکھنے سے قاصر تھا کہ حکیم صاحب کے کمرے میں کیا ہو رہا ہے البتہ باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"نمستے حکیم جی" شریمتی جی نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"نمستے۔ پدھاریئے۔ کیا سیوا کر سکتا ہوں میں آپ کی؟" حکیم صاحب نے اپنے ہمیشہ

ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا۔

دو ثانیے خاموشی رہی۔

"کیا آپ کے ہاں..... زہر..... زہر بھی ملتا ہے ——؟" شریمتی جی نے ہلکی آواز میں بڑی جھجک کے ساتھ دریافت کیا۔

لفظ "زہر" سن کر میرے کان کھڑے ہوگئے۔ اور وہ بھی ایک عورت کی زبان سے۔ زہر کی خرید و فروخت اکثر ڈاکٹر، وید یا حکیم ہی کیا کرتے ہیں۔ انہیں اپنی دواؤں میں استعمال کرنے کے لئے زہر درکار ہوتا ہے۔ میری اخلاقی کمزوری یا انتہائی حیرت کا سبب کہئے کہ میں اپنے اشتیاق پر قابو نہ پا سکا۔ اور اس غرض سے پردے کی جھری میں سے جھانکنے لگا کہ دیکھوں یہ عورت کون ہے جسے زہر کی تلاش ہے۔

اور میں نے جن شریمتی جی کو حکیم صاحب کے مقابل بیٹھا پایا وہ کسی بڑے خاندان کی "دادی" یا "نانی" معلوم ہو رہی تھیں۔ حکیم صاحب انکی صورت کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے —— میں حکیم مظفر علی صاحب کو دوسرے ڈاکٹروں پر اس لئے ترجیح دیتا ہوں کہ وہ انسان کا چہرہ دیکھ کر اس کے دلی جذبات پڑھ لیتے ہیں۔ وہ فیس ریڈنگ ایکسپرٹ ہیں۔ کسی کا چہرہ دیکھ کر اس کے دل کی تہہ میں پہنچ جانے میں انہیں ملکہ حاصل ہے۔ اور یہ چیز انہوں نے ورثہ میں پائی تھی۔ ان کے والد مرحوم حکیم عبدالغفور صاحب کے متعلق تو یہ مشہور تھا کہ وہ مریض کو دیکھ کر اس کی موت کے دن اور گھڑی تک کا اندازہ لگا لیتے تھے —— ایک نگاہ خاص سے حکیم مظفر علی صاحب ان شریمتی جی کے چہرے کو گھورتے ہوئے گویا ہوئے۔

"دیوی جی! حکومت نے مجھے سمیات کی فروخت کا پروانہ دیا ہے۔ میں زہر ضرور بیچتا ہوں لیکن آپ کی طرح خودکشی کرنے والوں کو نہیں بلکہ کسی کی

جان بچانے کے لئے دوائی بنانے والوں کو۔۔۔"

حکیم منظر علی صاحب کی زبان سے یہ غیر متوقع کلمات سن کر وہ شریمتی جی کچھ ایسی سٹپٹائیں کہ ان کی زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اور چشم زدن میں وہ کرسی سے اٹھ یہ جا وہ جا، گھر سے باہر ہوگئیں۔ ان کے جاتے ہی میں پردے سے باہر آگیا۔ اس غیر معمولی واقعہ سے میں کچھ سہم سا گیا تھا۔ لیکن منظر علی صاحب کا یہ حال کہ جیسا کچھ ہوا ہی نہیں۔ مجھے سامنے کھڑا دیکھ کر انہوں نے نلنی کے نسخہ کا فارم نکالا، مجھ سے ضروری باتیں پوچھیں، نسخہ لکھا، اور فارم میرے حوالے کرتے ہوئے بولے۔

"آج بھی دوا دے دیجئے۔۔۔"

انہوں نے اس شریمتی جی اور اپنی گفتگو کے بارے میں ایک لفظ تک نہ کہا۔ اور یہی اس خاندانی حکیم کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ ایک مریض کا بھید دوسرے کو کبھی نہیں بتاتا۔ فارم لئے میں نسخہ بنانے والے صاحب کے پاس جا پہنچا اور دوسرے مریض قطار در قطار سلسلہ وار حکیم صاحب کے پاس جانے لگے۔ دوائی لے چکنے کے بعد جب میں باہر نکلا تو مس سوشیلا کی کار مجھے نظر نہیں آئی۔ لیکن مطلب میں سوشیلا کو تو میں نے کہیں نہیں دیکھا۔

گھر پہنچ کر دوائی کی ایک خوراک نلنی کو پلا کر میں چھوٹے سرکار کی پڑھائی کا بچا ہوا ایک گھنٹہ گذارنے کے لئے نلنی کو اخبار پڑھ کر سنانے لگا۔ ایک جلی خط میں چھپی ہوئی سرخی دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ میری خاموشی اور چہرے پر ہویدا تاثرات سے نلنی بھی کچھ اندازہ لگانے لگی۔

"خاموش کیوں ہوگئے آپ! ایسی کون سی خبر ہے جو آپ مجھے سنانا مناسب

نہیں سمجھ رہے۔ اور جسے پڑھ کر خود بھی حیران ہیں؟"
نلنی کے اس سوال سے میں چونک سا گیا۔ اور پھر ہلکی آواز میں اسے وہ خبر پڑھ کر سنانے لگا۔

"ایک کالج کماری کا اغوا"

شہر کے نامور تاجر سیٹھ ست نارائن جی کی لڑکی سوشیلا کماری اپنے کسی آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی۔ جاتے ہوئے وہ ایک خط اپنے باپ کے نام چھوڑ گئی جس میں اس نے لکھا کہ وہ اپنی مرضی سے گھر چھوڑ رہی ہے لہذا اسے تلاش کرنے میں فضول وقت ضائع نہ کیا جائے ——"

اس سنسنی خیز خبر کو پڑھ کر مجھ پر جیسے سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ سوشیلا جیسی سوشل لڑکی نہ جانے کس آوارہ کے فریب میں آ کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی! ایسی ذہین ہونہار معصوم دوشیزہ کسی بدمعاش کے جال میں پھنس کر تباہ ہو جائے گی۔ یہ سترہ سالہ چھوکری کیا جانے پریم کس چڑیا کا نام ہے اور گھر سے باہر قدم رکھنے پر اس مکر و فریب سے بھری ہوئی دنیا میں کیسی کیسی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے.....
لیکن اس کی کار منظر علی صاحب کے مطب میں کیوں آئی تھی؟ اس گتھی کو میں سلجھا نہ سکا۔ نلنی بھی اس دلدوز خبر کو سن کر بڑی متاثر ہوئی۔ سوشیلا کے اس اقدام پر اسے بھی تعجب ہونے لگا۔ وہ سوشیلا کو دیکھ چکی تھی اور اس نے بہت سی امیدیں اس لڑکی سے وابستہ کر رکھی تھیں لیکن یہ سب کچھ کیا ہو گیا —— ؟ میری سمجھ میں کچھ نہ آ سکا۔ میں نے اخبار نلنی کی تپائی پر رکھ دیا اور بے دل سا اپنے کمرے

میں جانے لگا۔

"کیا آج چھوٹے سرکار کو پڑھانے نہ جایئے گا۔" نلنی نے مجھے یاد دلایا۔

"ارے ہاں تم سے کہنا تو بھول ہی گیا۔ چھوٹے سرکار نے آج پھر رقعہ لکھ کر چھٹی مانگ لی ہے۔" میں نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولا "ٹھیرو میں رقعہ لاتا ہوں۔ دیکھیں آج کی چھٹی حاصل کرنے کے لئے چھوٹے سرکار نے کیا عذر پیش کیا ہے!" اور چھوٹے سرکار کے ملازم کا دیا ہوا لفافہ لئے میں نلنی کے بستر پر جا بیٹھا۔ اور لفافہ چاک کر کے چھٹی نکال لی۔ "ارے آج کے رقعہ کی عبارت تو بہت طول طویل ہے" میں نے کہا اور پڑھنے لگا۔

"مائی ڈیر پروفیسر!

آج تک جب بھی کسی روز چھٹی کی ضرورت پڑی دو جملے لکھ کر میں نے آپ کی خدمت میں بھجوا دئے تھے اور اس طرح چھٹی حاصل کر لی تھی۔ لیکن اب یہ خط طول طویل لکھ کر میں آپ سے ہمیشہ کی چھٹی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اسے ملاحظہ فرمایئے اور اپنے لائق شاگرد سے ہاتھ دھویئے۔

پرسوں جب آپ مجھے پڑھا رہے تھے تو میں نے فلسفہ محبت پر آپ سے گفتگو کرنی چاہی مگر آپ نے سبق کی حد تک جوابات دئے اور ٹال مٹول کر دی۔ لیکن ان مختصر جوابات میں بھی آپ نے ایک بات بڑے پتے کی بتا دی تھی کہ محبت میں کسی قسم کے بھید بھاؤ اور تعصب یا جانب داری کو دخل نہیں ہوتا۔ نہ تو محبت کرنا سکھایا جاتا ہے نہ اس کے حاصل کرنے کے لئے کسی ٹریننگ کی ضرورت ہے بس

محبت آپ ہی ہو جایا کرتی ہے، بات تو بالکل تیتے کی تبائی تھی۔
ہاں تو اب آمدم بر سرِ مطلب! بات یہ ہے پروفیسر صاحب آپ کا
یہ لایق شاگرد بھی عرصہ سے محبت کے جال میں پھنس گیا ہے اور
اس بُری طرح پھنسا ہے کہ ع

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

اور جانتے ہیں آپ وہ کون ماہپارہ ہے۔ جس نے آپ کے
شاگرد پر حسن و عشق کا جادو کر دیا ہے؟ وہ ہیں آپ کے کالج کی
شہرت یافتہ حسینہ مس سوشیلا ست نارائن یعنی ہماری آنٹی کی بیٹی۔
وہی ہماری محبوبہ ہیں اور یہ محبت کی آگ کوئی آج ہی نہیں لگی۔
بہت دنوں سے جب کہ میں ننھیال میں تھا یہ پریم کی چنگاری نمودار
ہو چکی تھی جس نے اب ایک شعلہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔

سوشیلا مجھ سے پریم کرنے لگی — باوجود میرے نا اہل
ہونے کے وہ مجھے دیوانہ وار چاہنے لگی۔ جب میں ننھیال سے
ددیال چلا آیا تو اپنی محبت برقرار رکھنے کی غرض سے وہ مجھے
"پریم پتر" لکھنے لگی اور موقع ملنے پر ایک دوسرے کا دیدار کر کے
ہم نینوں کی پیاس بھی بجھاتے رہے۔ پچھلے ہفتہ مدراس کے کسی سول
افسر سے اس کی نسبت طے کر دی گئی جو اسے مطلق پسند نہیں۔ اس لئے
پوشیدہ طور پر وہ مجھ سے ملی اور ہم نے تہیہ کر لیا کہ ان سب کو جو ہماری
محبت کی راہ میں کانٹے بچھا رہے ہیں چھوڑ کر کسی ایسے مقام پر پریم
کی پینگیں بڑھائیں جہاں ع

ہم زباں کوئی نہ ہو اور رازداں کوئی نہ ہو

ہاں تو اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کل صبح ہونے سے قبل
ہی ہم دور دیس میں جا بسیں گے۔ اچھا نمستے۔ اس سے پیشتر تو آپ ہم کو
چھٹی دیا کرتے تھے آج ہم آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کی چھٹی دیتے ہیں۔ چیریو پروفیسر!
آپکا لایق شاگرد ۔۔۔ اجیت کمار عرف چھوٹے"

خط کا مضمون سن کر نلنی تو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور میں سوچنے لگا کہ روؤں یا ہنسوں؟
شام ہوتے ہوتے بھانومتی کی خودکشی کی خبر سننے کو ملی۔ اس نے اپنی عظیم الشان کوٹھی کی بلند ترین چھت پر سے اپنے آپ کو گرا کر اپنا قصہ تمام کر لیا تھا۔ یہ چھت اسی کوٹھی کی تھی جو اس نے اپنے خاندان کا نام اونچا کرنے کے لئے راجہ بہادر نرسنگ پرشاد کی ڈیوڑھی سے بھی شاندار تعمیر کرائی تھی۔ یہ خبر سن کر میں دل ہی دل میں حکیم منظر علی صاحب کی قیافہ شناسی کی داد دینے لگا۔ نہ صرف مطب کے احاطہ میں صبح بے بی احسن گیلہ کے آنے کا بھید مجھ پر منکشف ہو گیا بلکہ زہر کی تلاش میں سرگرداں پھرنے والی شریمتی جی کا اتا پتا بھی مل گیا۔ لیکن اس وقت جب کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں۔
مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے چھوٹے سرکار ایک کنواں تھا جسے بھانومتی نے راجہ بہادر کی تباہی کے لئے کھودا تھا۔ لیکن وہ خود ہی اس میں گر کر جاں دے بیٹھی۔ کاش کہ یہی کنواں اگر صحیح مقصد کو لئے ہوئے۔ ٹھیک طور سے تعمیر کیا جاتا تو اس سنسار کے تھکے ہارے مسافر اس کا میٹھا پانی پی کر بنانے والے کے لئے درازی عمر کی دعائیں کرتے۔

سانپ

جی۔ کرشنا اور طالب میرے بیڈمنٹن کورٹ پر کھیل رہے تھے۔ اور میں وہاں رکھی ہوئی خالی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا ان کے کھیل سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جی۔ کرشنا بیڈمنٹن کا ایک نامور کھلاڑی تھا۔ جب سے وہ حیدرآباد میں دورہ پر آیا تھا گاہے گاہے میرے ہاں آکر اپنے کھیل کے کرتب دکھانے لگا تھا وہ کسی آیورویدک دواساز کمپنی کا ٹریولنگ ایجنٹ تھا اور شاید کوئی پانچ چھ سال سے اپنی فرم کی جانب سے حیدرآباد بھیجا جانے لگا تھا۔ لیکن میری ملاقات اس سے اس مرتبہ کے اس دورہ ہی میں ہوئی تھی۔ کوئی پندرہ روز قبل میں فیل خانہ کے حکیم منظر علی صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اور جی کرشنا اپنی فرم کی دواؤں کے چند نمونے انہیں دکھا رہا تھا کہ وہیں مجھے اس سے تعارف حاصل ہوا اور باتوں ہی باتوں میں جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میں بیڈمنٹن کا نامور کھلاڑی ہوں تو وہ مجھ سے غیر معمولی طور پر بے تکلف ہو گیا۔ اور اسی روز پہلی مرتبہ دو دو ہاتھ ہو گئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ جی۔ کرشنا بلا کا کھلاڑی ہے۔ صبح ابھی ابھی طالب کے ہاں چائے پیتے ہوئے بیڈمنٹن کا ذکر چھڑ گیا تو میں نے اس نو وارد ایجنٹ کے کھیل کی تعریف کر دی اور چونکہ طالب کو اپنے کھیل پر ناز تھا۔ اس نے جی۔ کرشنا کے ساتھ کھیلنے کی خواہش ظاہر کی میں

اسے سامنے آیا اور اتفاق سے جی۔کرشنا بھی آگیا۔ جی کرشنا کی گوری رنگت سنہرے خوب صورت بال اور سڈول تندرست ڈھانچہ دیکھ کر طالب بڑا متاثر ہوا۔ "اسے تو کسی فلم کمپنی میں ہیرو ہونا چاہیئے تھا" طالب نے مسکراتے ہوئے کہا "نہ جانے یہ دو اؤں کا ایجنٹ کیوں کر بن گیا؟" اور جب میں نے دونوں کو باہم متعارف کرایا تو میری زبان سے یہ سن کر کہ طالب ایک پولس افسر ہے، جی۔کرشنا چونک سا گیا۔ لیکن پھر جلد ہی اپنے آپ پر قابو پاکر ہنسی مذاق کرنے لگا۔ اور پھر دونوں کھیلنے لگے۔

ایک طرف طالب' سانولی رنگت کا طویل القامت نوجوان اور دوسری جانب گورا چٹا نازک اندام جی۔کرشنا' میرے کورٹ پر اپنے ہاتھوں میں ریکیٹ لئے، اچھل کود کر دونوں اپنے کھیل کے جوہر دکھا رہے تھے۔ تعجب کہ وہی جی کرشنا جو چند منٹوں ہی میں مجھے ہرا چکا تھا دیکھتے ہی دیکھتے طالب کے مقابلہ میں پسینے میں شرابور ہوگیا۔ اور اس کے کھیلنے کے انداز سے ہار مان لینے کے آثار صاف نمایاں تھے۔ حالانکہ طالب کو میں کالج کے دنوں سے گیم دیتا آیا ہوں اور بعض اوقات تو لو گیم بھی دے رہا ہوں۔ ایک ہی کالج سے ہم دونوں نے ساتھ بی۔اے پاس کیا تھا۔ بی اے کے بعد طالب پولس ٹریننگ سکول میں لفٹ رائٹ لفٹ رائٹ کرنے لگا تھا اور میں ایم۔اے میں داخل ہوگیا تھا۔ غرض بی۔اے میں پڑھنے کے زمانہ سے لیکر پولیس ٹریننگ کے دوران میں اور اب پولیس افسر بن جانے پر بھی طالب نے بیڈمنٹن میں مجھے کبھی شکست نہیں دی تھی۔ اس لئے میں حیران تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں اس نے جی۔کرشنا کے کیوں کر چھکے چھڑا دئے۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہ آسکی۔ میں ابھی اس پر غور ہی کر رہا تھا کہ میرے خانساماں نے آکر مجھے اطلاع دی کہ ایک نوجوان مجھ سے ملنا چاہتا ہے جسے وہ دیوان خانہ میں بٹھا آیا تھا۔ میں اس

کے ساتھ دیوان خانہ میں جا پہنچا۔ وہاں صوفہ پر بیٹھا ہوا ایک اجنبی نوجوان مجھے آتا دیکھ کر مودب کھڑا ہو گیا اور ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتا ہوا بولا "مجھے کاشی ناتھ جی نے یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجا ہے کہ آیا آپ آج سہ پہر میں اپنے دولت خانہ پر موجود رہیں گے یا نہیں۔ وہ پانچ بجے آکر آپ سے ملنا چاہتے ہیں"

"ان سے کہہ دیجئے میں گھر پر ہی رہوں گا۔ وہ شوق سے تشریف لا سکتے ہیں ــــ" میں نے اس نوجوان سے کہا اور وہ پھر نمسکار کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ شری کاشی ناتھ جی کی تشریف آوری کی وجہ مجھے معلوم تھی میں کچھ مضطرب سا ہو گیا اور ایک دم بیڈمنٹن کورٹ پر واپس جانے کے بجائے وہیں دیوان خانہ میں ایک صوفہ پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ کیا کیا جائے؟ در اصل میں کاشی ناتھ جی سے ملنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اور میرے اس اضطراب کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں نے ان سے کچھ روپیہ اُدھار لے رکھا تھا جو وصول کرنے وہ آ رہے تھے، اور میں ادا نہ کر سکنے کے سبب گھبرا رہا تھا ــــ کاش کہ میری گھبراہٹ کا کارن اتنا معمولی ہی ہوتا ــــ لیکن معاملہ بڑا سنجیدہ اور اہم تھا یہی سمجھ لیجئے کہ میرے کہنے پر جس تجارت پر انھوں نے زندگی کا سرمایہ لگا دیا تھا وہ صریحاً گھاٹے کی ثابت ہو رہی تھی۔ گویا جسے اصلی سونا کہہ کر میں نے ان کے پلّے باندھا تھا وہ ٹھنٹھنا تا پیتل ثابت ہو رہا تھا۔ میری معرفت جو بیوپار انہوں نے کیا تھا اس سے ان کو ٹوٹے کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا ــــ اور وہ بیوپار تھا آنند اور ششی کی شادی!

آنند ایک یتیم اور غریب لڑکا تھا۔ میری سفارش پر کاشی ناتھ جی نے اپنی ہونہار اکلوتی بیٹی ششی کی شادی اس سے کر دی تھی۔ ششی اور آنند بڑے

سکھ اور شانتی میں دن بتا رہے تھے۔ اور اس بندھن پر میں تو شاداں تھا ہی پر کاشی ناتھ جی بھی ایک نیک اور قابل داماد پا کر مطمئن ہو گئے تھے — لیکن پچھلے ہفتہ پورن ماشی کے دن جب وہ اپنی بیٹی کو میکے لے آئے تھے اور آنند اپنے مکان میں تنہا رہ گیا تھا تو ایک عجیب سانحہ پیش آ گیا — کسی دل جلے نے شاید ٹھیک ہی کہا ہے کہ امیدوں اور تمناؤں کے ایوان پر ہمیشہ حسرتوں کی بجلیاں کوندا کرتی ہیں۔ تمناؤں کا باغ سدا مرجھایا ہوا ہی رہتا ہے — واقعی۔ آنند سے ہماری کتنی امیدیں وابستہ تھیں لیکن ان سب پر یک لخت پانی پھر گیا۔ پورن ماشی کی رات آنند ایک جوان چھوکری کو کہیں سے گھیر لایا تھا اور پڑوسیوں کے بیان کے مطابق کسی نامعلوم سبب سے اس نے رات میں اس لڑکی کو قتل کر دیا تھا۔ صبح جب پولیس اسے گرفتار کرنے پہنچی تو وہ پچھلے دروازہ سے فرار ہو گیا تھا۔ اس دن سے پولیس قاتل کی تلاش میں وارنٹ گرفتاری لیے سرگرداں پھر رہی ہے اور آنند ہنوز روپوش ہے — شنتی بیچاری رات دن روتی رہتی ہے۔ اور کاشی ناتھ جی اپنی معصوم بیٹی کو رنج و غم میں مبتلا دیکھ نہیں سکتے۔ ان کے لئے جینا مشکل ہو گیا ہے وہ سوتے جاگتے مجھے گالیاں دیتے ہیں — اس واردات کے بعد دو تین دفعہ وہ مجھ سے مل چکے ہیں۔ وہ مجھ پر یہی الزام لگاتے ہیں کہ میں نے ان کی بیٹی کا جیون تباہ کر دیا۔ اسے کنوئیں میں جھونکنے کا ذمہ دار بنا۔ بھلا ان باتوں کا میں انہیں کیا جواب دے سکتا ہوں؟ اس وقت بھی صوفہ پر بیٹھا میں یہی سوچ رہا تھا کہ ریکٹ گھماتا ہوا طالب اندر آ گیا۔ "مسٹر پریم! کیا بات ہے۔ تم بڑے پریشان نظر آ رہے ہو؟" اس نے میز پر ریکٹ رکھتے ہوئے پوچھا اور میرے

پاس ہی بیٹھ گیا۔ طالب کو دیکھ کر امید کی ایک ہلکی سی کرن مجھے سامنے دکھائی دی، جیسے تاریکی میں جگنو چمک جائے۔ وہ ایک ذمہ دار پولیس افسر ہونے کی حیثیت سے بڑی حد تک ہمارے لئے کام کا آدمی ثابت ہو سکتا تھا۔ مجھے اپنی تغافل شعاری پر افسوس ہونے لگا کہ میں نے اس سے قبل ہی اس معاملہ میں طالب سے کیوں کوئی مدد حاصل نہیں کی۔ اب یہ اچھا موقع تھا — لیکن پھر مجھے خیال ہوا طالب گو میرا دوست سہی لیکن کمبخت ہے پولیس والا۔ یہ لوگ بڑے بدنام ہیں۔ بعض معاملات میں اپنے باپ کی بھی پروا نہیں کرتے — اور میں کچھ ناامید سا ہونے لگا۔ اس سے کچھ کہوں یا نہ کہوں؟ اور کہوں تو کس طرح کہوں؟ میں اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا کہ طالب کہنے لگا۔

"ادھر تم پریشان بیٹھے ہو اور ادھر اس تمھارے یار کی طبیعت خراب ہو گئی آخر تم دونوں کو ہوا کیا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا؟"

اس کی زبان سے یہ کلمات سن کر مجھے جی۔ کرشنا کا خیال آیا۔ "آہا! جی۔ کرشنا کہاں ہے؟" میں نے بیتابی سے پوچھا۔

"اس کی طبیعت یکایک ناساز ہو گئی۔ کھیل ادھورا ہی چھوڑ کر وہ گھر جانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی جیپ میں اسے گھر چھوڑ دینے کا ڈرائیور سے کہدیا اور اب یہاں آیا ہوں تو تم مرجھائے پھول سی صورت بنائے بیٹھے ہو بھئی بات کیا ہے آخر؟" اس نے حیرانی ظاہر کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"جبھی تو یار میں کہوں کہ یہ ماہر کھلاڑی تمہارے ساتھ ٹھیک طرح کھیل کیوں نہ سکا؟" میں نے اپنا شبہ دور کرتے ہوئے کہا اور اطمینان کی سانس لی۔ لیکن فی الحقیقت مجھے اطمینان کہاں نصیب ہوا تھا! ابھی تو ایک پہاڑ سی

مشکل پیش نظر تھی۔

"لیکن تم کیوں ادھموے بیٹھے ہو؟ تمہاری صورت پر فاختہ کیوں بول رہی ہے؟" طالب نے کہا، اور پھر شوخی سے مسکراتا ہوا بولا۔ "تمہاری اس وقت کی حالت دیکھ کر مجھے اس دلہن کا خیال آگیا جو ساس کی سختیوں سے گھبرا کر میکے بھاگ آئی تھی اور جب وہ سخت گیر ساس اسے واپس لے جانے کے لئے دوار پر آکھڑی ہوئی تھی، تو جو اس بے بس بہو کی حالت ہوئی تھی۔ بس اس وقت ویسی ہی تمہاری حالت دکھائی دے رہی ہے۔ کچھ تو بولو میرے یار۔ آخر ہوا کیا؟" اس کی اس ظرافت آمیز گفتگو سے میری کچھ ڈھارس بندھ گئی اور میں سوچتا ہوا بولا ——— "پچھلے دنوں نامپلی میں کسی دوشیزہ کا قتل ہوگیا تھا، کیا تم اس کی پوری تفصیل جانتے ہو؟" میری زبان سے ایک غیر متوقع سوال سن کر طالب مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورنے لگا۔ پھر اپنی نشست پر پہلو بدلتے ہوئے بولا: "لیکن اس سنسنی خیز قتل سے تمہارا کیا تعلق؟ میرا مطلب، تم کو اس سنگین واردات سے اتنی دلچسپی ......" اور اس نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا اور عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے حقیقت حال بیان کردی کہ کس طرح اپنے ایک شاگرد آنند کی میں نے کاشی ناتھ جی سے سفارش کردی تھی اور اس قتل کی واردات کے بعد آنند کے روپوش ہو جانے پر کس طرح کاشی ناتھ جی اپنی بیٹی کی قسمت پھوڑنے کا سارا الزام میرے سر تھوپ رہے ہیں۔ غرض یہ بیاہ کرا کے میں نے ایک عذاب خرید لیا ہے۔" یہ سن کر طالب کہنے لگا۔ "یہ تو میں جانتا ہوں کہ آنند کا تعلق تمہارے کالج سے رہا تھا۔ کالج میں اچھے برے لڑکے ہوا ہی کرتے ہیں۔ پولیس کے خفیہ ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنند ایک خطرناک ترین انسان ہے، اور مجھے یہ جان کر افسوس ہوا کہ تم ایسے

بداخلاق نوجوان کی سفارش کرتے ہوئے ذرا بھی نہ جھجکے شاید تم نہیں جانتے کہ اس کیس کی تفتیش میں ہی کر رہا ہوں۔ اس قتل کا ذکر چھیڑنے سے کہیں تمہارا مطلب یہ تو نہیں کہ کوئی سفارش مجھ سے کر کے تم دوستی کا ناجائز فائدہ اٹھا سکو۔۔۔؟" یہ سن کر میں طالب کا مونہہ ہی تکتا رہ گیا۔ لیکن میرے چہرے پر شائد پژمردگی چھائی دیکھ کر اس نے اپنا انداز تکلم فوراً ہی بدل لیا۔ اور شرارت سے مسکراتا ہوا بولا "پریم! جب آنند کا شمار تمہارے ان شاگردوں میں ہوتا ہے جن کی کہ تم سفارش کر سکتے ہو۔ تو میرا خیال ہے کہ تم اس کو بخوبی جانتے ہوگے۔ میرا مطلب ہے اس کا چال چلن جیسا بھی طالب علمی کے زمانہ میں رہا ہوگا تم سے پوشیدہ نہیں ہوگا۔۔۔؟" میں کچھ بول نہ سکا۔ صرف اقرار میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ "تو پھر تم لتیکا کو بھی جانتے ہوگے؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا اور میری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"ہاں! میں لتیکا سے بھی واقف ہوں" میں نے جواب دیا۔ لیکن اس کے اس بے محل سوال پر مجھے تعجب ہونے لگا اور میں نے پوچھا "لیکن مسٹر طالب! اس قتل کی واردات سے لتیکا کا کیا تعلق؟" وہ بے باکی سے مسکرانے لگا۔ اور جیب سے سگریٹ کیس نکال کر اداکارانہ انداز میں ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا "آنند کے اُستاد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے تم کو اس کیس کے پورے حالات میں سناؤں گا۔ لیکن پہلے ذرا تمہاری زبانی تو سُن لوں کہ لتیکا اور آنند کے باہمی تعلقات کیسے تھے؟"

میں سوچنے لگا کہ واقعہ کا آغاز کہاں سے کروں۔ مجھے کسی خیال میں کھویا ہوا دیکھ کر طالب زیر لب مسکراتا ہوا بولا "گھبراؤ مت۔ گواہ کی حیثیت سے میں تمہیں عدالت میں نہیں بلاؤں گا۔" اور پھر سگریٹ کے کش پر کش لینے لگا۔ جو کچھ میں لتیکا اور

آنند کے بارے میں جانتا تھا وہ میں نے اختصار میں طالب کو سنا دیا۔ جن دنوں آنند بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ لتیکا نامی ایک حسین لڑکی سے عشق کرنے لگا تھا۔ اس عشق کا آغاز کالج میں کھیلے جانے والے ڈراموں سے ہوا تھا۔ اکثر ڈراموں میں آنند ہیرو اور لتیکا ہیروئن کے پارٹ ادا کر چکے تھے۔ اور چونکہ کچھ ڈرامے میرے لکھے ہوئے اسٹیج کئے گئے تھے۔ اس لئے ان کی ری ہرسل کے دوران میں مجھے آنند اور لتیکا کو بڑے قریب سے دیکھنے کے مواقع ملتے رہے۔ ڈراموں کی ری ہرسل کرتے ہوئے آنند صحیح معنوں میں لتیکا سے پریم کرنے لگا تھا۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیوانہ وار چاہنے لگے تھے لیکن بدنصیب آنند لتیکا کو حاصل نہ کر سکا۔ امتحان سے قبل ہی لتیکا کی شادی ہو گئی اور آنند دل مسوس کر رہ گیا۔ ان ہی دنوں اس نے اپنی ناکام محبت کے راز سے مجھے آگاہ کیا۔ میں اپنے ساتھ اسے گھر لے آیا تھا اور بڑی دیر تک اس سے فلسفۂ محبت پر تبادلۂ خیالات کرتا رہا تھا۔ میں نے اسے ذہن نشین کرا دیا تھا کہ اب بھی وہ لتیکا کو چاہ سکتا ہے۔ محبت ایک پاک جذبہ کا نام ہے۔ اگر وہ لتیکا کے جسم کو حاصل نہیں کر سکا تو اسے اس محبت کو ناکام محبت کے نام سے نہیں گردانا چاہیئے۔ وہی محبت سچی محبت کہلا سکتی ہے جس میں اپنی غرض اور ہوس کا شائبہ تک نہ ہو۔ لتیکا کے کسی اور کی بیوی بن جانے کے باوجود اگر محبت کا جذبہ اس کے دل میں قائم ہے تو کوئی پروا نہیں وہ اس حالت میں بھی اسے چاہ سکتا ہے' ایک بہن کی طرح۔ ماں کے زاویہ نگاہ سے بیٹی کے طور پر!!! اور میری اس تعلیم نے اس سمجھ دار نوجوان کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ لتیکا کا بیاہ ہو جانے پر آنند نے نہ تو تن کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور نہ ہی سر میں خاک ڈال کر وہ جانب صحرا بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ بلکہ وہ بڑی محنت سے تعلیم

حاصل کرتا رہا اور بی اے میں اس نے شاندار کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد سرکاری ملازمت مل جانے پر کاشی ناتھ جی کے خاندان سے اس کا تعارف ہوا اور وہ ششی کی طرف مائل ہو گیا۔ میں نے صرف سفارش کی۔ کاشی جی نے اپنی کسوٹی پر اسے خوب پرکھ لینے کے بعد ششی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ آنند شاداں و فرحاں تھا۔ ششی کے بھی مارے خوشی کے زمین پر پاؤں نہ پڑتے تھے۔ جہاں تک میرا خیال ہے لتیکا دوبارہ اس کی زندگی میں نہیں داخل ہوئی —— ' جیسے ہی میں نے اپنا بیان ختم کیا۔ طالب ایک بلند قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا اور میں تصویر حیرت بنا اس کی صورت تکنے لگا۔ لیکن طالب نے میری حیرت کم کرنے کے بجائے اس میں غضب ناک اضافہ کر دیا بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے وہ بولا۔ 'اجی جہاتے جی! پونم کی رات نا بیلی والے مکان میں آنند نے جس لڑکی کو قتل کیا وہ لتیکا ہی تھی!' اس کے اس انکشاف پر میرا مونہہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔ اس بات پر ایک دم یقین کر لینا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ لیکن ایسے سنجیدہ معاملہ میں طالب سے بھی مذاق کی توقع نہ تھی۔ وہ آگے بولا۔ 'پریم بابو! اپنے تعجب کو یہیں تک محدود نہ کیجئے لاش کا ڈاکٹری معائنہ کرانے پر یہ بھید معلوم ہوا تھا کہ قتل سے قبل لتیکا کی عصمت دری بھی کی جا چکی تھی ——' یہ مزید حیرت انگیز انکشاف سُن کر میں ششدر رہ گیا۔ مجھے آج تک اس بات کا گھمنڈ تھا کہ میں اپنے شاگردوں میں سے ہر ایک سے اس قدر واقف ہوں جتنا کہ وہ اپنی ذات سے واقف ہے۔ میرا یہ گھمنڈ اب خاک میں ملتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ بھلا آنند سے اس ہولناک اقدام کی میں کیسے توقع کر سکتا تھا کہ بیوی کے میکے جاتے ہی تنہائی کی پہلی ہی رات لتیکا کو جسے وہ بہن مان چکا تھا اپنے ہاں لایا۔ اس کا گوہر عصمت لوٹ لینے

کے بعد اس نے اُسے بے دردی سے قتل کر دیا۔ مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ میری عقل مطلق کام نہیں کر رہی تھی۔

طالب ادھ جلے سگریٹ کو تپائی میں رکھے ہوئے راکھ دان میں بیدلی سے مروڑ رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا وہ میرا کلیجہ ہی مسل رہا ہے۔ وہ پھر میری طرف پلٹ کر کہنے لگا۔" واردات کی پوری تفصیل سن کر تم ایک زندہ جاوید افسانہ لکھ سکو گے پریم! لیکن میری سنو تو اس وقت استاد کے دل کو سینہ سے نکال کر علیحدہ رکھ دو۔ اس رُوداد کو ایک افسانہ نگار بن کر سنو۔" اس نے دوسرا سگریٹ جلا لیا اور پھر ایک طویل کش لے کر بولا۔" تمہارے سُنائے ہوئے حالات یہاں تک تو بالکل صحیح ہیں کہ آنند ڈرامنوں کی ریہرسل کرتا ہوا لتیکا کی زلفوں کا اسیر بن گیا تھا اور اس کے عشق کا دم بھرنے کی حماقت کرنے لگا تھا۔ لیکن سی آئی ڈی نے گہری تفتیش کے بعد جو معلومات فراہم کی ہیں۔ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لتیکا آنند کو کسی خاطر میں نہیں لاتی تھی —— لیکن بد نصیب تھی۔ بیچاری! ماں باپ بچپن ہی میں گذر چکے تھے۔ ایک چچا کے رحم و کرم پر پڑی ہوئی تھی اس کا وہ چچا حد درجہ شرابی اور فضول خرچ تھا اور شمس آباد کے جاگیردار بھجنگ راؤ سے وہ اس قدر قرض لے چکا تھا کہ ساری جائداد فروخت کر دینے پر بھی اس سے سبکدوش ہونا دوبھر تھا پوڑھے بھجنگ راؤ نے لتیکا کے بدلے پورا قرض معاف کر دینے کی پیش کش کی۔ شرابی چچا راضی ہو گیا۔ اور غریب لتیکا امتحان سے قبل ہی بوڑھے کے حرم میں داخل کر دی گئی —— لیکن یہ بے جوڑ شادی بوڑھے جاگیردار کو راس نہ آئی۔ اور دو تین ماہ کے اندر ہی اندر اس نے تخت کٹا لیا جب لتیکا کا سہاگ اجڑ جانے کی بھنک آپ کے لائق شاگرد کے کانوں میں پڑی تو وہ

اڑا ہوا شمس آباد گیا۔ اور لتیکا کے قدموں پر سربسجود ہو گیا۔ اور لگا تجدید عشق کی کوشش کرنے۔ لیکن لتیکا نے اسے دھتکار دیا۔ ہمسایوں کی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ بیوی کے میکے چلے جانے کے بعد، پونم کی رات آنند لتیکا کو زبردستی اپنے ہاں لایا۔ اور اس کی عصمت لوٹنی چاہی۔ ممکن ہے آدھی رات تک وہ بے بس ابلا اس ظالم کی دست درازیوں کا مقابلہ کرتی رہی ہو۔ حتیٰ کہ اس موذی نے اسے ہلاک کر دیا۔ دم توڑتے ہوئے اس نے چلّا چلّا کر ہمسایوں کو مدد کے لئے پکارا بھی تھا۔ اس کی دل گداز چیخ سن کر جو لوگ اندر پہنچے انہوں نے اپنی آنکھوں سے قتل کا قیامت خیز نظارہ دیکھا۔ لیکن پولیس کے پہنچتے پہنچتے آنند پچھلے دروازہ سے رفو چکر ہو گیا۔ غرض یہ ہے المیہ کہانی۔ ایک تعلیم یافتہ لڑکی کے دوسرے تعلیم یافتہ نوجوان کی شہوت کی بھینٹ چڑھ جانے کی!"

اس سنسنی خیز روداد کو سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دماغ میں سوئیاں چبھنے لگیں لیکن اس پولیس کے گراں ڈیل کی زبان ابھی تھکی نہیں تھی۔ وہ اپنے دوسرے سگریٹ کو بھی ایش ٹرے میں مروڑتے ہوئے طنزیہ لہجہ میں بولا۔ "پریم بابو! اپنے شاگرد کی شان میں مقطع بھی سنتے جائیے۔" مجھ میں مزید کچھ سننے کی تاب نہیں رہی تھی۔ لیکن میں انکار کرنے کے بھی موڈ میں نہیں تھا۔ مسکین بنا بیٹھا سنتا رہا۔ طالب کہنے لگا شمس آباد کے بوڑھے جاگیردار کا اچانک جو انتقال ہوا تھا اس سلسلہ میں شمس آباد والوں کو بھنگ راؤ کے ایک بے پالک لڑکے گوپال پر شبہ تھا کہ اس نے وراثت پانے کے لئے بوڑھے کو ختم کر دیا ہو۔ اور شمس آباد کی پولیس اس مفرور لڑکے کی تلاش میں تھی۔ لیکن پرسوں سی۔آئی۔ڈی کے نام ایک گمنام مراسلہ وصول ہوا جس میں اس راز پر سے نقاب اٹھایا گیا

ہے کہ بھجنگ راؤ کا نہ تو ہارٹ فیل ہوا تھا اور نہ مفرور گوپال نے اسے قتل کیا تھا، بلکہ اس بوڑھے کو اس کی جوان بیوی کے نامراد عاشق آنند نے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا تھا میں نے شروع ہی میں آپ سے کہا تھا کہ آنند ایک خطرناک ترین انسان ہے۔ مجھے تو یقین نہیں کہ معصوم شبنمی کا سہاگ قائم رہ سکے۔ اگر آنند نے عالم روپوشی میں ابھی تک خودکشی نہیں کی اور زندہ ہے تو اسے پھانسی کے پھندے سے اب کوئی نہیں بچا سکتا۔۔۔" اور طالب اپنی کلائی پر کی گھڑی دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ "یار! پونے بارہ بج چکے ہیں۔۔۔ اب ہم چل دئیے۔۔۔"

ان پراسرار باتوں کو سن کر مجھے اس قدر ذہنی تکان اور کوفت محسوس ہو رہی تھی کہ میں بمشکل اٹھ کر اس کے ساتھ برآمدہ تک جا سکا۔ اپنی جیپ کی طرف جاتے ہوئے وہ پھر مڑ آیا۔ اور گھریلو انداز میں کہنے لگا۔۔۔ "بھئی خوب یاد آیا۔ پچھلے دنوں تم نے جو اچار دیا تھا وہ بڑا مزیدار تھا یار میرے! اگر اب بھی موجود ہو تو تھوڑا دلاؤ۔۔۔" کھٹائی کھانے میں طالب مجھ سے بازی لے گیا۔ گاؤں سے میرے ہاں لیمو اور آم کا اچار آیا ہوا تھا۔ یہ اس میں سے کچھ لیکر گیا تھا۔ میرے ہاں اب بھی کافی مقدار میں موجود تھا میں نے خانساماں کو آواز دے کر بلایا اور ایک پیالے میں اچار لانے کو کہا جیسے اچار گاؤں سے آیا تھا میرا موجودہ خانساماں بھی ٹھیٹ گاؤں سے چلا آرہا تھا۔ کمبخت ذرا گاؤدی تھی۔ پیالے میں اچار ڈال کر لایا اور کھلا ہوا ہی طالب کے حوالے کرنے لگا۔ اتنی تمیز نہیں کہ کاغذ ہی لپیٹ کر دے دیتا۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور میز پر پڑا ہوا ایک کاغذ لے کر اس میں اس پیالے کو لپیٹ دیا اور طالب کو پکڑا دیا۔ اور وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے دوبارہ جلدی آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

طالب کے جاتے ہی میں نے اپنے آپ کو صوفے پر گرا دیا۔ کمبخت پولیس والا!
میری مشکل آسان کرنے کے بجائے اور بھی پیچیدہ کر کے چلا گیا تھا۔ گتھی سلجھانے
کے بجائے اس نے اور زیادہ الجھن میں ڈال دیا تھا۔ مجھے بالکل از خود رفتہ بنا کر
چلا گیا تھا ـــــ مجھے یاد آیا سہ پہر میں کاشی ناتھ جی آنے والے ہیں۔ میں انہیں
کیا جواب دوں گا؟ نیم دراز حالت میں بیٹے بیٹے مجھ پر جیسے غنودگی طاری ہونے
لگی تھی۔ میں آنکھیں بند کئے ویسے ہی پڑا کچھ دیر سوچتا رہا۔ آنکھیں بند کرتے ہی
کاشی ناتھ جی کی صورت مجھے نظر آئی وہ گڑگڑا کر کہہ رہے تھے "ششی کو اپنی ہی بیٹی
سمجھو۔ اس کا سہاگ مت چھینو۔ اس کا گھر آباد رہنے دو ـــــ" اور آنند بھی مجھے
دکھائی دیا جس کے سر پر پھانسی کا پھندا لہرا رہا تھا اور وہ سرپٹ دوڑا چلا جا رہا
تھا۔ لیکن پھندا ابھی جیسے ہوا میں لٹکا اس کا تعاقب کر رہا تھا ـــــ ششی کو بھی میں
نے دیکھا۔ وہ ایک تناور سوکھے پیڑ کے نیچے سر کے بال پریشان کئے ایک بے ڈول
پتھر پر بیٹھی، ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی ـــــ اور نامور کھلاڑی جی۔ کرشنا
بھی نظر پڑا۔ وہ ہاتھ میں ریکٹ لئے کھیل رہا تھا لیکن تعجب کہ شٹل کاک کے بجائے
وہ کوئی عجیب سا گیند ہوا میں اچھال رہا تھا۔ اندیشہ تھا کہ یہ غیر موزوں گیند اس
کے ریکٹ کی جالی کے تار نہ توڑ ڈالے ـــــ اور کمبخت طالب بھی ظلم و استبداد
کا پتلا بنا دکھائی پڑا۔ کہیں سے وہ ایک کرکٹ بال اٹھا کر لے آیا اور ایسا تاک
کر مارا کہ بیچارہ جی۔ کرشنا چکرا کر گر پڑا۔ لیکن حیرت اس پر ہوئی کہ تماشہ دیکھنے
والے خوشی سے تالیاں بجانے لگے ـــــ اسی طرح میں بڑی دیر تک صوفہ پر
لیٹا ہوا عجیب و غریب خواب دیکھتا رہا۔ میرا خیال ہے کوئی پون گھنٹہ سے زیادہ
عرصہ گذر گیا ہو گا۔ خانساماں کھانا لگانے کے متعلق پوچھنے آیا تھا۔ میں اس

سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ باہر کسی کار کے ایک جھٹکے کے ساتھ رُک جانے کی آواز سن کر میں چونک سا گیا اور اسی دم طالب سرکاری یونیفارم پہنے ہوئے دندناتا ہوا اندر آگیا میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ ایک خوفناک انسان نظر آرہا تھا۔ میں اس عجیب حالت میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا "میں آپ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں" میرے خانساماں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ اس کا لہجہ بھی قدرے کرخت تھا مجھے ہمیشہ "تم" سے مخاطب کرنے والا طالب آج پہلی مرتبہ "آپ" سے مخاطب ہو رہا تھا۔ میں نے خانساماں کو چلے جانے کا اشارہ کیا اور استعجاب سے طالب کو دیکھنے لگا۔ اسے بیٹھنے تک کا کہنے کی مجھے سدھ نہ رہی تھی۔ مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ ترش روئی سے بولا "مسٹر پریم! میں اس وقت آپ کے پاس آپ کے بے تکلف دوست طالب کی حیثیت سے نہیں آیا ہوں بلکہ خفیہ پولیس کے صدر امین کے طور پر آپ کا بیان لینے حاضر ہوا ہوں۔"

"فرمائیے میں حاضر ہوں ——" میں نے بھی اتنی ہی کرختگی سے کہا لیکن اس کی ہیبت دیکھ کر میری پریشانی دوچند ہو چکی تھی۔

"آپ پر شبہ کیا گیا ہے کہ آپ ایک راز سے واقف ہیں اور پولیس کو گمنام مراسلہ لکھ کر غلط رہنمائی کرنے کا باعث بن رہے ہیں۔ فرمائیے۔ اس کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟" اس نے حاکمانہ لہجہ میں پوچھا۔ اور اپنی جیب میں کچھ ٹٹولنے لگا۔ اس کے اس انوکھے برتاؤ پر مجھے جھنجھلاہٹ سی ہونے لگی تھی۔ میں نے تڑپ کر کہا "میں سمجھا نہیں صاف صاف بیان کیجئے تاکہ کچھ جواب دے سکوں ——"

"شمس آباد کے جاگیردار کا قاتل کون ہے یہ آپ کو یقیناً معلوم ہوگا۔ اور آپ نے اپنے کسی مفاد کے خاطر گمنام مراسلہ سی۔ آئی۔ ڈی کو لکھ کر بھٹکانے کا ارتکاب کیا ہے" اس نے کہا اور تجسس بھری نگاہوں سے میرے چہرے کو دیکھنے لگا۔ مجھے شبہ

ہونے لگا۔ یا تو یہ کمبخت زیادہ چڑھا آیا ہے یا اس کے دماغ کا کوئی کل پُرزہ ڈھیلا ہو چکا ہے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ اس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال لیا اور مجھے دور ہی سے بتاتے ہوئے پوچھنے لگا۔" ملاحظہ فرمائیے کیا یہ آپ کا ہینڈ رائٹنگ نہیں؟ کیا اب بھی آپ انکار کر سکتے ہیں؟"

ساری طاقت آنکھوں میں اکھٹی کر کے میں نے غور سے دیکھا وہ کاغذ شکن آلود تھا اور اس پر سبز روشنائی میں لکھا ہوا تھا ـــــ" مسٹر پریم۔ ایم۔ اے ــــــ پرنسپل ٹرنیٹی کالج۔ حیدر آباد (دکن) ــــــ" اور پھر نیچے کوئی چھ سات مرتبہ حیدر آباد۔ دکن گھسیٹا ہوا تھا۔

میری ہنسی نکل گئی۔ سارا معاملہ میری سمجھ میں آ چکا تھا یہ کاغذ وہی تھا جو میں نے تھوڑی دیر پہلے اچار کے پیالے پر لپیٹ کر طالب کو دیا تھا۔" میں مذاق نہیں کر رہا ہوں سنجیدگی سے جواب دیجئے۔" اسی رعب دار آواز میں طالب کہنے لگا۔" اس وقت میرا آپ کے یہاں آنا بھنگ راؤ کے قتل کی تفتیش کی ایک کڑی ہے۔ سی۔ آئی ڈی کو ایک گمنام مراسلہ اسی ہینڈ رائٹنگ اور اسی روشنائی سے مرقوم وصول ہوا! کیا آپ اس سے منکر ہو سکتے ہیں کہ یہ کاغذ آپ ہی نے مجھے دیا تھا؟ پہچانئے اپنا خط اور مجھے تسلی بخش جواب دیجئے ـــــ" جواب دینے کے بجائے میں اور بھی ہنسنے لگا۔ اسے زیادہ آگ بگولہ کرنا مجھے گوارہ نہ ہوا۔ زیر لب مسکراتے ہوئے میں نے کہا " اگر تم انسپکٹری کو دھونس جمانے کی خاطر پوچھ رہے ہو تو میری طرف سے بھاڑ میں جائے۔ ہاں! اگر میرے عزیز دوست طالب کے طور پر کچھ دریافت کرو گے تو بندہ حاضر ہے ـــــ" طالب کے چہرے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہو چکی تھی۔ لیکن وہ اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔" معاملہ سنجیدگی کا ہے پریم! میں تحقیقات کرنے آیا ہوں نداق کرنے نہیں آیا۔ بلکہ سچ مچ تمہاری مدد کا طالب ہوں۔ کیا یہ کاغذ

تم نے مجھے نہیں دیا تھا؟"

"اب آئیے سیدھی راہ پر" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔"ہمیں کچھ شک نہیں کہ یہ کاغذ میں نے ہی تم کو دیا تھا۔ اور اس لئے دیا تھا کہ تمہارے اس اچار میں کبھی نہ پڑے دھول نہ گرنے پائے۔ لیکن تم نے وردی کیا پہن لی۔ میری ہی آنکھوں میں دھول جھونکنے لگے۔ حالانکہ سکول اور کالج کے زمانہ سے میرا خط دیکھتے آرہے ہو۔ اور اب سراغ رسانی کے زعم میں اس ہینڈ رائٹنگ کو میرے سر منڈھ رہے ہو؟" وہ میرے پاس صوفہ پہ بیٹھ گیا اور التجا آمیز لہجہ میں کہنے لگا"میں نے کھانا کھاتے وقت جب اچار کے پیالے پر بیٹھا ہوا یہ کاغذ نکالا تو اس ہینڈ رائٹنگ پر میری نگاہ جم کر رہ گئی۔ اور مجھے کچھ شبہ ہوا کہ یہ خط اس خط سے مطابقت کرتا ہے جس خط میں گمنام چٹھی خفیہ کے دفتر میں آئی تھی جو میری زیر تفتیش ہے۔ اور یقین جانو میں کھانا ادھورا ہی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور وردی پہن کر دفتر جا پہنچا اور الماری سے کیس کی متعلقہ فائل نکال کر میں نے دونوں خطوں کا مقابلہ کیا۔ تم جانتے ہو میں ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ ہوں۔ پوری جانچ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جس شخص نے اس کاغذ پر تمہارے نام اور پتہ کے الفاظ لکھے ہیں وہی شخص وہ گمنام مراسلہ سی۔ آئی۔ ڈی کو بھجوانے کا مرتکب ہوا ہے جو بھجنگ راؤ کے پُر اسرار قتل سے متعلق ہے۔ میرے یار! اب بتاؤ یہ کس کا خط ہے ؟" اب معاملہ مجھ پر روشن ہو چکا تھا۔ میں نے طالب سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ اور اسے صحیح امر سے واقف کر دیا۔" پرسوں بیڈمنٹن کورٹ سے لوٹ کر میں اپنا ایک افسانہ جی۔ کرشنا کو سنا رہا تھا۔ اس وقت جی کرشنا میری میز کے پاس بیٹھا اپنے سبز روشنائی والے پن سے اس کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔ اور جب وہ اٹھ کر چلا گیا تھا تو میں نے میز پر پڑے ہوئے اس کاغذ پر ایک طائرانہ نظر

ڈالی تھی جس پر میرا نام اور پتہ، اور قلم کو پڑتا لنے کے لئے اس نے کئی مرتبہ حیدرآباد دکن لکھ چھوڑا تھا۔ اچار کے پیالے پر لپیٹتے وقت میرا خیال تھا کہ یہ کاغذ بالکل غیرضروری ہے ـــــ" یہ سن کر طالب اس کاغذ کو میری نظروں کے سامنے نچاتا ہوا بولا۔ "تم نے اس کاغذ کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن اب یہی وہ انگشت کا پرچہ اس ہینڈرائٹنگ کے باعث نہایت اہم گردانا جائے گا۔ یہ سراغرسانی کی زنجیر کی ایک کڑی ہے یقینی طور پر جی۔ کرشنا بھنگ راؤ کے قاتل کو جانتا ہوگا۔ اور جب اس نے ظاہر طور پر پولیس کی رہنمائی کرنیکے بجائے یہ گمنام مراسلہ بھیجا ہے تو ضرور دال میں کچھ کالا ہے ـــــ"

"میں تو تمہیں موٹی عقل والا سمجھتا تھا، لیکن یار تم تو کام کے آدمی نکلے۔ بتاؤ آگے کیا کرنا چاہیئے ـــــ" میں نے پوچھا۔

"میرے ڈرائیور کو یہ معلوم ہوگا کہ جی۔ کرشنا کہاں رہتا ہے۔ کیونکہ وہ کچھ دیر پہلے اسے جیپ میں لے جاکر اس کے گھر چھوڑ آیا ہے۔" طالب نے کہا اور جیسے پھر کسی خیال میں غرق ہوگیا اور ایک چٹکی بجاتا ہوا بولا۔ "اس کا نام جی۔ کرشنا ہے۔ مجھے تو اور کچھ شک ہونے لگا ہے ـــــ"

"کیا؟" میں نے بیقراری سے پوچھا۔

"کہیں اس کے نام کے جی میں "گوپال" تو مضمر نہیں ـــــ؟"

"گوپال! کیا مطلب؟" میں نے سوچتے ہوئے دریافت کیا۔

"بھنگ راؤ کا پروردہ لڑکا۔ اس کا نام بھی تو گوپال تھا۔ ممکن ہے اس جی کرشنا کا نام گوپال کرشنا ہو....." طالب نے وضاحت کی۔ یہ سن کر میرے من میں بھی خوشی کی ترنگ اٹھنے لگی۔ "اب ہمیں مطلق وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے"

طالب صوفے سے اٹھتا ہوا بولا۔ "مجھے اس شخص پر اسی وقت کچھ شبہ سا ہوا تھا جب تم نے اس سے میرا تعارف کرانے کے دوران میں میرے نام کے ساتھ پولیس افسر کا دُم چھلا استعمال کیا تھا تو وہ جیسے لرز کر رہ گیا تھا۔ اور پھر ایک ماہر کھلاڑی ہونے کے باوجود کسی نامعلوم خوف کی وجہ سے میرے ساتھ وہ ذرا بھی جم کر نہ کھیل سکا تھا۔ اسی کو کہتے ہیں چور کی داڑھی میں تنکا۔ ہمیں اسے ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہیئے۔ تم بھی چلو میرے ساتھ۔" اور میرا ہاتھ پکڑ کر طالب مجھے قریب قریب گھسیٹتا ہوا لے جانے لگا۔

جب ہم جیپ میں سوار ہو رہے تھے تو پوسٹ مین جو میرے مکان میں داخل ہونا چاہتا تھا مجھے دیکھ کر ایک موٹا سا لفافہ لئے جیپ ہی کے پاس آگیا۔ لیکن اب میرا دماغ اس قدر تھک گیا تھا اور حیرت و استعجاب کی انتہا ہو چکی تھی کہ میں نے اس سے لفافے کر اسی طرح جیب میں ڈال لیا اور ہم دونوں جیپ میں جا بیٹھے۔ "گاڑی دہیں لے چلو" طالب ڈرائیور سے کہنے لگا "جہاں تم نے صبح اس گورے صاحب کو چھوڑا تھا۔" اور جیپ ہوا میں فرّاٹے بھرتی ہوئی ناپیلی کے عزیزیہ ہوٹل کے سامنے جا ٹھیری۔

"وہ صاحب یہیں اترے تھے۔" جیپ روک کر ڈرائیور نے کہا۔

"پریم تم یہیں بیٹھے باہر نگاہ رکھو۔" گاڑی سے اترتے ہوئے طالب بولا۔ "میں اندر جا کر خبر لیتا ہوں اس معزز مہمان کی۔" ہوٹل کے بورڈ پر ایک نگاہ ڈال کر آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا طالب اندر داخل ہو گیا۔ ڈرائیور بھی سامنے والی پان کی دوکان پر جا کھڑا ہوا۔ گھر سے نکلتے وقت پوسٹ مین کے دئے ہوئے لفافہ کا مجھے خیال آگیا۔ اور میں نے اسے جیب سے نکال لیا پتہ کی طرز تحریر پر غور کرنے سے خط جانا پہچانا معلوم ہوا۔ ڈاکخانہ کی مہر سکندر آباد کی لگی ہوئی تھی۔ لفافہ چاک کرنے پر ایک لمبا چوڑا خط میرے

ہاتھ میں تھا۔ خط کا آغاز دیکھتے ہی میں بے چینی سے جلدی جلدی پڑھنے لگا۔ اتنی بڑی حیران کن حقیقت، اس قدر پر اسرار لیکن مسرت انگیز بات اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں پڑھی تھی۔ آج صورت کسی بھلے مانس کی دیکھ کر اٹھا تھا جو صبح سے ہی ایسے سنسنی خیز اور ہوش ربا واقعات سنتا آرہا تھا۔ جو میرے لئے انتہائی ذہنی اور روحانی کرب و تشنج کا سبب بن گئے تھے۔ مسلسل چوٹوں کی ضربوں سے دماغ جیسے چھلنی ہو گیا تھا اور دل پر کچھ ایسی نقلیں لگی تھی کہ اب تڑپنے کی بھی تاب نہ رہی تھی —— لیکن اس خط کے مضمون نے پانسہ ہی پلٹ دیا۔ جیسے کسی جواری کا متواتر ہارنے کے بعد اچانک ایک کثیر رقم جیت لینے پر جو حال ہوتا ہے وہی اس وقت میری کیفیت تھی، دماغ میں نور کی ایک شعاع چمکی اور دل باغ باغ ہو گیا۔ میں طالب کو داد دینے لگا کہ اس نے سراغ رسانی کی زنجیر کی بالکل ٹھیک کڑی کا پتہ چلا لیا تھا۔ اب میں اسے یہ خط دکھانے کے لئے بے قرار ہو گیا۔ لیکن اس نے اتنی دیر کیوں کردی لوٹنے میں؟ مجھے فکر ہونے لگی۔ میں یہ طول طویل خط پورا پڑھ چکا ہوں اور وہ اب تک نہیں لوٹا! یہی سوچتے ہوئے میں نے ہوٹل کی طرف دیکھا۔ ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوئے لوگ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ بعض سہمے ہوئے نظر آرہے تھے کسی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور کوئی بوکھلایا ہوا تھا۔ جیسے کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ میری تشویش بڑھ گئی اور میں جیپ سے اتر کر ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ میرے والے کمرے کے دروازہ پر بہت بھیڑ تھی۔ لوگ ایک دوسرے کے سر پر سوار ہو کر اندر جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ باوجود دراز قد ہونے کے میں کوشش بسیار کرنے پر بھی اندر کا منظر دیکھ نہ سکا۔ باہر کھڑے ہوئے لوگوں کی چہ میگوئیاں سننے لگا جس سے مجھے پتہ چلا کہ ہوٹل کے منیجر کو ہمراہ لے کر طالب جی کرشنا

کے کمرے میں جا دھمکا اور چھوٹتے ہی بولا کہ وہ بھجنگ راؤ کے قاتل کی تلاش میں آیا ہے۔ طالب کو یونیفارم میں دیکھکر جی کرشنا سٹپٹا تو گیا ہی تھا اس کا عجیب سوال سن کر وہ ایک دم زور زور سے چلا کر کہنے لگا "میں قاتل نہیں ہوں، میں قاتل نہیں ہوں مجھے گرفتار نہ کیجئے" اور اس نے چشم زدن میں ایک بڑا سا چاقو بستر کے سرہانے سے نکال کر خودکشی کرنے کی کوشش کی ہوٹل کے مینجر اور طالب نے عجلت سے کام لیا اور اسے بچا لیا گیا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو اس تیز چاقو سے بری طرح زخمی کر چکا تھا۔ نہ میں باہر جیپ میں بیٹھا اس طویل اور دلچسپ خط کو پڑھنے میں کچھ ایسا مستغرق ہو گیا تھا کہ طالب کی ہدایت پر ہوٹل کے مینجر نے کس وقت ٹیکسی دوڑا کر ڈاکٹر اور مزید پولیس افسران کو بلا لیا تھا کہ مجھے پتہ تک نہ لگ سکا اور اب اندر پہنچنے پر کئی پولیس کے جوان اور انبوہ کثیر دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ طالب کا چھاپہ کارگر ثابت ہوا ہے۔ ضروری پنچ نامہ کے بعد طالب جب کمرے سے باہر آیا تو اس کے چہرے پر کامیابی اور فتح مندی کی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میں نے اسے علیحدہ لے جا کر اس طویل خط کا راز بتلایا۔ طالب کی باچھیں کھل گئیں۔ جی کرشنا کو ڈاکٹر اور دیگر پولیس افسران کی تحویل میں دے کر وہ اسی وقت میرے ہمراہ سکندرآباد چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ باہر آکر دونوں پھر جیپ میں سوار ہو گئے اور میں نے وہ خط طالب کو دے دیا۔ جیپ ہوا سے باتیں کرنے لگی اور طالب اس خط میں غرق ہو گیا:۔

"مکان نمبر......

گھانس منڈی۔ سکندرآباد۔ دکن

مورخہ ۱۸ ستمبر

میرے بزرگ پریم بابو!

میں دنیا کی نظروں میں قاتل ہوں۔ اور پولیس وارنٹ لئے میری تلاش میں پھر رہی ہے۔ نہ جانے معصوم ششی کا کیا حال ہوگا؟ اور آپ اور شری کاشی ناتھ جی میرے متعلق کیا خیال فرما رہے ہوں گے۔ واقعی میں نے بزدلی برتی جو گھر سے فرار ہو گیا اور روپوشی اختیار کر کے اپنی شخصیت کو مشکوک بنا لیا۔ آج میں بڑے حوصلہ سے کام لے رہا ہوں۔ اور یہ خط صحیح واقعات سے لبریز آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ ایک مکروہ حقیقت جس پر ایک عرصہ سے پردہ پڑا ہوا تھا اسے بے نقاب کر رہا ہوں۔ خود کی بے گناہی کا ثبوت پیش کرنے کے لئے اپنی جان بچانے کے خاطر مجھے واقعات کی تعفن بھری لاش پر سے گڑا گلا کفن ہٹانا پڑ رہا ہے۔ آپ مقتولہ تلیکا اور میرے سابقہ تعلقات سے پوری طرح واقف ہیں۔ ان باتوں کو یہاں دہرا کر اور خواہ مخواہ خط کو طویل بنا کر میں آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں کروں گا صرف ان ہی واقعات کو قلم بند کروں گا جو آپ سے پوشیدہ ہیں۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ تلیکا کی شادی ہو جانے کے بعد میں اسے مقدس بہن کی طرح چاہنے لگا تھا۔ لیکن کئی دنوں تک اس نے اپنی حالت مجھ سے چھپائے رکھی تھی۔ اپنے آپ کو خوشحال ظاہر کرنے کے لئے وہ حقیقت پر پردہ ڈالے ہوئے تھی۔ گو ظاہرا وہ خوش خوش نظر آتی تھی لیکن اس بے جوڑ شادی سے وہ گویا دوزخ میں جا پڑی تھی۔ اس کا پتی بھجنگ راؤ ساٹھ سال کے لگ بھگ تھا۔ اور یہ بے بس لڑکی اٹھارہ انیس سے زیادہ نہ تھی۔ اس پہ طرہ یہ کہ بھجنگ راؤ کا ایک بے پالک لڑکا گویا آل نہایت خوبصورت اور جوان، گھر میں موجود تھا۔ بوڑھا پتی

لتیکا کو خوش رکھنے کی خاطر اس کے ہر شوق کو پورا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ لتیکا کی خواہش پر بنگلہ کے احاطہ ہی میں ایک بیڈمنٹن کورٹ بنا دیا گیا تھا۔ گوپال جو کالج کی ادھوری تعلیم چھوڑے ہوئے تھا سارا دن گھر پر ہی پڑا رہتا تھا۔ وہ بیڈمنٹن کھیلنے میں بڑا ماہر تھا۔ صبح شام گوپال اور لتیکا بیڈمنٹن کورٹ پر تھرکتے رہتے تھے۔ یہیں سے ان کی دوستی اور بے تکلفی کا آغاز ہوا۔ اس دوستی نے آگے چل کر بڑے گل کھلائے۔ آئے دن لتیکا گوپال کی طرف کھینچتی گئی۔ اس کی اٹھتی جوانی کے تقاضے نکمے شوہر سے پورے نہ ہو سکتے تھے۔ گوپال کے تندرست اور جوان جسم کو اس نے اپنی جنسی خواہشات کی آسودگی کا ذریعہ بنا لیا۔ بھجنگ راؤ دن بھر گھر سے باہر اپنے باغات میں رہتا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں دونوں جوان دل خوب رنگ رلیاں منایا کرتے تھے۔ چند دنوں بعد بڈھے میاں کو شبہ ہونے لگا۔ اور وہ باغ جاتے ہوئے لتیکا کو بھی ساتھ لے جانے لگا۔ اس کی یہ چال دونوں کے لئے مصیبت بن گئی اور انہوں نے دوسری راہ اختیار کی۔ موقع پا کر رات کو لتیکا گوپال کے کمرے میں ہو آتی۔ اس طرح کچھ دن بیت گئے۔ ایک شب جب لتیکا گوپال کے پاس تھی بوڑھا کھانستا ہوا اچانک بستر پر اٹھ بیٹھا اور لتیکا کا بستر خالی پا کر اسے آوازیں دے دے کر پکارنے لگا۔ نمک حرام گوپال نے آگے بڑھ کر اپنی پوری طاقت سے بوڑھے کا گلا دبا دیا۔ اور چند ہی لمحوں میں بوڑھے نے دم توڑ دیا۔ اس وقت تک لتیکا بھی اپنے کپڑے ٹھیک کرتی ہوئی باہر آ گئی تھی۔ یوں اپنے پتی کی ہتیا دیکھ کر وہ بلبلا اٹھی۔ لیکن گوپال کو پھانسی چڑھانا بھی اسے گوارا نہ تھا۔ غرض آپس میں مشورہ کر کے دونوں نے بڈھے کی لاش ایک چھکڑے میں ڈالی اور راتوں رات ایک باغ میں اسے ڈال آئے۔ صبح ہوتے ہی یہ مشہور کر دیا کہ بڑے میاں

کل دوپہر کو فلاں باغ میں گئے تھے ابھی تک نہیں لوٹے۔ باغ میں آدمی دوڑایا گیا اور پھر یہ ظاہر کیا گیا کہ بڈھے میاں ہارٹ فیل ہو جانے سے چل بسے۔ غرض اس طور بوڑھے بھجنگ رائے کو ٹھکانے لگایا گیا۔

پھر لتیکا بھی اور گوپال عیش پرستیوں میں دن گذرنے لگے۔ لتیکا گوپال پر پروانہ وار جان چھڑکتی تھی۔ کیونکہ اسے شباب کے لطف سے اسی نے روشناس اور مطمئن کرایا تھا۔ جیسے جیسے دن گذرتے گئے ان کے پاپ کو بھی زبان پھوٹنے لگی۔ لتیکا حاملہ ہو چکی تھی۔ گوپال اسے اسقاط حمل کے مشورے دینے لگا۔ لیکن لتیکا کی بڑی آرزو تھی کہ اس کے ہاں کوئی بچہ ہو۔ اس کی بڑی تمنا تھی کہ کوئی اسے ماں کہہ کر پکارے۔ اس نے گوپال کے پاؤں پکڑ لیے اور منتیں کرنے لگی کہ وہ اس سے پنر وواہ (عقد ثانی) کرلے۔ چند روز تک گوپال اسے فریب دیتا رہا۔ پھر ناگہاں ایک شب گھر کی ساری نقدی اور زیورات لے کر روپوش ہو گیا۔ لتیکا یہ چوٹ برداشت نہ کر سکی۔ اس نے مجھے شمس آباد بلا بھیجا۔ جب میں نے اس کے گھر میں قدم رکھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور چہرے پر پریشانی اور شرم کے تاثرات لئے اس نے مندرجہ بالا دردناک بپتا مجھے سنا ڈالی جسے سن کر میں نے سر پیٹ لیا۔ ناعاقبت اندیشی سے اگر کام لیا جائے تو جوانی کا نشہ انسان کو کس طرح تباہ کر دیتا ہے اس کی یہ ایک نمایاں مثال تھی۔ میرا دل غصہ سے بھر گیا۔ مگر اب وہ اپنے کئے پر نادم تھی۔ اس منزل پر اسے ملامت کرنا بھی بے کار تھا۔ میں جو اسے بہن کہہ چکا تھا اب بہن کی لاج بچانا میرا اولین فرض تھا۔ اس کا چچا بھی نہ رہا تھا۔ اور میں بھی ششی سے زندگی کے عہد و پیمان باندھ چکا تھا۔ لتیکا میرے ہاں چل کر رہنے پر مصر ہوئی۔ لیکن میں یہ کیسے بھلا دیتا کہ وہ ایک حاملہ بیوہ تھی۔ عنقریب بچہ کی

ماں بننے والی تھی۔ اس خوف سے میں لرزنے لگا۔ اسے اپنے گھرلے جاکر میں اپنی ذات کو مشکوک بنانا نہیں چاہتا تھا اور میرے کانوں میں یہ بھی بھنک پڑی تھی کہ بھجنگ راؤ کی اچانک موت کو گاؤں والے بھولے نہیں وہ آپس میں قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ گویا چاروں طرف مجھے خطرہ ہی خطرہ دکھائی دینے لگا۔ میں اسے ساتھ لئے حیدر آباد چلا آیا اور ایک زچہ خانہ میں داخل کرا دیا جہاں اس کے ایک مردہ بچی پیدا ہوئی تھی۔ وہ پوری طور سے صحت مند ہو جانے تک زچہ خانہ ہی میں رہی۔

پورن ماشی کے دن جب ششی میکے چلی گئی تھی زچہ خانہ کا چپراسی مجھے پوچھتا ہوا آیا۔ اور اس نے لتیکا کا فوری طلبی کا پیغام سنایا۔ جب وہاں جاکر میں اس سے ملا تو وہ مجھ سے استدعا کرنے لگی کہ میں اسے اپنے گھرلے چلوں۔ وہ بالکل صحت یاب ہو چکی تھی اور زچہ خانہ کی زندگی سے تنگ آگئی تھی۔ یہ سوچ کر کہ دو تین دن میں اس کی رہائش کا کہیں نہ کہیں انتظام کر دوں گا رات اسے میں اپنے ساتھ گھرلے آیا۔ کھانا ہم دونوں نے باہر ہوٹل میں کھایا۔ کھانا کھا کر جب ہم ایک فیملی کیبن سے باہر نکلنے لگے تو ایک ثانیہ کے لئے لتیکا جیسے چونک سی گئی ہوٹل میں کونے کی میز پہ بیٹھے ہوئے ایک نوجوان کی طرف اس نے میری توجہ مبذول کرائی وہ ایک نہایت شکیل نوجوان تھا جو کھانا کھاتے ہوئے اخبار پڑھ رہا تھا پھر مجھے واپس کیبن میں لے جاکر لتیکا کہنے لگی "آنند میرے بھیا اس شخص کو جانے نہ دینا۔ یہی ہے وہ گوپال جس نے میرا سب کچھ لوٹ لیا تھا ـــــ" چند لمحے میں اس نوجواں کے کھانا کھا چکنے کا انتظار کرتا رہا۔ اور جب وہ ہاتھ دھو کر چلنے کو ہوا تو میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ چند منٹ کے لئے اس کیبن میں آئے پہلے تو وہ جھجکا لیکن جب میں نے مکرّر استدعا کی تو کچھ سوچتا ہوا

وہ میرے ساتھ اندر آگیا۔ چشم زدن میں اس کا کالر پکڑ کر میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے کرسی میں دھنسا دیا۔ مقابل کی کرسی پر تیکا کو دیکھ کر اس مکار نے سب کچھ بھانپ لیا اور بڑی شاطرانہ چال چل گیا۔ ساری سابقہ باتوں پر اظہار ندامت کرتے ہوئے اس نے کہا کہ وہ اب بہت پچھتا رہا ہے۔ فی الحقیقت اُسے تیکا سے سچا عشق ہے۔ اور کئی دنوں سے وہ اس کی تلاش میں تھا کہ اس کے قدموں پر گر کر معافی مانگ لے اور پھر پُنر وواہ کرنے کی بھیک مانگے۔ اس کا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ تیکا پر از سرِ نو شباب کا نشہ طاری ہونے لگا۔ گوپال کی لفاظی سُن کر اسے ماضی کے سنہرے دن یاد آگئے۔ اگر میں اس کیبن میں موجود نہ ہوتا تو وہ اسی وقت اپنے آپ کو خوبصورت گوپال کی آغوش میں ڈال دیتی۔ اس کا چہرہ قوس قزح کی مانند رنگ بدلنے لگا تھا۔ شاید وہ پھر مستقبل کی بدمستی اور عیش پرستی کے میٹھے سپنے دیکھنے لگی تھی۔ اس نے گوپال کو معاف کر دیا۔ میز پر پرس تھامے ہوئے وہ پریم بھرے نینوں سے گوپال کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میری موجودگی ہی میں گوپال نے ہاتھ بڑھا کر اس کی گوری دلکش انگلیوں کو دبا دیا۔ گوپال گویا مجسم محبت بن گیا تھا۔ اسی طرح تیکا سے باتیں کرتا ہوا نصف شب گئے وہ میرے گھر آ گیا۔ بڑی دیر تک تنہا کمرے میں وہ تیکا سے راز و نیاز کی باتیں کرتا رہا۔ پھر انھوں نے آپس میں کچھ مشورہ کیا اور تیکا میرے پاس آکر بولی "بھیا! گوپال یہیں سونا چاہتا ہے۔ اب اتنی رات گئے وہ کہاں جائیگا۔"

یہ سُن کر میں کچھ سوچ میں مبتلا ہو گیا۔ میرے چہرے پر ہویدا تاثرات سے میرے دل کی گہرائی میں پہنچنے میں اسے دیر نہیں لگی۔ اور وہ سمجھ گئی کہ اس کی اس تجویز پر میں متفق نہیں ہوں۔ تو شرم سے نیچی نگاہیں کئے وہ بولی "اپنے کئے پر وہ ندامت کا اظہار کر چکا ہے تم بھی اسے معاف کر دو آنند! ہم کل ہی بیاہ کر لیں گے اور میں

اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔" اس بات سے مجھے کسی حد تک خوشی تو ہوئی لیکن کوئی اندرونی خلش دل میں چٹکیاں لیتے لگی تھی۔ غرض رین بسیرا کرنے کی گوپال کو اس طرح اجازت مل گئی تھی۔ میں دن بھر کا تھکا ہوا تو تھا ہی نیند کا غلبہ مجھ پر کچھ ایسے طاری ہوا کہ میں بے خبر پڑا سوتا رہا۔ پو پھٹتے ہی مجھے کچھ شور سنائی دیا۔ بستر ہی میں لیٹا سر اٹھائے میں غور سے سننے لگا۔ ایک دردناک اور دل گداز چیخ سن کر میرا دل دہل گیا۔ وہ آواز نتیکا ہی کے کمرے سے آ رہی تھی۔ وہ چلا رہی تھی: "دغا۔ فریب۔ خون خون ارے کوئی آؤ۔ ظالم نے مجھے مار ڈالا۔"

میں بے تحاشہ دوڑا ہوا اس کے کمرے میں جا پہنچا وہ خون میں نہائی پڑی تھی۔ اور وہاں کوئی نہ تھا۔ پیٹ چاک چاک تھا۔ آنتیں باہر اُبل پڑی تھیں خنجر سینہ میں گھونپا ہوا تھا۔ خون کا ایک تیز دھارا فرش پر بہ رہا تھا، اور وہ دم توڑ رہی تھی۔ میرا سر چکرا گیا اور میں لڑکھڑا کر وہیں بیٹھ گیا۔ جاتے ہوئے گوپال صدر دروازہ کھلا چھوڑ گیا تھا۔ اڑوس پڑوس کے لوگ دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور قتل کا الزام میرے سر منڈھ دیا گیا۔ میرے ہاتھ میں خوفناک خنجر دیکھ کر کسی کو میرے قریب آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ تھانہ پر آدمی دوڑایا گیا۔ میرے اوسان خطا ہو ہی چکے تھے۔ میری بزدلی ملاحظہ ہو کہ میں عقبی دروازہ سے نکل بھاگا اور اس دن سے روپوش ہوں۔ مندرجہ بالا پتہ پر ایک دوست کے ہاں پناہ لئے ہوئے ہوں۔ لیکن اخبارات وہ بھی پڑھتا ہے۔ ایک قاتل کو پناہ دینے کی وہ اب حامی نہیں بھرتا۔ میں نے اس سے دو دن کی مہلت مانگ لی ہے۔ آپ مجھے اس بے شرمی اور بدنامی کی زندگی سے نجات دلائیے۔ اس زندگی سے میں تنگ آ گیا ہوں۔ میں قاتل نہیں۔ قاتل گوپال ہے۔ وہ نہایت خوش وضع خوبصورت نوجوان ہے

اس کے سر کے بال سنہرے ہیں۔ آنکھیں بھوری اور دلکش ہیں۔ ڈھانچہ اس کا سڈول اور تندرست ہے۔ یہ حلیہ آپ پولیس میں لکھوا کر اسے گرفتار کرا کے مجھے بچائیے۔ اس کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ بیڈمنٹن کھیلنے میں بڑا مشّاق ہے — آپ مجھے اپنی اولاد کی طرح چاہتے ہیں۔ اس زک سے مجھے بچائیے۔

آپ کا بزدل شاگرد

آنند"

خط پڑھ کر طالب حد درجہ متاثر ہوا۔ حقیقت کیا ہوتی ہے اور پولیس اسے کس طرح منظرِ عام پر لاتی ہے۔ اس کی یہ ایک نمایاں مثال تھی۔ اب صحیح حالات طالب پر عیاں ہو چکے تھے۔ اس نئے انکشاف کی عظمت سے اس کے چہرے پر حیرت و مسّرت کی امتزاجی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

انجام کار آنند کے سر نامہ لکھے ہوئے پتہ پر ہم جا پہنچے۔ اس مکان کے صحن میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت سے مڈبھیڑ ہوئی۔ "کیا آنند اندر موجود ہے۔؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔ ہمیں دیکھ کر وہ کچھ سہم گئی تھی۔ یہ سوال سُن کر اور باوردی طالب کو دیکھ کر لرزہ براندام ہو گئی۔ اور بغیر کوئی جواب دیے اندر بھاگ گئی۔ ہم بھی اندر جانے لگے۔ ایک کمرے کا دروازہ نیم وا ہوا۔ اور آنند نے سب سے پہلے طالب ہی کو دیکھا۔ مارے خوف کے اس نے پھر دروازہ بند کر لیا۔

"آنند! واقعی تم میرے بزدل شاگرد ہو لیکن بھئی ہو بڑے نیک!" دروازہ پر پہنچ کر میں نے بلند آواز میں کہا۔ میری آواز پہچان کر اس نے فی الفور دروازہ کھول دیا۔

"گھبراؤ نہیں" طالب اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے بولا "قاتل گرفتار ہو چکا ہے۔ تم بے گناہ ہو" آنند دوڑ کر مجھ سے چمٹ گیا۔

"پریم بابو!" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ اور اس کی آنکھوں سے مسرت کے آنسو چھلکنے لگے۔ وہ ادھیڑ عمر کی عورت جو خوف زدہ ہوکر اندر بھاگ گئی تھی، شاید اپنے شوہر کو لتاڑ رہی تھی کہ اس نے کیوں ایک قاتل کو پناہ دے رکھی ہے۔ لیکن یہ عجیب منظر دیکھ کر وہ اب اپنے شوہر سمیت وہاں آکھڑی ہوئی تھی۔ اور وہ دونوں اس ڈرامہ کے خوش انجام ہونے پر شاداں دکھائی دے رہے تھے۔

جب زخمی جی۔ کرشنا عرف گوپال کرشنا کے وارڈ میں انسپکٹر طالب مجھے اور آنند کو لئے پہنچا تو اس نے خشمگیں نگاہوں سے آنند کی طرف دیکھا اور بغیر کسی جبر و اکراہ کے اقبالِ جرم کر لیا۔ صحیح قاتل پولیس کی تحویل میں آچکا تھا پھر آنند کا گرفتاری وارنٹ کینسل کرانے میں کیا دیر لگتی؟ وقت مقررہ پر سہ پہر میں کاشی ناتھ جی کے میرے ہاں تشریف لانے سے قبل ہی میں آنند کو ساتھ لئے ان کے درِ دولت پر حاضر ہو گیا۔ آنند کے بے گناہ ثابت ہونے کی خبر سن کر اور اسے میرے ہمراہ دیکھ کر ششی کی مسکراہٹ اور کاشی ناتھ جی کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ اس وقت انھوں نے میری تعریف میں جو مبالغہ آمیز الفاظ استعمال کئے ممکن ہے میں انہیں بھول جاؤں لیکن گوپال کے اقبالی بیان کے یہ جملے مجھے کبھی نہیں بھولیں گے۔ اس نے کہا تھا:۔

"میں آستین میں پلا ہوا سانپ ہوں۔ جس نے مجھے پناہ دی اس محسن کی معصوم بیوی کو میں نے غلط راہ پر ڈالا۔ گلا گھونٹ کر میں نے اپنے بوڑھے محسن کو ہلاک کیا فریب دے کر لتیکا کی عصمت لوٹی اور اسے بھی ٹھنڈا کر دیا۔ ہاں! میں قاتل ہوں ۔۔۔ میں سانپ ہوں!!"

تہمت

"اونکار بھون" کا پھاٹک حسب معمول کھلا ہوا ہی تھا۔ میں اپنی سائیکل پر سوار اندر داخل ہو گیا۔ اور حسب عادت گھنٹی بجا کر مس لیلا کی کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن خلاف معمول آج کھڑکی بند تھی ورنہ آج تک پھاٹک سے داخل ہوتے ہی جب میں گھنٹی بجاتا تھا مس لیلا کا دل کش چہرہ ایک غنچہ کی طرح کھلا ہوا اس کھڑکی میں سے نہایت شیریں مسکراہٹ کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہتا تھا اور میرے پورچ میں پہنچتے ہی چوکیدار میری سائیکل تھام لیتا۔ اور اتنی دیر میں مس لیلا بھی پورچ کے برآمدے تک آ جاتی اور مجھ سے نظریں ملتے ہی "گڈ مارننگ سر" کہتی ہوئی میرا خیر مقدم کرتی۔ پھر اپنے کمرے تک وہ میری پیش قدمی کرتی اور میرے اندر داخل ہونے تک اپنے دل فریب ہاتھوں سے دروازے پر کا ریشمی پردہ تھامے رہتی اور جب میں میز کے پاس کرسی پر بیٹھ جاتا تو وہ بھی میز کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ جاتی اور میں اسے پڑھانے لگتا۔ دو سال سے میں بیرسٹر اونکار ناتھ کی اکلوتی بیٹی مس لیلا کو پڑھا رہا تھا۔ اس طویل مدت میں یہ پہلا ہی موقع تھا کہ اس کی کھڑکی مجھے بند نظر آئی ——۔

جب میں پورچ میں پہنچا تو ایک نئی شاندار بیوک کار راستہ روکے کھڑی تھی

پاس ہی ڈرائیور اور ایک باوردی چپراسی کا موجود ہونا اس بات کی شہادت پیش کر رہا تھا کہ کوئی بڑا افسر آیا ہوا ہے۔ چوکیدار وہاں موجود نہیں تھا۔ اسٹینڈ پر سیکل کھڑی کر کے میں آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ بیرسٹر اونکار ناتھ جی اُس افسر سے باتیں کرتے ہوئے پورچ میں پہنچے اور ڈرائیور نے موٹر کا دروازہ کھول دیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی بیرسٹر صاحب نے کہا۔

"آپ سے ملئے ـــــ"

اور وہ افسر اپنی ایک آنکھ پر عینک لگائے میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"آپ ہیں پریم بابو ـــــ پروفیسر پریم اس لیلا کو پڑھاتے ہیں ـــــ"

افسر نے مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

"اور آپ ـــــ" بیرسٹر صاحب اس افسر کا مجھ سے تعارف کراتے ہوئے بولے

"آپ ہیں راؤ بہادر بعال چندر جی"!

اس نام کو سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ رسمی طور پر میں نے اس ملاقات پر اظہار مسرت تو کر دیا لیکن راؤ بہادر بعال چندر جی سے اس طرح اچانک ملاقات ہو جانے اور پھر ان کے مجھے نہ پہچاننے پر حیرت ضرور ہوئی ـــ وہ بغیر کوئی لفظ زبان سے ادا کئے کار میں بیٹھ گئے اور ان کی بیوک چلے جانے پر بھی میں چند ثانئے ساکت و صامت وہیں کھڑا رہا۔ بیرسٹر اونکار ناتھ جی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے جیسے خواب سے چونکا دیا۔

"آپ تشریف رکھئے پریم بابو! لیلا آتی ہی ہوگی ـــــ"

اور میں آہستہ آہستہ ان کے ساتھ چلنے لگا۔ دیوان خانہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے ایک نوکر سے انھوں نے مجھے مس لیلا کے کمرے میں بٹھانے کو کہا۔

اور وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں لیلا کے کمرے میں پہنچ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لیلا کی نشست خالی تھی ــــ لیکن میرے دماغ میں اس وقت راؤ بہادر بھال چندر جی ہی کے بارے میں خیالات موجزن تھے۔

کوئی پندرہ سال کے بعد میں آج بھال چندر جی سے ملا تھا۔ اُس وقت وہ نہایت تندرست اور خوش رو نوجوان تھے۔ اب بھی گو بوڑھے تو نہیں ہو گئے تھے پھر بھی چہرے پر شباب کی وہ سُرخی نہیں رہی۔ پروفیسر دابھولکر کے ہاں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ گو آج وہ راؤ بہادر کہلاتے ہیں لیکن ان دنوں بی اے کے ایک ادنیٰ طالب علم تھے اس وقت میری عمر کوئی بارہ سال کی ہوگی اور میں نہم میں پڑھتا تھا۔ پروفیسر دابھولکر میرے چاچا کے پُر تکلف دوست تھے اور ان ہی تعلقات کی بنا پر مجھے روزانہ ایک گھنٹہ پڑھاتے تھے۔ روزانہ سویرے میں پروفیسر صاحب کے ہاں جایا کرتا تھا اور جب میں پڑھ کر جانے لگتا تو بھال چندر جی پڑھنے آتے تھے۔ غرض روزانہ میری ان کی مڈبھیڑ ہوتی تھی مجھ سے کوئی چار پانچ سال بڑی پروفیسر صاحب کی ایک لڑکی تھی مالتی! میں اسے دیدی کہتا تھا۔ دیدی جس قدر حسین تھیں اتنی ہی ذہین بھی تھیں۔ جب کبھی پروفیسر صاحب کی طبیعت ناساز ہو جاتی تھی تو وہ دیدی کو مجھے پڑھانے کا کہہ دیتے تھے۔ اس وقت میرا دل ان سے مزید ایک گھنٹہ پڑھنے کے لئے چاہتا تھا۔ اور دیدی بھی مجھے پڑھانے میں پوری دل چسپی لیا کرتی تھی۔ ایسے موقع پر بھال چندر جی بھی ہمارے ساتھ بیٹھے ہم دونوں سے اِدھر اُدھر کے سوال و جواب پوچھا کرتے تھے۔ میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ دیدی کو عجیب نظروں سے گھورا کرتے تھے اور ان سے زیادہ لگاوٹ کی کوشش کرتے تھے۔

پھر اچانک پروفیسر داہجو لکر کا انتقال ہو گیا تھا۔ کوئی قریبی رشتہ دار موجود نہ ہونے کی وجہ سے چاچا دیاری کو ہمارے ہاں لے آئے تھے۔ دیدی کے ہمارے ہاں آجانے سے مجھے بڑی مسرت ہوئی تھی۔ لیکن وہ ہمیشہ رنجیدہ رہتی تھیں۔ ہمارے گھر پر آجانے کے بعد انہوں نے مجھے کبھی نہیں پڑھایا۔

ایک واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ اس روز میں اسکول سے لوٹ رہا تھا کہ بھال چندر جی نے اپنی موٹر سائیکل راستہ میں روک لی اور مجھ سے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرنے کے بعد مجھے ایک لفافہ دیا تھا کہ میں سب کی نظر سے بچا کر دیدی کو پہنچا دوں۔ اور وہ لفافہ جب میں نے دیدی کو دیا تھا تو انھوں نے اسے نصف پڑھ کر ہی پھاڑ ڈالا تھا۔ دوسرے روز ہمارے عقبی باغ میں بنچ پر بیٹھا میں دیدی سے باتیں کر رہا تھا کہ وہ یکایک کچھ گھبرائی ہوئی سی دکھائی دینے لگیں۔ میں ان کے اس غیر متوقع اضطراب سے حیران رہ گیا۔ اتنے میں پچھلے پھاٹک سے بھال چندر جی باغ میں داخل ہو کر ہمارے پاس آگئے تھے۔ اُنہوں نے مجھے ایک روپیہ کا نوٹ دے کر سگریٹ لانے کے لئے بھجوا دیا اور جب میں واپس لوٹا تو دیاری بنچ پر بیٹھی رو رہی تھیں۔ اور دس دس روپے کے کچھ نوٹ وہاں بکھرے پڑے تھے اور مجھ پر نظر پڑتے ہی بھال چندجی ان کو چُننے لگے تھے۔ میرے آجانے کے فوراً بعد وہ وہاں سے چلے گئے۔ پھر سُنا گیا تھا کہ وہ مزید تعلیم کے لئے یورپ چلے گئے۔ ان کی روانگی کے تیسرے یا چوتھے روز دیدی بھی کہیں غائب ہو گئیں۔ چاچا نے بہت تلاش کرایا لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔ پولیس میں بھی اطلاع دی گئی تھی لیکن سب لاحاصل —۔

آج اس واقعہ کو پندرہ سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ دیدی

ایسی روپوش ہوئی تھیں کہ پھر کسی کو دکھائی نہ دیں۔ اور بہال چندر جی یورپ سے لوٹ کر کلکٹر ہو گئے تھے۔ اب راؤ بہادر بہال چندر جی کہلاتے ہیں۔ اور ہمارے ضلع کے سب سے بڑے افسر ہیں۔ پندرہ سال بعد آج ان سے اچانک ملاقات ہوئی لیکن انہوں نے مجھے نہیں پہچانا ــــــ

انہیں خیالات میں مستغرق میں لیلا کے کمرے میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا کہ دروازہ میں مجھے کچھ آہٹ سنائی دی۔ اور اس خیال سے کہ لیلا آگئی ہوگی میں نے مڑ کر دیکھا۔ لیکن وہاں کچھ اور ہی نظارہ دکھائی دیا ــــ حسین لیلا کے بجائے اس کی مکروہ صورت آیا دروازے میں کھڑی تھی۔ مجھے متوجہ پاکر وہ قدرے مسکرائی۔

"آپ آگئے ــــ تشریف رکھئے میں ابھی حاضر ہوئی ــــ"

اس نے شیریں لہجہ میں کہا اور چلی گئی۔ میں اس کے جملے کی ساخت پر غور کرنے لگا۔ بھلا مجھے اس آیا کے دوبارہ آنے یا نہ آنے سے کیا سروکار تھا! اور مجھے ہنسی آگئی۔

پھر میں اس بدشکل آیا کی میٹھی آواز کے بارے میں سوچنے لگا۔ فلمی دنیا میں اکثر پلے بیک گانے والوں کی شکل وصورت اور ڈیل ڈول کس قدر بھدے ہوتے ہیں۔ لیکن آواز میں بڑی مٹھاس ہوتی ہے۔ یہی حال لیلا کی اس آیا کا تھا۔ ڈول تو غنیمت تھا۔ لیکن صورت حد درجہ مکروہ ــــ اور آواز کے کیا کہنے!

لیلا کو پڑھانے کے دوران میں اس آیا کو میں کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ بعض دفعہ جب لیلا کافی یا اوولٹین سے مجھے نوازتی تو بڑے میں پیالیاں لئے یہی

آیا چلی آتی تھی۔ میں پڑھانے کے انہماک میں ہوتا اور جب آیا تپائی پر ٹرے رکھتی تو اس کے گورے چٹے ہاتھ اور دل فریب انگلیاں دیکھ کر نظریں اس کی صورت پر جا ٹکتیں۔ لیکن۔۔۔۔۔۔ نہ جانے خوبصورت سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم اور گوری رنگت والی اس آیا کے چہرے پر قدرت نے بے دردی سے اس قدر گہرے نقش و نگار کیوں بنا دیئے تھے۔ کچھ نقوش تو ایسے دردناک طور پر بنے ہوئے تھے کہ دیکھتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے اور بجائے نفرت کے انسان کے دل میں ہمدردی کا جذبہ موجزن ہو جاتا تھا۔ بات چیت کرنے کا انداز بھی آیا کا شائستہ تھا۔ اگر پردے کے پیچھے آیا کو بات کرتے ہوئے کوئی اجنبی سنے تو وہ مطلق یقین نہیں کرے گا کہ کوئی آیا بول رہی ہے بلکہ اسے یہ شبہ ہونے لگے گا کہ اندر بی بی جی کی کوئی سہیلی آئی ہوئی ہے۔

اس سوچ بچار میں میں نے میز پر سے لیلا کی ایک کتاب اٹھائی اور جوں ہی اس کی ورق گردانی کرنے لگا تو ایک تصویر میری گود میں آ رہی۔ ایک ہاتھ سے کتاب تھامے دوسرے ہاتھ میں وہ تصویر لئے میں دیکھنے لگا۔ شیروانی پہنے، الجھے ہوئے بالوں والا ایک شکیل نوجوان مسکرا رہا تھا۔ تصویر مجھے پسند آئی۔ اور میں غور سے دیکھنے لگا۔ نیچے باریک خط میں لکھا ہوا تھا۔

"ڈارلنگ للّی کو ۔۔۔

خلوص کے ساتھ

مکند ۔۔۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ یہ "ڈارلنگ" اور پھر "خلوص کے ساتھ"!

آج کل کے لڑکے محبت تو کرتے ہیں لیکن پیار کی عبارت بھی لکھنا

نہیں جانتے۔ یہ غریب مکند ہمارے ہی کالج میں پڑھتا ہے۔ لیلا ہی کے ساتھ فرسٹ ایر میں ہے۔ لیلا کی عمر پندرہ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ اور یہ مکند بھی اٹھارہ انیس سال کا ہوگا۔ ابھی ان بچوں کو بہت کچھ سیکھنا ہے۔ انہوں نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے اور بس چلے محبت کرنے۔ تاہم ایک بات یہ مجھے خوشی ہوئی کہ مکند تو ایک یتیم اور مفلوک الحال لڑکا ہے اور مس لیلا اکلوتی بیرسٹر اوُنکار ناتھ کی اکلوتی بیٹی۔ مکند کو سر چھپانے کہیں ٹھکانہ نہیں اور لیلا کا باپ لاکھوں کی جائداد کا مالک تھا۔ شہر میں اس کی بیسیوں کوٹھیاں تھیں اور جس نے حال ہی میں لیلا کے لئے علیحدہ نئی کار خریدی تھی ــــ سچ ہے پریم نگری میں غربت اور امارت کے بھید لایعنی ہیں۔ لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ لیلا بھی اس لڑکے کو چاہتی ہے۔ ممکن ہے یہ شرمیلا جی لیلا کے حسن اور دولت پر لٹو ہو گئے ہوں اور دل دے بیٹھے ہوں۔

اتنے میں قدموں کی چاپ سنائی دی اور آیا حسبِ وعدہ آ دھمکی۔

یہ لیجئے ــــ" اس نے شہد ملی آواز میں کہا۔

اور گرم گرم اوولٹین کا پیالہ اس نے میرے سامنے رکھ دیا۔

"چھوٹی بی بی کہاں ہیں ــــ؟" میں نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ باہر تشریف لے گئی ہیں اور آپ کے لئے یہ خط چھوڑ گئی ہیں۔" آیا نے کہا اور ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بے قراری سے چٹھی نکال لی اور پڑھنے لگا ــــ

"سر!

میں مکند کی سالگرہ میں شرکت کرنے دو گھنٹے کے لیے اس کے گھر جا رہی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ پہلے آپ کو مطلع نہ کر سکی اور آپ نے آنے کی زحمت گوارہ فرمائی۔ میں نے آیا سے کہہ دیا ہے کہ وہ آپ کو اولٹین کی ایک لذیذ پیالی پیش کرے۔

اپنی عدم موجودگی کی معذرت چاہتی ہوں فقط

لیلا۔"

اچھا! تو یہ کماری جی بھی چاہتی ہیں اُسے! یہ معلوم کر کے میرے ہونٹ مسکرانے لگے اور دل شادماں ہو گیا۔

میں اُس لذیذ اولٹین کے گرم گرم گھونٹ حلق میں اتارتا ہوا دوبارہ لیلا کی چھٹی کو پڑھنے لگا، جو ان دو پریمیوں کی سچی محبت کی شہادت پیش کر رہی تھی۔ میز سے تھوڑے ہی فاصلے پر آیا ہنوز کھڑی ہوئی تھی۔

میں دل میں سوچنے لگا کہ ایک پروفیسر کو تنہائی میں آیاؤں اور ماماؤں سے کس قسم کی گفتگو کرنی چاہیئے۔ بہر حال کچھ بولنا چاہیئے اس خیال سے میں نے کہا۔

"آیا! کیا آج چائے پر کوئی بڑے مہمان آئے تھے؟"

"جی ہاں! راؤ بہادر بھال چندر جی۔" آیا نے کہا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے آیا کی آواز کانپ رہی ہے۔ میں نے اولٹین کا ایک گھونٹ پیا اور آیا کی طرف دیکھنے لگا۔

نہ صرف اس کی آواز میں لرزش تھی بلکہ اس کی پلکیں بھی بھیگ رہی تھیں۔ آنکھ میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور میں آپا کا مونہہ تکنے لگا۔

"ارے تم تو رونے لگیں —— کیا ہوا آپا —— ؟" میں نے نرم لہجہ میں پوچھا۔

"راؤ بہادر بہال چندر جی۔ ... چھوٹی بی بی کو پسند فرما چکے ہیں اور عنقریب شادی ہونے والی ہے۔" آپا سسکنے لگی

میرا دل دھک سے ہو گیا۔

میری نگاہ پھر مکند کی تصویر پر رینگنے لگی جو اب بھی مسکرا رہا تھا۔ اس کے مجنوں جیسے بال الجھ کر پیشانی پر آگئے تھے گویا اسے علم بغاوت بلند کرنے کی ترغیب دے رہے تھے۔

مجھے گمان ہوا اس یتیم لڑکے سے غریب آپا کو ہمدردی ہوگی۔ اور ممکن ہے مکند اور لیلا کے محبت ناموں کی نامہ بر بھی یہی رازدار آپا ہو۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا بابو جی۔" آپا آنسو پونچھتی ہوئی بولی "کہ کسی نہ کسی طرح یہ ناجائز شادی رک جائے —— ؟"

میں آپا کے لفظ "ناجائز" پر غور کرنے لگا۔

کبھی کبھی یہ خدمت گزار لوگ ایسے غلط الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جن کے وہ خود معنی تک نہیں سمجھتے۔ جہاں کہیں اپنے آقا کی زبان سے کوئی نیا لفظ سن لیا بس چلے اسے استعمال کرنے چاہے مطلب خاک نہ سمجھ میں آئے۔ میرے ملنے والوں میں سے ایک کی خادمہ نے اپنی بیگم صاحبہ سے لفظ "طرز معاشرت" سن لیا تھا اور دوسرے دن اسے "طرز مباشرت" کی

صورت میں بادل کر خوب جوتیاں کھائیں۔ لیکن ایسی غلطیوں کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ پھر بھی ٹوک دینا ضروری ہے اس خیال سے میں نے طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ آپا کے لفظ کو دہرایا۔

"ناجائز!"

"جی ہاں۔ بالکل ناجائز ـــ" آپا فوراً بول پڑی۔

میں آپا کی آنکھوں میں دیکھنے لگا جو حسرت و یاس کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ ان آنسوؤں کا بھید معلوم کرنے کی مجھے کرید لگ رہی تھی۔

" مانا کہ راؤ بہادر اور لیلا کی عمر میں زیادہ تفاوت ہے لیکن راؤ بہادر کوئی بوڑھے تو نہیں ہیں آپا ـــ!" پھر قدرے مسکراتے ہوئے میں نے کہا" آپا تم جائز اور ناجائز کا مطلب بھی تو سمجھتی ہو ـــ؟"

میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے آپا مکند کی تصویر کو دیکھتی ہوئی بولی۔

"چھوٹی بی بی اس لڑکے کو چاہتی ہے اور وہ بھی اس پر جان چھڑکتا ہے ـــ بابوجی! اگر.... اگر آپ کوشش کریں تو ان دونوں کی شادی ہو سکتی ہے۔"

مکند اور لیلا کے پریم کو میں ایک راز سمجھ رہا تھا لیکن یہ معلوم کر کے کہ لیلا کی آیا بھی اس بھید میں شریک ہے مجھے تعجب نہیں ہوا۔ کیوں کہ بڑے خاندانوں کی بہو بیٹیوں کے اغوا کی جو وارداتیں ہوا کرتی ہیں ان میں لبا اوقات آیاؤں اور ماماؤں ہی کی رازدارانہ اعانت کو خاص دخل ہوتا ہے۔ قلیل سی رشوت لے کر یہ طبقہ اپنے آقاؤں کی عزت کو

خاک میں ملانے سے بھی درگذر نہیں کرتا۔ اِس خیال کے پیش نظر میں نے کرخت لہجہ میں کہا۔

" آیا تم یہ بھول رہی ہو کہ تم اس گھر کی نمک خوار نوکرانی ہو۔ ممکن ہے اس لڑکے نے تمہیں کچھ لالچ بھی دیا ہو، تو کیا ان چند سکّوں کے بدلے اس گھر کی لاج کو اس کے سپرد کر دینا چاہتی ہو؟"

میرے اس برتاؤ کے لئے آیا مطلق تیار نہیں تھی کچھ سہم سی گئی۔ اس کے لبوں کو حرکت ہو رہی تھی لیکن وہ کچھ بول نہ سک رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا یہ تیر ٹھیک نشانہ پہ لگا تھا۔ گویا میں نے اس کی دُکھتی رگ پکڑ لی تھی۔ بہزار دقت اپنے آپ پہ قابو پاتی ہوئی وہ بولی۔

" بابو جی! میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ چھوٹی بی بی کی شادی لازماً اسی نوجوان سے ہو۔ چاہے اس کی شادی کہیں اور ہو لیکن .... راو بہادر بہال چند جی سے مطلق نہیں ہونی چاہیئے۔" آیا نے درد بھرے لفظوں میں کہا

آیا کے اس فیصلہ کن لہجہ سے میری تشویش اور بھی بڑھ گئی۔ بھلا بہال چند جی میں برائی ہی کیا تھی؟ اس ناسمجھ عورت کو اگر مکند میں بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی تو پھر لیلا کی شادی بہال چند جی سے ہونا اسے ناپسند کیوں تھا، ساتھ ہی مجھے آیا کی بے بسی پر ترس بھی آ رہا تھا۔ آخر تھی وہ ایک نوکرانی ہی —— بھلا اس کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کیا وقعت رکھتی ہے؟ اس لحاظ سے میں نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

" لیکن آیا۔ تم چاہنے یا نہ چاہنے والی کون ہوتی ہو؟ بیرسٹر صاحب کو اگر رشتہ منظور ہے تو تمہاری ناپسندیدگی کو کون پوچھنے لگا —— ؟"

"یہ میں جانتی ہوں" آپا کچھ ڈھارس سے بولی "میں تو اس خاندان کی ایک ادنیٰ نوکرانی ہوں۔ لیکن اگر آپ چاہیں تو......" آپا نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

میں اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ ایک خاص چمک اس کی آنکھوں میں پیدا ہو گئی تھی جس میں آس کے تارے جھلملا رہے تھے۔ لیکن مجھے تعجب ضرور تھا کہ یہ آپا مجھ سے اس قدر بے تکلفی کیوں برت رہی ہے۔ میں بغیر پلک جھپکائے اس کی صورت تک رہا تھا۔ اس انداز سے مجھے اپنی طرف متوجہ پاکر آپا دو قدم آگے بڑھی اور التجا میں ڈوبے لہجہ میں کہنے لگی۔

"بابو جی! کیا آپ میری مدد نہیں فرمائیں گے؟ میں چاہتی ہوں کہ یہ ناجائز رشتہ طے نہ ہونے پائے ـــــ" اس نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ گویا اسے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس وقت اس کی زبان سے ادا ہونے والی باتیں اس مکان کا اور کوئی فرد نہ سن پائے۔ وہ مڑ مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی جہاں ریشمی پردہ پڑا ہوا ہوا میں لہرا رہا تھا۔

"معاف کیجئے" آپا نے کہا اور دروازے تک جا کر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس کی اس انوکھی حرکت پر مجھے حیرت ضرور ہوئی لیکن اس وقت مجھ میں جستجو کا ایک جذبہ جاگ اٹھا تھا اور میں اس راز کے انکشاف کے لئے بے قرار ہو گیا تھا جو آپا کے سینہ میں پوشیدہ تھا۔

"یہ کیا کرتی ہو آپا ـــــ دروازہ کھول دو ـــــ" میں نے بناوٹی خفگی سے کہا۔

اس تیکھے انداز پر وہ گڑگڑا کر بولی۔

"اس کے لئے میں پہلے ہی معذرت چاہ چکی ہوں۔ کسی کی عزت اور زندگی کا سوال ہے۔ آپ میری مدد فرمائیے۔"

اور وہ میری کرسی سے بالکل قریب آ کر کھڑی ہو گئی اس کے اس برتاؤ سے میں ششدر رہ گیا، اور اسے دیکھنے لگا۔ اس کے انگ انگ سے بے بسی ٹپک رہی تھی۔ میں بھی مترحم نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اور پھر اس کے ہونٹ کو حرکت ہوئی۔

"میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ راؤ بہادر بہال چندر جی اس قابل نہیں کہ معصوم لیلا کو ان سے وابستہ کر دیا جائے ..... سنئے ——"

اور میں استعجاب سے سنتا رہا آیا نے مجھے ایک بھولی ہوئی کہانی سنائی —— ایک ایسا افسانہ جو میرے لئے اب تک ادھورا تھا اُسے آیا نے پورا کر دیا ——

راؤ بہادر بہال چندر جی جب راؤ بہادر نہیں تھے اور کالج میں پڑھتے تھے اس زمانہ میں وہ ایک دل پھینک، عاشق مزاج نوجوان تھے۔ انہوں نے ایک معصوم لڑکی کا جیون تباہ کیا تھا۔ پروفیسر دابھولکر کی اکلوتی نش پاپ مالتی کے حسن و شباب سے انہوں نے کھیلا تھا۔ اور اس کی مرضی کے خلاف اس بے بس لڑکی کا گوہر عصمت لوٹ لیا تھا۔ جب یہ قیامت خیز راز بوڑھے دابھولکر کو معلوم ہوا تو ان کا ہارٹ فیل ہو گیا اور نا سمجھ مالتی بہال چندر جی کے گناہ کا خمیازہ بھگتنے کے لئے بے سہارا، تنہا رہ گئی۔ بہال چندر جی نے مالتی کو رشوت دینی چاہی کہ وہ اپنے پیٹ میں بڑھنے والے پاپ کو ضائع کرنے پر راضی ہو جائے۔ لیکن مالتی نے ان کو اس گناہِ ثانی کا ارتکاب نہیں کرنے دیا۔ اور وہ اپنی

پہلی لغزش کو تاریکی میں رکھنے کی غرض سے روپوش ہو گئی۔ رات و رات وہ گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ پہلے تو اس نے ارادہ کیا کہ ریل کی پٹریوں پر لیٹ کر جان دے دے۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ خودکشی کرنے سے پیٹ میں پروان چڑھنے والے نشِ پاپ بالک کی جان بھی تلف ہو جائے گی۔ اگر مرنا ہی ہے تو اُسے جنم دے کر مرنا چاہیئے۔ اس خیال سے وہ ماری ماری پھرتی رہی۔ دیس چھوڑ کر پردیس میں جا بسی۔ در بدر کی ٹھوکریں کھاتی رہی۔ اس کا بے پناہ حسن اور اس کا شباب اس کی راہ میں کانٹے بن گئے۔ آوارہ لوگ اسے چھیڑنے لگے۔ اس بھولی چڑیا کے پھانسنے کے لئے نت نئے جال ڈالے جاتے۔ جہاں بھی ملازمت اختیار کرتی۔ مالک خانہ ہی کی بدنگاہی کا شکار ہونے لگتی۔ وہ اس کی خوبصورتی اور جوانی سے لطف اندوز ہونے کے متمنی ہوتے اور وہ بےبس اپنی لاج بچانے کی خاطر نوکری چھوڑ دیتی۔ آخر یہ سلسلہ کب تک چلتا۔ اُسے اپنی عزت کی حفاظت کرتے ہوئے جینا تھا۔ پیٹ کا دوزخ بھی بھرنا تھا جو حسن اور شباب کی موجودگی میں ایک ناممکن امر تھا۔ آخر اس ذلت سے کس طرح چھٹکارہ حاصل ہو۔ شباب تو وقت سے پہلے ڈھل نہیں سکتا لیکن چہرے کی خوبصورتی جو غیر مردوں کو اس کی طرف متوجہ کر دینے کا سبب بنا کرتی تھی اسے اس نے ختم کر دینے کا تہیّہ کر لیا۔ اور بڑی بے دردی سے اپنے چہرے کو بگاڑ لینے میں کامیاب ہو گئی۔ ایک اناڑی جرّاح کی طرح اس نے اپنے چہرے کو سنگ دلی سے زخمی کر ڈالا۔ حالانکہ بڑی اذیّت اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر زخموں کا علاج کرانے ڈاکٹروں کے پاس گئی لیکن بغیر فیس لئے کون مرہم پٹی کرتا۔ زخم دن بدن خطرناک صورت اختیار کرنے لگے۔ اس کی یہ ناگفتہ بہ حالت اور بڑھا ہوا

پیٹ دیکھ کر ایک فرشتہ صفت لیڈی ڈاکٹر کو اس پر ترس آیا۔ اس نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا اس کی مکمل رُوداد سُنی اور پوری دلچسپی سے اس کا علاج کرنے لگی جس روز مالتی کے ہاں بچّی پیدا ہوئی اسی روز اس لیڈی ڈاکٹر کے زچگی خانہ میں ایک عجیب واردات پیش آگئی تھی۔ غریب مالتی کے لئے تو اس کا اپنا پیٹ بھرنا ہی دُوبھر تھا پھر بھلا وہ اس نومولود بچی کی پرورش و پرداخت کی کیوں کر کفیل ہو سکتی تھی۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر لیڈی ڈاکٹر مالتی کے پاس ایک التجا لئے ہوئے آئی۔ اسے یقین تھا کہ جو احسانات اس نے اس خانہ بدوش لڑکی پر کئے ہیں ان پر اگر وہ ذرا بھی غور کرے گی تو اس کی اس درخواست کو قبول کرے گی۔ اور ہوا بھی ایسا ہی۔ مالتی نے بغیر کسی حیل و حجّت کے بچی اپنی محسن کے حوالے کر دی۔ صرف اس ایک شرط پر کہ جہاں اس کی بیٹی پروان چڑھنے والی ہے اُسی گھر میں اُسے آیا کی حیثیت سے دن کاٹنے دیئے جائیں ـــ اصل میں واقعہ یوں تھا کہ جس صبح مالتی نے لڑکی کو جنم دیا اُسی روز بیرسٹر اونکار ناتھ کی بیوی کی زچگی ہوئی۔ بڑا مشکل کیس تھا۔ بیرسٹر صاحب کی اجازت سے آپریشن کرنا پڑا۔ لیڈی ڈاکٹر کا خیال تھا کہ اس طرح وہ بچہ زندہ سلامت حاصل کرے گی۔ لیکن آپریشن صد فی صد ناکام رہا۔ بچّہ مردہ پیدا ہوا اور زچہ بھی جاں بحق ہوگئی۔ باہر بیرسٹر اونکار ناتھ خوش خبری سُننے کی آس لئے منتظر کھڑے تھے۔ ایسی حالت میں بھلا لیڈی ڈاکٹر کیا مونہہ لیکر ان سے ملتی۔ اس نے مالتی کی بچّی کو اس مردہ بچے کی جگہ رکھ دیا اور بیرسٹر صاحب کو اطلاع دی گئی کہ زچہ تو بچ نہ سکی پر بچّی سلامت ہے۔ بیرسٹر کے دل پر کاری ضرب لگی۔ لیکن یہ خوبصورت معصوم بچّی ان کے دل کے زخموں پر کارگر پھایا ثابت ہوئی۔ اور اس دن سے آج تک مظلوم مالتی اپنی ہی بیٹی کی آیا

بنی زندگی کے دن کاٹ رہی تھی ـــــ بہاں چندر کے باپ نے اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا ـــــ۔

آپا نے اس پراسرار کہانی کو کب ختم کیا مجھے محسوس تک نہ ہو سکا۔ میں سننے میں اس قدر منہمک تھا کہ بڑی دیر تک اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا جیسے کسی نے مجھے کرسی کے ساتھ جکڑ کر باندھ دیا ہو۔

"پریم! کیا اب بھی تو نے اپنی دیدی کو نہیں پہچانا؟" اس سوال نے مجھے چونکا دیا۔

آپا کے مجسمہ میں سے میری بچھڑی ہوئی دیدی بول رہی تھیں میں غور سے دیکھنے لگا۔ آنسوؤں کی لڑیوں میں سے دیدی کی جانی پہچانی دل کش آنکھیں مجھ پر خواہرانہ پیار برسا رہی تھیں۔

"معاف کرو دیدی ـــــ" میں انکساری سے بولا" میں نے بڑے ترش الفاظ استعمال کئے ہیں تمہاری شان میں۔ واقعی لیلا کی شادی میں ماں کی لپند کو ملحوظ رکھا جائے گا۔"

پھر میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اگلا قدم اٹھانے کے لئے مجھے مکند کی تصویر کی ضرورت تھی۔ لیکن لیلا کی عدم موجودگی میں صرف تصویر لے جانا میرے لئے مناسب نہیں تھا۔ اس لئے جس کتاب میں لیلا نے وہ تصویر رکھی تھی میں نے وہ کتاب تصویر سمیت اٹھالی اور پُر احترام نظروں سے دیدی کو دیکھتا ہوا بولا۔

"جب لیلا آئے تو اس سے کہہ دینا کہ میں یہ کتاب پڑھنے لے گیا ہوں۔ کل لوٹا دوں گا ـــــ۔"

دروازے تک جا کر میں رک گیا۔

"میں تم کو یقین دلاتا ہوں دیدی کہ یہ ناجائز شادی میں آج ہی رکوا دوں گا"

"اور۔ ہاں۔ پریم! مجبوراً مجھے یہ راز تجھ پر منکشف کرنا پڑا۔ بس میرے بھیا یہ تجھ ہی تک رہے۔" دیدی نے مجھے تاکید کر دی۔

اور میں مسکراتا ہوا دیدی سے رخصت ہو گیا۔

راستہ بھر میں یہی سوچتا رہا کہ ایک ہی گناہ ایک مرد اور ایک عورت سے سرزد ہوا ۔۔ مستزاد یہ کہ مرد ہی نے ظلم و استبداد سے عورت کی بے بسی سے فائدہ اٹھایا اور اس کی پاک زندگی کو گناہ آلودہ بنانے کا باعث بنا لیکن سماج نے عورت کو تو کہیں کا نہ رکھا اور مرد اُسی طرح سرخ رو ہے۔ اس کی زندگی میں ذرا بھی انتشار نہیں پیدا ہوا۔

سہ پہر کی چائے میں نے ضلع کلکٹر صاحب کے ساتھ پی۔

میں تو صرف ان سے ملاقات کرنے گیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر کچھ بوکھلا سے گئے تھے۔ جب میں نے انہیں لڑکپن کے واقعات یاد دلانے چاہیں تو وہ بڑی مکاری سے انجان بن کر رہ گئے۔ لیکن چونکہ میں لیلا کا پروفیسر تھا انہیں میرے ساتھ خلوص برتنا ہی پڑا۔ کمال چالاکی سے انہوں نے بات کا پہلو بدل دیا اور مجھ سے شریفانہ گفتگو کرنے لگے۔ پھر مجھے چائے بھی پیش کی اور لیلا کے بارے میں ایک ایک بات پوچھنے لگے۔ اپنی آنکھ کا شہتیر چھپائے وہ اس معصوم لڑکی کی آنکھ میں تنکا ڈھونڈ رہے تھے۔ میں نے لیلا کی ذہانت و فراست کے ساتھ ساتھ اس کی شرارتوں کی باتیں بھی انہیں سنا ڈالیں۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتے رہے اور درمیان میں قہقہے بھی لگاتے گئے۔

لیکن لیلا اور مکند کے تعلقات کا جو راز میں انہیں سنانے آیا تھا وہ

کامیاب ایٹم بم ثابت ہوا۔ اس راز کو سن کر وہ دل مسوس کر رہ گئے اور ان کا دیوان خانہ جہاں ابھی ابھی فلک بوس قہقہے گونج رہے تھے یک لخت مرگھٹ کی شکل اختیار کر گیا۔ بلکہ مرگھٹ سے بھی زیادہ کچھ اور کیوں کہ مرگھٹ میں تو صرف مردے ہی جلا کرتے ہیں اور یہاں وہ خود سلگ رہے تھے۔ تب دھواں نکلنا بھی ضروری تھا۔

جب میں نے مکند کی تصویر اور میرے نام لکھی ہوئی لیلا کی چٹھی انہیں دکھا دی تو ان کی طاقت گویائی ہی سلب ہو گئی۔ پھر وہ ایک لفظ تک نہ بولے کیونکہ میں نے زیادتی یہ برتی جو انہیں یقین دلا دیا کہ لیلا کو مکند.... خراب کر چکا ہے۔ اور وہ اس قابل نہیں رہی کہ ان جیسے شریف اور نیک انسان کی ازدواج کا اسے فخر بخشا جائے۔

اور میں ان سے اس وقت رخصت ہوا جب کہ ان کی زندہ لاش سے تعفن کا دھواں ایک خط کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جو انہوں نے اس رشتہ پر اپنی نارضامندی کا پیرسٹر اونکار ناتھ جی کو لکھا اور چپراسی سے اسی وقت بھجوا دیا۔

میں نے اس معصوم لڑکی پر تہمت لگائی ــــ صریحاً جھوٹا الزام لگایا ــــ لیکن اس تہمت کا نتیجہ ــــ اس جھوٹے الزام کا انجام جب اس معصوم لڑکی اور اس کی بے بس ماں کو معلوم ہوا ہوگا تو یقیناً وہ مجھے دعائیں دینے لگی ہوں گی ــــ

ایک پنتھ دو کاج

نئی دہلی کا اسٹیشن قریب آنے سے قبل ہمارے کمپارٹمنٹ کے دو مسافر اپنا اسباب سنبھالنے لگے۔ ان دونوں کو پہاڑ گنج جانا تھا۔ ان کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ "نئی دہلی اسٹیشن" سے "پہاڑ گنج" نزدیک ہے۔ لیکن ان کی باتوں سے میں کچھ پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ "پہاڑ" اور "دریا" کی الجھن میں میرا دماغ الجھ کر رہ گیا۔ پہاڑ گنج یا دریا گنج! مجھے بھی کسی "گنج" ہی کو جانا تھا۔ ان لوگوں کی باتیں سن کر میں سوچنے لگا کہ کہیں مجھے پہاڑ گنج ہی تو نہیں جانا ہے۔ میں اپنے کوٹ کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر روپ کرن کا خط جس میں ان کا پتہ درج تھا، میری کسی جیب میں موجود ہوگا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ شاید ان کا خط حیدرآباد سے نکلتے ہوئے میں گھر ہی میں اپنی میز پر بھول آیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کا نمبر ۹۹۹ مجھے اس لئے یاد رہ گیا تھا کہ نو کا ہندسہ اس میں تین مرتبہ موجود تھا۔ اور ان کی ۹۹۹ نمبر کی یہ کوٹھی "پہاڑ گنج" یا "دریا گنج"۔ ان "دو گنجوں" میں سے کسی "ایک گنج" میں واقع تھی۔ اور چونکہ میں پہلی دفعہ دہلی جا رہا تھا۔ ان "دو گنجوں" کے متعلق پوری تاریکی میں تھا۔ اس لئے ان دو مسافروں سے معلوم ہونے پر کہ پہاڑ گنج جانے کے لئے "نئی دہلی اسٹیشن" اترنا چاہیئے۔ بلکہ وہ تو یہ کہہ رہے تھے کہ پہاڑ گنج ہی کا نام

"نئی دہلی اسٹیشن" ہے پھر دل ہی دل میں سوچتا ہوا میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ چلو پہلے پہاڑ گنج ہی میں کوٹھی نمبر ۹۹۹ تلاش کریں ممکن ہے ڈاکٹر صاحب نے اپنے پتہ میں پہاڑ گنج ہی لکھا ہو۔ میرے یہ سوچتے ہی سوچتے گاڑی کی رفتار سست ہوگئی اور "نئی دہلی اسٹیشن" آگیا۔ ان دو ہم سفر مسافروں کے ساتھ میں نے بھی اپنا ہولڈال سوٹ کیس اور ٹیچی بالائی برتھ سے اتار کر نیچے رکھ لیا۔ دو چار قلی اندر آگئے تھے ان میں سے ایک کو اسباب اٹھانے کو کہتا ہوا میں نیچے اُتر گیا۔

نئی دہلی کا نام تو بڑا سنتے آئے تھے کہ وہاں والسرنگل لاج ہے کونسل ہال اور سکریٹری ایٹ ہیں یہ ہے وہ ہے۔ لیکن اسٹیشن دیکھ کر "بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا" کہہ کر رہ گیا۔ بارے قلی کے پیچھے اسٹیشن سے باہر نکلا تو عجیب دیہات کا سا منظر دیکھ کر ٹھنڈی سانس کے ساتھ "جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نکلا" بھی کہہ دینا پڑا۔ البتہ تانگے والے دیہاتی قسم کے نہیں تھے بلکہ بڑے چھٹے ہوئے اور بار تیز معلوم ہو رہے تھے قلیوں سے قریب قریب سامان جھپٹ کر اپنے تانگوں میں ٹھوس رہے تھے۔ قلی کی مزدوری دے کر مجھے اس تانگے میں سوار ہونا تھا جس میں کہ میرا اسباب لادا گیا تھا۔

"بنگلہ نمبر ۹۹۹ جانتے ہو؟" تانگہ میں سوار ہونے سے پہلے میں نے دریافت کر لینا ضروری سمجھا۔

"لیکن کونسی روڈ پر بابو جی!" تانگے والے نے گھوڑے کے آگے بکھری ہوئی گھاس سمیٹتے ہوئے کہا۔

"روڈ کا تو علم نہیں۔ مگر اتنا پتہ ہے کہ یہ بنگلہ یا تو پہاڑ گنج میں ہے یا دریا گنج میں۔" میں نے ٹھکانے کی وضاحت کر دی۔

تانگے کی سیٹ کے نیچے بچی ہوئی گھانس رکھتے ہوئے وہ بولا۔ "پہاڑ گنج کا تو سوا روپیہ دے دینا بابوجی۔ اور رہا دریا گنج وہ تو لال قلعہ سے ورے ہے۔ کوئی بات نہیں۔ آپ کی خاطر وہاں بھی چلیں گے۔ وہاں کے تین روپے دلا دینا۔"

"گویا کل میزان ہوا سوا چار روپے ــــ" میں نے طنز سے کہا۔

"خیر آپ سے ساڑھے تین ہی لے لیں گے۔" اس نے کہا اور اچھل کر تانگے میں بیٹھ گیا اور میرے سوار ہوتے ہی تانگہ چل پڑا۔

تانگہ کچھ اور منزل طے کر لینے پر بھی دہلی دیکھ کر طبیعت کچھ خوش نہیں ہوئی۔ نئی دہلی کا اسٹیشن تو پل کے نیچے تھا ہی سڑکیں بھی سڑکوں پر پل بنائے نیچے اوپر سے گذرتی ہوئی دکھائی دیں۔ تانگہ والا سو سوا سو یارڈ کا فاصلہ طے کر لینے کے بعد تانگہ روک کر راہ چلتوں اور دکان داروں سے پوچھ لیتا تھا کہ بھئی بنگلہ نمبر ۹۹۹ کہاں ہے۔ لوگ لاعلمی کا اظہار کر کے رہ جاتے۔ مجھے پہاڑ گنج کی گندی بستی دیکھ کر ہی شبہ ہونے لگا کہ ڈاکٹر روپ کرن جیسے نفاست پسند انسان ایسے مقام پر نہیں رہ سکتے۔ میں دل ہی دل میں "پہاڑ گنج" اور "دریا گنج" نام رکھنے والے "گنجے" کو گالیاں دینے لگا۔ صرف ایک ہی گنج ہوتا تو مجھے خواہ مخواہ مغالطہ میں پڑ کر اس طرح کوفت اٹھانی نہ پڑتی۔ بلکہ تانگہ والا کہنے لگا کہ ان دو گنجوں کے علاوہ یہاں اور بھی گنج ہیں مثلاً ڈپٹی گنج۔ کشن گنج وغیرہ وغیرہ۔ بڑی مسافت کاٹ لینے پر بھی بنگلہ نمبر ۹۹۹ لاپتہ تھا۔ ایک "تراہے" پر کچھ صفائی دکھائی دی۔ اور ایک خوش وضع مکان پر کسی ڈاکٹر کا بورڈ دیکھ کر کچھ آس بندھ گئی اور میرے اشارے پر تانگہ رک گیا۔ تانگہ ہی میں بیٹھے بیٹھے مہر

باہر نکال کر میں بورڈ پر کا نام پڑھنے لگا۔

"ڈاکٹر مسز کملا۔ ایس بھاٹیہ

ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ۔۔۔"

یہ نام پڑھ کر میں ناامید نہیں ہوا نیچے اتر کر اس مکان میں رہنے والی ڈاکٹر سے دریافت کرنے سے مشہور و معروف ڈاکٹر روپ کرن کا صحیح پتہ معلوم ہو جانے کا مجھے یقین تھا۔ ہر ہم پیشہ طبقہ آپس میں ایک دوسرے سے ضرور واقف ہوا کرتا ہے۔ اس خیال سے میں تانگے سے نیچے اترنے لگا کچھ تو میں نے عجلت برتی اور کچھ پائیدان تنگ تھا۔ جس کی باہر نکلی ہوئی ایک میخ میں پتلون اُلجھ کر رہ گئی اور قبل اس کے کہ سنبھلوں بری طرح نیچے گر پڑا۔ تانگہ والا گھوڑے کے پاس کھڑا اسے پچکار رہا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور دوڑا ہوا میرے پاس آکر مجھے اٹھانے لگا۔ اسی وقت ایک بسکٹی رنگ کی کار اس مکان کے سامنے آکر رکی۔ اس میں سے ایک سانولی رنگت کی جوان عورت ہاتھ میں اسٹیتھسکوپ لئے اُتری۔ وہ شاید سامنے والے مکان کے اندر جانا چاہتی تھی لیکن میری ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر پاس آگئی۔ وہی اس عالیشان مکان میں رہنے والی لیڈی ڈاکٹر تھی اس نے خود مجھے سہارا دیا اور اپنے ڈرائیور کو بھی بلانے لگی۔ میرے ٹخنے سے خون نکلتا دیکھ کر اس نے اپنے ڈرائیور سے کہا۔

"انہیں سہارا دے کر اندر لاؤ۔ میں ذرا ڈریسنگ کر دوں۔"

میں بھی اب سنبھل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ ڈرائیور اور تانگے والے کے ساتھ اندر جا پہنچا۔

کملا دیوی بھلا واقعی بھلی مانس تھی۔ اس نے نہایت احتیاط اور صفائی

سے میرے ٹخنے کی ڈریسنگ کر دی۔ کہاں سے آئے ہو کہاں جانا ہے، کیسے گر پڑے وغیرہ قسم کے رسمی سوالات پوچھنے کے علاوہ اس نے مجھے لسی کا ایک گلاس بھی پیش کیا۔ اس سے جدا ہونے سے پہلے میں ڈاکٹر روپ کرن کا پتہ پوچھنا نہیں بھولا۔ اس نے ڈاکٹر صاحب کا پرانا قرول باغ والا پتہ بتایا جہاں سے وہ پچھلے ہی ہفتے اپنی ذاتی کوٹھی نمبر ۹۹۹ میں منتقل ہو چکے تھے۔ میں نے سوچا کاش کہ وہ قرول باغ ہی میں رہتے کہ میں پہاڑ گنج اور دریا گنج کی اس جھنجھٹ سے بچ جاتا۔ میں نے کملا دیوی کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور دہلی چھوڑنے سے قبل دوبارہ ملنے کا وعدہ کرکے باہر نکل آیا۔

اس غیر متوقع حادثہ سے تانگہ والا بھی کچھ سہما ہوا اور پریشان سا دکھائی دے رہا تھا۔ بلکہ وہ قدرے شرمندہ ہی تھا کہ اس کے تانگے کا پائیدان شکستہ ہونے کی وجہ سے ہی مجھے یہ چوٹ کھانی پڑی تھی۔ خیر میں نے اسے کوئی ملامت نہیں کی۔ جلد سے جلد "۹۹۹ دریا گنج" پہنچا دینے کی استدعا کرتا ہوا تانگہ میں سوار ہو گیا۔ اجمیری دروازہ، حوض قاضی، چاوڑی بازار اور جامع مسجد سے گذرتے ہوئے اس نے مجھے منزلِ مقصود پہ پہنچا دیا۔ دریا گنج واقعی پُر فضا علاقہ ہے۔ حالانکہ یہ پرانی دہلی میں واقع ہے۔ اور کوٹھی نمبر ۹۹۹ تو بالکل بمبئی اسٹائیل پر تعمیر کی ہوئی نہایت عالیشان عمارت ہے۔ پھاٹک پر سنگ مرمر کے کتبہ پر کندہ ڈاکٹر صاحب کا نام پڑھ کر مجھے یک گونہ مسرت اور اطمینان ہوا۔ ہمارا تانگہ پھاٹک سے داخل ہو کر ولکش باغ کے بیچ میں بنے ہوئے دائرہ دار راستہ سے گذر کر پورچ میں جا رُکا۔

سب سے پہلے مجھ پر شکنتلا کی نظر پڑی۔

"اوہ ۔ پریم بابو!" اس نے چہکتے ہوئے کہا ۔ وہ سبد گل لئے باغ سے نکل رہی تھی ۔

"اری شکو ۔ تم تو سچ مچ بہت بڑی ہو گئی ہو" میں نے شکنتلا کو چھیڑنے کی غرض سے کہا " بالکل عورت دکھائی دے رہی ہو تم ۔ جبھی تو ڈاکٹر صاحب کو تمہاری شادی کی فکر ہوئی ۔"

شرمگیں مسکراہٹ سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا ۔

"میں اسٹیشن پر آپ کو لینے گئی تھی ۔ لیکن آپ کہیں دکھائی نہیں دئے تو بڑی ناامید ہو کر واپس آ گئی" ۔ وہ تانگے کے پاس آتی ہوئی بولی ۔ "آپ اندر تشریف لائیے ۔ میں پتاجی کو خبر کرتی ہوں" اور پھر برآمدے میں سے گذرنے والے ایک پہاڑی ملازم کو ہدایت کرنے لگی ۔ "رام سنگھ یہ اسباب اندر لیجاؤ" ۔

میں نے تانگے والے کو رخصت کیا اور شکو کے ساتھ دیوان خانہ میں داخل ہو گیا ۔ ریڈیو پر کہیں سے ستار کا پروگرام تھا اور ڈاکٹر روپ کرن سننے میں محو تھے ۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے ریڈیو کی آواز ہلکی کر دی ۔

"آئیے پریم بابو! تشریف لائیے ۔ سواگتم ۔ خوش آمدید ۔ ویلکم!"

وہ وظیفہ یاب ہونے پر بھی بالکل نہیں بدلے تھے ۔ وہی زندہ دلی اور بچوں کی سی شوخی ان میں موجود تھی ۔ میں شکنتلا کے ساتھ ان کے سامنے والے صوفہ پر بیٹھ گیا ۔

"لیکن گاڑی آئے تو کافی عرصہ ہو گیا ۔ دیوار پر لگے ہوئے گھنٹے کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا "شکو کو میں نے اسٹیشن پہ بھجوایا تھا ۔" اور وہ شکنتلا کی طرف دیکھنے لگے ۔ پھر مجھے کچھ بولنے کا موقع دئے بنا آگے بولے ۔ آپ کہیں

"دہلی جنکشن" کی بجائے "نئی دہلی" تو نہیں اتر پڑے تھے؟ یوں تو ہمارا مکان تلاش کرنے میں آپ کو دقت ہوئی ہوگی۔"

اور میں نے پتہ کا خط حیدر آباد بھول آنے اور پھر پہاڑ گنج اور دریا گنج کے مغالطہ میں پڑ کر "نئی دہلی اسٹیشن" اتر جانے اور پہاڑ گنج کی گندی گلیوں کی خواہ مخواہ خاک چھاننے کا واقعہ ایک لطیفہ کے پیرایہ میں سنا دیا۔

"میرا خط پاتے ہی آپ چلے آئے۔ بہت بہت شکریہ۔" ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "ایک بجے لنچ پر مسٹر سوم دت مدعو ہیں۔ آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔" پھر شکنتلا سے مخاطب ہو کر وہ بولے "بٹیا ذرا سوم دت جی کا فوٹو تو دکھاؤ پریم بابو کو۔"

اور میں نے دیکھا یہ سن کر شکنتلا کچھ خوش نہیں دکھائی دی۔ جیسے کوئی پلیس والا بیگار میں کسی تانگہ والے کو پکڑ لے اور بغیر اجرت دئے تین چار میل اسے گھسیٹتا پھرے تو جو حالت اس بے بس تانگہ والے کی ہوتی ہے شاید ویسی ہی شکو کی ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات سے دل کا حال پڑھ لیا اور بولا۔

"اب فوٹو دیکھ کر کیا کروں گا؟ جب سوم دت جی خود ہی تشریف لا رہے ہیں تو انہیں سے نیاز حاصل ہو جائے گا۔"

میرے جواب سے شکو بڑی مطمئن ہو گئی۔

سوم دت سے ملنے سے پہلے میں شکنتلا سے دو دو باتیں کرنا چاہتا تھا اس غرض سے میں نے صوفہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھئی شکو۔ ہمارے لئے کونسا کمرہ تجویز ہوا ہے بتاؤ۔ ذرا ہم

اپنی شکل انسان کی سی تو کر لیں۔"

"ہاں بیٹی۔ ان کو اوپر لے جا کر جہاں ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا ہے بتا دو۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ لیکن پھر ملازم کو چائے کی کشتی لاتے دیکھ کر بولے۔ "لیکن چائے میں تو میرا ہاتھ بٹائیے ——"

اور پھر ہم دونوں کو ایک ایک پیالی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ پینی پڑی۔

میرے لئے بالائی منزل پر نہایت شاندار اور روشن کمرہ مخصوص کیا گیا تھا جو قیمتی مغربی طرز کے فرنیچر اور تصاویر سے آراستہ تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی دل باغ باغ ہو گیا۔ شکنتلا کمرے کی ہر چیز دکھانے لگی۔ باتھ روم بتا دینے کے بعد متوقع طور پر میرے پاس بیٹھ کر وہ باتیں کرنے لگی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بھجوائے ہوئے ملفوف نامہ میں وہ انگشت کی ایک چٹھی ڈال کر اپنی رائے سے اس نے مجھے مطلع کر دیا تھا۔ وہ سوم دت سے شادی کرنے کے لئے مطلق تیار نہیں تھی۔ اب بھی مختصر سی گفتگو کر کے اس نے اپنے ارادہ سے آگاہ کر دیا۔ پھر چپکے سے ایک تصویر مجھے دکھائی۔ چہرے پر شوخ مسکراہٹ لئے میرا عندیہ معلوم کرنے کی غرض سے اپنی کٹورہ سی آنکھیں اس نے میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

ایک شکیل نوجوان کی تصویر تھی وہ۔ جو شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

"واقعی ایسے خوبصورت نوجوان سے شادی کرنے میں تمہیں پس و پیش نہیں کرنا چاہیئے۔" میں نے خوش ہو کر تصویر کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر دی۔

"لنچ پر میں آپ کو ان سے متعارف کراؤں گی ——" وہ عورتوں کی طرح شرماتی ہوئی بولی۔

"پھر شادی سے تمہیں انکار کیوں ہے شکو؟" تصویر اسے دے کر میں نے

حیرانگی سے پوچھا۔ اور اپنی ٹائی کی گرہ کھولنے لگا۔

"یہ میں نے کب کہا کہ مجھے ان سے شادی کرنے سے انکار ہے؟" وہ مسکراتی ہوئی پوچھنے لگی۔ اور پھر کوڈک کے ایک لفافہ سے ایک اور تصویر نکال کر مجھے دیتے ہوئے بولی" اور یہ ملاحظہ فرمائیے۔"

اس کے اس چھوٹے سے جملہ میں طنز کا شائبہ تھا۔

میں نے تصویر لے لی اور دیکھنے لگا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

"یہ کس کی تصویر ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی ہیں پتاجی کے پسندیدہ حضرت مسٹر سوم دت!" اس نے اسی طنز سے کہا۔

"پھر وہ نوجوان کون تھا؟" میں نے استعجاب سے پوچھا۔

"مسٹر سدھاکر۔ جن سے میں آپ کو نیچ پر متعارف کراؤں گی۔" وہ انگ انگ سے خوشی چھلکاتی ہوئی بولی۔

"شریر کہیں کی!" میں نے سوم دت کی تصویر اُسے دیتے ہوئے کہا۔ "بچپن ہی سے تم ضدی ہو!"

میں کوٹ اتار کر صوفہ پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے کوٹ لے کر ہینگر پر لٹکا دیا اور میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"پریم بابو! جب پتاجی سوم دت کو اقراری جواب دینا چاہتے تھے تو میں نے ان سے گذارش کی کہ وہ پہلے آپ کی رائے معلوم کریں۔ اور میرے ہی مشورہ سے انہوں نے آپ کو خط لکھ کر بلا لیا۔ ان کے لفافہ میں چھوٹی سی پرچی ڈال کر میں نے اپنی رائے بھی لکھ دی تھی۔ اور آج اپنے انتخاب اور

اپنی پسند سے بھی آپ کو آگاہ کر چکی ہوں۔ مجھے نہ صرف امید ہے بلکہ یقین ہے کہ آپ میری مدد فرمائیں گے اور پتاجی کو راضی کریں گے۔" وہ آس بھرے نینوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

اس کی اس گفتگو اور انداز تکلم سے مجھے اس کا بچپن یاد آگیا۔ اس کے پتاجی، ڈاکٹر روپ کرن صاحب جب حیدرآباد میں نظام کی فوج میں میجر تھے، ان دنوں میں شکنتلا کو پڑھایا کرتا تھا۔ اس کی شرارت، ذہانت اور فراست سے محظوظ ہوا کرتا تھا۔ ان دنوں ہی یعنی آج سے کوئی آٹھ سال قبل میں نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیشین گوئی کر دی تھی کہ یہ شکو بڑی ضدی لڑکی نکلے گی۔ انہیں شکو کے لئے بر تلاش کرنے کی غرض سے بھارت ورش کی خاک چھاننی نہیں پڑے گی۔ بلکہ اس سلسلہ میں تو انہیں بالکل بے فکر بیٹھے رہنا چاہیئے۔ شکو خود ہی اپنا پتی آپ ڈھونڈ نکالے گی۔ انہیں دنوں جب کہ شکنتلا دس گیارہ سال کی ہوگی میں اس کی ہٹ دھرمی اور خود داری سے واقف ہو چکا تھا۔ اس کے بعد مزید تین سال میں اسے پڑھاتا رہا تھا بعدہ ڈاکٹر صاحب وظیفہ لیکر اپنے آبائی وطن دلّی میں آ بسے تھے۔ آج شکو انیسویں سال میں قدم رکھ رہی تھی۔ اس نے بی اے میں بڑی شاندار کامیابی حاصل کی تھی۔ اور ڈاکٹر صاحب نے مسٹر سوم دت کو اس کا پتی ہونے کے لئے انتخاب کیا تھا۔ جس طرح شکنتلا میرا احترام کرتی تھی، ڈاکٹر صاحب بھی میرے ساتھ بڑی عزت سے پیش آتے تھے۔ انہوں نے مجھے دہلی بلا لیا کہ میں بھی ایک نظر سوم دت کو دیکھ لوں، مختصر بات چیت کر کے، چہرے بشرے سے اندازہ لگاؤں کہ آیا وہ شکو کا جیون ساتھی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں! حالانکہ ان کے معیار پر وہ پورا پورا اتر چکا تھا۔ شریہ شکنتلا نے میری رائے کو

ملحوظ رکھنے کا مشورہ ایک چال چلنے کے لئے دیا تھا کہ مجھے دہلی بلوا کر میری مدد سے وہ اپنی "من مانی" کرا سکے۔ اور اب اس نے مجھ پر اپنا دل آئینہ کر دیا تھا۔
"مسٹر سارتھا کر کیا کرتے ہیں؟" زیر لب مسکراتے ہوئے میں نے دریافت کیا۔
"انہوں نے اسی سال ایم اے پاس کیا ہے اور ایک نیوز ایجنسی میں کام کرنے لگے ہیں۔" چہچہاتی ہوئی وہ بولی۔
"کیا عمر ہو گی ——؟" میں نے اس کی مسرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پوچھا۔
"پرسوں ان کی چھبیسویں سال گرہ منائی گئی ——" وہ چہرے پر شادمانی اور آنکھوں میں تبسم لئے دیوانہ وار جھومتی ہوئی بولی۔
"اور سوم دت؟" میں نے ریکارڈ کا دوسرا رخ سننا چاہا۔
"ایک بیمہ کمپنی میں انسپکٹر ہیں۔ عمر ہو گی کوئی بتیس سال سے اوپر۔"
اس نے ایسے لہجہ میں کہا گویا کوئی جیلر کسی قیدی کے حالات بتا رہا ہو۔
شکنتلا نے وہی بتایا جو ڈاکٹر صاحب نے اپنے خط میں مجھے لکھا تھا۔ سوم دت کی عمر لکھتے ہوئے شاید ڈاکٹر صاحب خود مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے صراحت میں مزید دو جملے لکھنا ضروری سمجھے تھے۔ وہ رقمطراز تھے۔
"سوم دت جی برہمچاری رہنے کے ارادے سے اب تک کنوارے رہے ہیں۔ پچھلے دنوں جب میری پالیسی پوری ہوئی اور رقم کی ادائیگی کے سلسلہ میں انہیں مجھ سے اور شکو سے ملنے کے اکثر مواقع ملتے رہے تو شکو کے حسن اور قابلیت سے یہ برہمچاری جی بڑے متاثر ہوئے۔ چٹان سے بہ نکلنے والے

دلآویز بھرنے کے مترادف ان کے من سے پریم دھارا پھوٹ نکلی۔ قدرے خوف اور جھجک سے انہوں نے دبے الفاظ میں ایک روز اپنے من کا بھید مجھ پر ظاہر کر دیا۔ بہر حال آدمی مجھے پسند آیا۔ آپ بھی ان سے مل کر اظہارِ پسندیدگی فرمادیں گے۔"

ڈاکٹر صاحب کے خط کی اس عبارت سے ممکن تھا کہ میں حیدرآباد ہی میں بیٹھا ہوا ان کی رائے سے متفق ہو جاتا اور انہیں دو لفظوں میں لکھ بھیجتا کہ وہ مجھ سے زیادہ تجربہ کار اور جہاں دیدہ ہیں ان کی رائے سے مجھے پورا اتفاق ہے۔ یا رسمی طور پر سوم دت جی سے ملاقات کرنے کا ناٹک کر کے صدفی صد اُسے شکنتلا کے قابل گردان دیتا۔ ... لیکن شکو نے اپنے پتا جی کی چٹھی میں لپیٹ کر جو ننھا سا پرچہ ملفوف کر دیا تھا وہ کارگر حربہ ثابت ہوا۔ اسے پڑھ کر میں اپنی تمام مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر دہلی پہنچ گیا تھا۔ اور اب سدھا کر کی تصویر دکھا کر شکنتلا نے مجھے مداخلت کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں سوچنے لگا چاہے سوم دت کے سُرخاب کے پر لگے ہوں یا اس کی صورت پر چاند تارے جڑے ہوئے ہوں۔ چاہے وہ لکھ پتی کروڑ پتی ہوتے ہوئے بڑا ہی شریف اور با اخلاق انسان ہو، لیکن شکو کی ناپسندیدگی پر یہ ساری صفات ہیچ ہیں۔ شکو کی خوشی ہماری خوشی ہوگی۔ شکو کی رائے کو ہم درگذر نہیں کر سکتے۔ اس خیال کے تحت شکو کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے تسلی بخش لہجہ میں کہا۔

"بہت خوب ہے۔ تم کو ہم سے جیسی امید ہے ویسا ہی ہوگا۔"

ابھی ابھی کھلے ہوئے پھول کی طرح شکنتلا تر و تازہ ہو گئی۔

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے سفر کے کپڑے بدل ڈالے اور شیو بنانے

لگا۔ اس دوران میں بھی یہی مسئلہ زیر غور تھا کہ کون سا قدم اٹھایا جائے کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔ شیو بنا چکنے کے بعد تولئے سے چہرہ صاف کرتے ہوئے میں سامنے والے باغ کی سمت کھلنے والی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ باغ کا منظر کس قدر دلکش اور شاداب تھا۔ دلفریب کیاریوں میں لہلہاتے ہوئے سرسبز پودوں اور گول شاہراہ کا نظارہ بالائی منزل پر سے بڑا ہی پر لطف اور روح افزا دکھائی دے رہا تھا۔ میں اس منظر کو دیکھنے میں ہمہ تن محو تھا کہ سامنے والے پھاٹک پر ایک کار آکر رک گئی۔ اگر اس کار کا رنگ لیمنی نہ ہوتا تو میں اس طرف کوئی خاص توجہ نہ دیتا۔ لیکن وہ گاڑی نئی تھی اور رنگ اس کا لیمنی تھا۔ اس لئے میں بڑے غور سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس گاڑی کا دروازہ کھلا اور ایک دیوی اس میں سے اتریں اور پھاٹک پر آویزاں کتبہ پڑھتی ہوئی کوٹھی کی سمت دیکھنے لگیں۔ ان دیوی جی کو اور ان کے اس لیمنی رنگ کی کار کو پہچاننے میں مجھے زیادہ وقت ضائع کرنا نہیں پڑا۔ ہاں۔ وہی بالکل وہی۔ میری آنکھوں نے کہا اور دل نے یقین کر لیا۔ ڈاکٹر مسز کملا ایس بھلہ ۔۔۔ میری محسن! تانگہ سے میرے گر پڑنے کے بعد جنہوں نے انسانیت کا برتاؤ کر کے میرے ٹخنے کی ڈریسنگ کی تھی اور ایک لسی کے گلاس سے مجھے نوازہ تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ میں فیس ادا کر کے ڈریسنگ کرانے کے قابل نہ تھا یا لسی کا ایک گلاس نایاب تھا بلکہ میں ان کے حسن اخلاق اور حسن سلوک سے حد درجہ متاثر ہوا تھا۔ اب انہیں اس وقت سامنے پھاٹک پر کھڑے دیکھ کر مجھے شبہ ہوا کہ میں ان کے ہاں کوئی چیز بھول آیا ہوں اور ممکن ہے اسے لوٹانے وہ میری تلاش میں ڈاکٹر صاحب کے

سابقہ پتہ پر قرول باغ ہو آئی ہوں جہاں ڈاکٹر صاحب کا موجودہ پتہ معلوم کر کے انہیں میری چیز لوٹانے یہاں تک آنا پڑا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنے اس وقت کے حلیے پر ذرا غور نہیں کیا اور اسی حالت میں تیزی سے نیچے اتر کر پھاٹک پر جا پہنچا۔

"اوہ۔ آپ!" مجھے دیکھتے ہی ان کے مونہہ سے نکلا۔

ان کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ یہاں میری تلاش میں ہرگز نہیں آئی تھیں۔ کسی اور بات کا کھوج لگانے یہاں تک آنے کی انہوں نے زحمت فرمائی تھی "لیکن آپ کیسے تشریف لائیں؟" میں نے اپنا شبہ دور کرنے کی غرض سے پوچھا۔

ان کو سوچ بچار میں مبتلا پا کر اور پھر ان کا جواب سن کر میرا یہ قیاس صریحاً غلط ثابت ہوا کہ کوئی چیز جو میں ان کے ہاں بھول آیا تھا اسے لوٹانے کے لئے انہوں نے یہاں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ اصل میں ہماری فلمیں ہی ہمارا دماغ خراب کر دینے کا سبب بنتی ہیں۔ جیسا کہ ہماری فلمی کہانیوں میں ایک مرد کی ایک عورت سے دوبارہ ملاقات کرانے کی خاطر منظر کشی کی جاتی ہے کہ مرد کوئی چیز عورت کے ہاں چھوڑ آیا یا عورت اپنا نفیس پرس بھول آئی جسے لوٹانے کے بہانے وہ ایک دوسرے سے ملاقات کا دوبارہ شرف حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن میرے معاملہ میں ہمارے فلمی کہانی نویسوں کی یہ تک بندی جھوٹی ثابت ہوئی۔ کملا دیوی نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے مجھ سے پوچھا۔

"کیا یہاں شکنتلا نام کی کوئی کالج کماری رہتی ہے؟"

"جی ہاں۔ آئیے۔ اندر تشریف لائیے۔" میں نے ان کا استقبال کرنے کے

انداز میں کہا۔ غرض میں کسی طرح ان کے کام آ کر ان کے احسان سے سبکدوش ہونے کے لئے بے قرار تھا۔ لیکن انہوں نے فی الفور اندر تشریف لا کر ان کا تعارف شکنتلا سے کرانے کا مجھے فخر نہیں بخشا وہ ویسے ہی کھڑی کچھ سوچتی رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ذہنی الجھن میں وہ مبتلا ہیں۔ اپنے دل میں کوئی بھید لئے ہوئے۔ جو مجھ پر منکشف کیا جائے یا نہیں اسی ادھیڑ بن میں وہ میرے مقابل کھڑی ہوئی تھیں۔

"فرمائیے۔ کیا میں آپ کی کچھ سیوا کر سکتا ہوں؟" میں نے گویا دوبارہ انھیں یاد دلایا کہ میں ان کے احسان کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں جس کے بدلے ان کی ہر خدمت کرنے کو تیار ہوں۔

ان کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہیں اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ انہیں اندر لے جا کر بٹھاؤں اور دل کھول کر باتیں کرنے دوں۔ لیکن وہ اندر آنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ وہیں باغ میں ایک سنگِ مرمر کی بنچ پر بیٹھ کر ہم باتیں کرنے لگے۔

مسز کملا بھلہ نے ایک عجیب و غریب راز کا انکشاف کیا جسے سُن کر مجھے تعجب اتنا نہیں ہوا جتنی کہ مسرت ہوئی۔ مسرت اس لئے ہوئی کہ ایک پنتھ دو کاج کی مصداق اب شکنتلا کی مدد کرنے کے لئے میں کیل کانٹے سے لیس ہو چکا تھا اور ڈاکٹر کملا دیوی کا احسان اتارنے کا بھی موقع مل رہا تھا۔ اور حیرت تو ہونی ہی چاہیے تھی کہ وہ حیرت ناک بات تھی۔

انہوں نے مجھے اپنی ایک سہیلی کا خط بتاتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ خط مجھے صبح ہی مل گیا ہوتا تو میں آپ کو ڈاکٹر صاحب کا موجودہ

پتہ بتانے کے علاوہ آپ کے ہمراہ ہی یہاں آجاتی لیکن آپ کے چلے آنے کے بعد ڈاکیہ نے یہ لا کر دیا۔ اور مجھے یقین ہے کہ میری اس سہیلی نے صحیح خبر دی ہے۔ اگر ممکن ہو سکے تو آپ میری مدد فرمائیے۔"

میں نے ان کے سامنے ایک تجویز پیش کی اور انہیں ڈیڑھ بجے اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دے دی جسے انہوں نے تھوڑی جھجک کے بعد قبول کر لیا اور رخصت ہو گئیں۔

باتھ روم میں جانے سے قبل میں نے ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دینی ضروری سمجھی۔ وہ سیڑھیوں کے پاس ہی مل گئے۔

"ڈاکٹر صاحب! لنچ پر میرے ایک دوست بھی ہوں گے۔" میں نے مسکراتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

وہ بچوں کی طرح چہکتے ہوئے بولے "بہت خوب! اسی کی کسر رہ گئی تھی۔ شکو کا ایک دوست سدھاکر بھی آنے والا ہے۔ میری جانب سے مسٹر سوم دت مدعو ہیں۔ رہ گئے تھے آپ! تو آپ کے دوست بھی تشریف لا رہے ہیں۔ بھئی خوب!!"

اتنے میں شکنتلا بھی وہاں آگئی اسے سنانے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے دوبارہ ان جملوں کی ریہرسل کی۔ اور ہنستے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

میں نے شکنتلا کو اوپر بلا لیا اور معاملہ سے آگاہ کر دیا۔ چند منٹ ہم دونوں ساز باز کرتے رہے۔ وہ بے حد خوش ہو گئی۔

لنچ کا وقت قریب آتے ہی ہم دیوان خانہ میں اکٹھے ہو کر لگے اپنے اپنے مہمانوں کا انتظار کرنے سب سے پہلے جب کہ ایک بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے ایک کار آئی جس کا رنگ سبکی تھا۔ لیکن اس کار میں سے سوم دت اترے۔ ہم ان

کے استقبال کے لئے پورچ میں جا پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے معزز مہمان سے میرا تعارف کرایا۔ کبھی میں سوم دت کو اور کبھی اس بسکٹی رنگ کی کار کو دیکھنے لگا کیونکہ اس کار کو میں آج تیسری دفعہ دیکھ رہا تھا۔ وہی کار وہی رنگ، وہی نمبر — اس مرتبہ اگر کوئی چیز بدلی تھی وہ صرف سواری تھی۔

سوم دت کے چہرے پر مجھے وہ تروتازگی اور جلال ڈھونڈے سے نہیں ملا جو ایک کنوارے یا برہمچاری پرش کے پُرنور چہرے سے عیاں ہوتا ہے۔ اور نہ صحت سے وہ کوئی خاص تندرست آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ بلکہ چند گھنٹے پہلے دیکھی ہوئی اس کی تصویر ہی گوارہ تھی۔

پھر ٹھیک ایک بجے ایک موٹر سائیکل دندناتی ہوئی پورچ میں آکر رکی۔ اور مسٹر سدھاکر کو لیتے ہیں، ڈاکٹر صاحب اور شکو کے ہمراہ باہر آیا۔ وہ ہنس مکھ نوجوان شوخی سے مسکراتا ہوا۔ ہاتھ جوڑے ہوئے نمستے کرنے لگا۔ اس سے بھی مجھے تعارف حاصل ہوا۔ سوم دت اندر ہی صوفہ پر ڈٹا ہوا تھا۔ اندر پہنچنے پر سوم دت اور سدھاکر کو باہم متعارف کرایا گیا۔ سدھاکر کے پر شباب دلکش چہرے اور تندرست ڈھانچہ سے سوم دت کچھ مرعوب سا ہو گیا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے سامنے والے صوفہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ سدھاکر میرے ساتھ جس صوفہ پر بیٹھا اسی پہ شکنتلا بھی بیٹھ گئی۔ چونکہ دعوت کا وقت ٹھیک ایک بجے کا تھا اس لئے سوم دت اب بار بار کلائی پر کی گھڑی دیکھنے لگا۔ میں نے تو دانستہ طور پر ہی کملا دیوی کو ڈیڑھ بجے کا وقت دیا تھا۔ اور اس سازشی ڈرامہ میں جو کہ اب کھیلا جانے والا تھا شکنتلا بھی شریک تھی۔ میرا اشارہ پاتے ہی وہ کہنے لگی۔

" پتا جی نے پریم بابو کا تعارف کراتے ہوئے بخل سے کام لیا ہے۔ انہوں

نے معزز مہمانوں سے صرف یہی کہا کہ پریم بابو ایک پروفیسر ہیں اور حیدرآباد میں رہتے ہیں۔ اور یہ کہنا تو بھول ہی گئے کہ پریم بابو افسانہ نگار بھی ہیں۔"

"بھئی معاف کرنا،" ڈاکٹر صاحب قدرے خجالت سے بولے۔" پریم بابو وہی بڑی مزیدار کہانیاں لکھتے ہیں۔ لیکن کہانیاں اور افسانے لکھنے والے بھی تو کالج ہی کی تخلیق ہیں۔ جہاں کہ پروفیسر تعلیم دیتے ہیں۔ اس لئے شاعر اور افسانہ نگار پر میں پروفیسر کو فوقیت دیتا ہوں لہٰذا میں نے تعارف میں صرف پروفیسری ہی کہہ دینے پہ اکتفا کیا۔"

"لیکن دعوت کا ایک مہمان ابھی تک نہیں آیا۔" شکنتلا نے کہا۔ اور آگے وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ سوم دت طنز سے بولا۔

"ممکن ہے یہ آنے والا مہمان کوئی شاعر یا افسانہ نگار ہی ہو۔ کیونکہ ان لوگوں کی نظر میں وقت کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ لوگ ہر بات میں لاپرواہ ہوتے ہیں ——" اور وہ داد حاصل کرنے کی غرض سے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھ پر نظر ڈالی۔ وہ آنے والے مہمان کے متعلق پوری تاریکی میں تھے۔ لیکن شکنتلا چپ رہنے والی اسامی نہیں تھی۔ اور گفتگو کے اس طرح پلٹا کھا جانے سے ہماری سازش کی تمہید ہی غلط ہونے کا خدشہ تھا۔ وہ کہنے لگی۔

"خیر! پریم بابو کے سوا آج کی دعوت میں اور کوئی افسانہ نگار مدعو نہیں ہے اور نہ ہی آنے والا مہمان شاعر ہے۔ اور پریم بابو وقت سے پہلے ہی آ گئے تھے۔ اس لئے آپ کی یہ چوٹ موزوں نہیں۔ نہ جانے ہمارے مہمان کو غیر معمولی دیر کیوں ہو گئی؟ بہرحال انتظار کرتے ہوئے وقت گذاری کا کوئی ذریعہ تو چاہیئے۔ ریڈیو

اور گراموفون سنتے سنتے تو کان تھک گئے ہیں۔ اس لئے میں پریم بابو سے استدعا کرتی ہوں کہ وہ ایک کہانی سنائیں ——"

"میں اس بات کی تائید کرتا ہوں ——" سدھاکر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی" ڈاکٹر صاحب بھی شکنتلا کے لفظوں کو تولتے ہوئے بولے۔ "گو قصے کہانیوں سے مجھے گہری دلچسپی تو نہیں۔ پھر بھی میں پریم بابو کا ہر افسانہ شوق سے پڑھا کرتا ہوں اگر اس وقت بھی پروفیسر صاحب کوئی دلچسپ کہانی سنائیں تو میں اور میرے معزز مہمان بڑی مسرت سے سنیں گے ——"

سوم دت اپنی نشست پر پہلو بدل کر رہ گیا۔ شاید وہ دو چار روز سے اس دعوت کے لئے فاقہ کئے ہوئے تھا۔ اس کی بے قراری سے مزہ لیتے ہوئے میں نے کہا۔ "اچھا! جب سب ہی کا اصرار ہے تو کچھ نہ سنانا میری بداخلاقی ہوگی۔ وقت کا لحاظ کرتے ہوئے میں ایک چھوٹی سی لیکن دردناک کہانی سناتا ہوں سنئے۔"

اور میں نے پرانے زمانہ کے قصہ گو کا موڈ اختیار کر کے کہانی کا آغاز کر دیا۔

"ایک شہر میں، فرض کر لیجئے اسی دلی شہر میں ایک لیڈی ڈاکٹر رہتی تھی۔ وہ زیادہ خوبصورت تو نہیں تھی لیکن حسین سیرت ضرور تھی۔ اپنے پیشہ میں ماہر ہونے کی وجہ سے اس کی پریکٹس ایسی زبردست تھی کہ اس نے قلیل ترین عرصہ میں شہرت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک کار خرید لی اور ذاتی کوٹھی تعمیر کروالی۔ اس کے علاوہ بنک میں اس کا کافی روپیہ جمع تھا۔"

"کیا وہ شادی شدہ تھی ——؟" شکنتلا نے بچوں کے انداز میں پوچھا۔

"سنتے جاؤ بیٹی" ڈاکٹر صاحب بولے۔ "بیچ میں بولنے سے کہانی کا لطف

جاتا رہتا ہے۔" وہ شاید اپنی ہم پیشہ لیڈی ڈاکٹر کی کہانی پوری دل چسپی سے سُن رہے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب ٹھیک فرماتے ہیں شکنتلا۔ تم چپ بیٹھی سنتی رہو۔" میں نے بھی اسے ٹوک دیا۔

"اچھا صاحب۔ آپ سنائیے اب نہ بولوں گی"۔ شکو نے گالوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بناوٹی خفگی سے کہا۔

"ہاں۔ تو وہ کنواری تھی ——" میں نے پھر کہانی شروع کر دی۔ "دلی میں ایک نوجوان دمے کا مریض تھا۔ اس کا جب لیڈی ڈاکٹر نے علاج کیا تو وہ حد درجہ خوش ہوا۔ اور اس سے تعلقات بڑھاتا گیا۔ پھر ان میں دوستی ہو گئی۔ وہ نوجوان خاصا تعلیم یافتہ تھا۔ لیکن تھا بے روزگار۔ گاہے گاہے لیڈی ڈاکٹر اس کی مالی مدد بھی کرنے لگی تھی۔ اس کا بنک بیلنس دیکھ کر ان حضرت کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اور مونہہ میں پانی بھر آیا۔ محض اس کی دولت اینٹھنے کے لئے فریب کا جال بچھا کر اس مکار نے اس سے شادی کر لی۔"

"کیا تب بھی وہ نوجوان بے روزگار ہی تھا ——؟" شکو پھر پوچھ بیٹھی۔

اب کی بار ڈاکٹر صاحب نے اسے منع نہیں کیا۔ میں ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سوم دت کی طرف دیکھ رہے تھے جس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔ اسے نظر انداز کر کے میں نے اپنی کہانی جاری رکھی۔

"جی نہیں۔" شکو کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا۔ "لیڈی ڈاکٹر کی سفارش پر اس نوجوان کو ایک بیمہ کمپنی میں کام مل گیا تھا۔"

سوم دت بے چینی سے صوفہ پر پہلو بدلتے ہوئے رُومال سے بار بار چہرہ صاف کرنے لگا۔ بھلا اپنے ہونے والے داماد کو اضطراب میں دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کیوں

چپکے بیٹھتے ۔ساری عمر مریضوں کا علاج کرنے میں صرف کر دی تھی انہوں نے ۔تڑپ کر بیٹے۔

"سوم دت جی! کہیں آپ کے دشمنوں کے مزاج تو خراب نہیں؟"

" آپ کہانی جاری رکھئے ۔بڑی دل چسپ کہانی ہے۔" شکونے اصرار کیا۔

" ڈاکٹر صاحب نے ایک غضب ناک نگاہ بیٹی پر ڈالی اور اٹھ کر سوم دت کے پاس جا بیٹھے۔

میں نے اپنا بیان جاری رکھا۔

" وہ دونوں، یعنی لیڈی ڈاکٹر اور بیمہ انسپکٹر مزے میں دن بتا رہے تھے۔ بھگوان کی دیا سے ایک چاند سی بچی بھی پیدا ہو گئی تھی۔لیڈی ڈاکٹر اپنی نئی کار جس کا رنگ بسکٹی تھا اپنے شوہر کو استعمال کرنے دیتی تھی اور یہ صاحب بڑے ٹھاٹھ سے اس کار میں سوار ہو کر پھرتے تھے۔اور لوگوں کو فریب دیتے تھے......"

"بند کرو۔ ایسی واہیات کہانی میں سننا نہیں چاہتا۔" توپ کے گولے کی طرح سوم دت پھٹ پڑا۔

"لیکن میں کہانی پوری سننا چاہتی ہوں۔" شکنتلا نے تنک کر کہا۔ "کہانی پوری کیجئے، پریم بابو۔"

میں نے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ مجسم استعجاب بنے صوفہ سے ٹیک لگائے چھت میں لگے ہوئے درمیانی رفتار سے چلنے والے پنکھے کو گھور رہے تھے۔ شاید ان کے دماغ میں کچھ کچھ روشنی پڑنے لگی تھی۔

میں نے پھر کہانی شروع کر دی۔

" ہاں تو وہ بیمہ انسپکٹر عوام کو فریب دیتا تھا۔ اور یہ ظاہر کرتا تھا کہ

وہ ابھی کنوارہ ہی ہے۔ یہ بسکٹی رنگ کی نئی گاڑی اس نے اپنی حلال کمائی سے خریدی ہے۔ بنک میں کثیر تعداد میں اس کا روپیہ جمع ہے۔ لیکن بھگوان کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک دن کسی رئیس کے ہاں پنچ پر اچانک دونوں مدعو ہوئے۔ بیمہ انسپکٹر کو مطلق معلوم نہ تھا کہ اس دعوت میں اس کی بیوی بھی تشریف لا رہی ہے۔"

سوم دت خوف زدہ نگاہوں سے دروازہ کی سمت دیکھنے لگا جہاں پردہ لہرا رہا تھا اور گاہے پورچ میں کھڑی ہوئی بسکٹی رنگ کی کار کی جھلک بھی دکھا دیتا تھا۔ دیر سے آنے والے مہمان کو اب شاید وہ پہچان چکا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر صوفہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے اجازت دیجئے۔ میں اس قدر توہین برداشت نہیں کر سکتا۔"

لیکن ڈاکٹر صاحب نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ یہ کہانی وہانی محض سوانگ ہے اصل میں کسی کا کچا چٹھا کھولا جا رہا ہے۔ وہ سنجیدگی سے بولے

"ایک فرضی کہانی سے تم کیوں پریشان ہوئے جاتے ہو؟ تم میرے مہمان ہو بیٹھو۔ اب کھانا کھا کر ہی جانا۔"

ہم سب نے محسوس کیا کہ انھوں نے سوم دت کو پہلی دفعہ بجائے "آپ" کے "تم" سے مخاطب کیا۔

سادھا کر بھی حیران تھا کہ کہیں یہ کہانی ان حضرت کی چالبازیوں کو تو بے نقاب نہیں کر رہی! اس نے سوم دت کو ظاہراً بڑے احترام سے صوفہ پر بٹھالیا اور مجھ سے کہنے لگا۔

"بھئی اب بھوک لگ رہی ہے۔ آپ کہانی جلدی ختم کیجئے تو بہتر ہے۔"

اس وقت باہر ایک تانگہ آگیا تھا۔ شکنتلا دوڑی ہوئی چلی گئی۔

میں نے سادھا کر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تو بھئی۔ ہمارا مہمان بھی آگیا یعنی اس

کہانی کی ہیروئن لیڈی ڈاکٹر۔ مجسم کہانی ۔۔۔"

سوم وت کو ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ وہ عالم اضطراب میں کبھی پورچ کی جانب کھلنے والے صدر دروازہ کی طرف دیکھتا کبھی کمرے کے چاروں سمت نگاہ دوڑاتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اب بھاگ کھڑا ہوگا۔ بلی کے پنجوں سے چھوٹی ہوئی مرغی کی دوبارہ بلی کو دیکھ کر جو حالت ہو جاتی ہے ویسے ہی سوم وت کا برا حال تھا۔

سامنے والے دروازہ کا پردہ سرکا اور شکنتلا۔ ڈاکٹر کملا دیوی کو ساتھ لئے خراماں خراماں اندر داخل ہوئی۔

"آپ اور یہاں ۔۔۔؟" کملا دیوی نے آتے ہی سوم وت کی موجودگی پر اظہار حیرت کیا۔

سوم وت کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

کملا دیوی اس کے قریب آتی ہوئی بولیں۔

"تم نے تو مجھ سے یہ کہہ کر کار مانگی تھی کہ کسی موٹے شکار کو پالیسی کے سلسلہ میں پھانسا ہے۔ ڈارلنگ۔ ایک گھنٹے کے لئے کار دے دو۔۔"

کسی اداکارہ کے لہجہ میں یہ کہتے ہوئے کملا دیوی نے پیر سے سینڈل نکال لیا اور قبل اس کے کہ سوم وت معاملہ کو سمجھ سکے کھٹا کھٹ اس کی چندیا کی مرمت کرنی شروع کر دی۔ ہاتھ کے ساتھ ساتھ ان کی زبان بھی چلنے لگی۔

"شرم نہیں آتی۔ ایک بیٹی کے باپ ہوتے ہوئے۔ اپنے آپ کو کنوارہ ظاہر کر کے معصوم لڑکیوں کو پھانسنے چلے۔ ایک کی تو زندگی تباہ کر ہی چکے ہو پھر بھی طبیعت سیر نہیں ہوئی ہیں اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ لیجے اپنا انجام۔ اب ضرور

جی بھر جائے گا۔"

اور وہ سینڈل سوم دت کے سر پر، پشت پر، بازو پر، سینہ پر، ٹانگوں پر غرض جہاں جہاں اس کا بس چلتا گیا رسید کرتی گئیں۔ اس کنوارے شوہر کا مارے شرم کے چہرہ سیاہ ہو ہی چکا تھا۔ اس ناگہانی مرمت کی تاب نہ لا کر برائے نام مزاحمت کئے، وہ بے شرمی سے چلاتا رہا۔ "ارے ارے۔ یہ کیا کرتی ہو؟ ڈارلنگ ڈارلنگ سب کے سامنے مجھے بے عزت کرنے لگی۔ ارے۔ ارے...."

میں نے آگے بڑھ کر ڈاکٹر کملا کو روکنے کی کوشش کی "بس کرو بہن۔ اس کے فریب کی اسے سزا مل چکی ہے۔"

"نہیں!" ڈاکٹر صاحب نے گرج کر کہا "یہ سزا اس کے لئے کافی نہیں ہے۔ میں اسے پولس کے حوالے کروں گا۔ اس چار سو بیس کی مناسب جگہ جیل ہی ہے۔"

یہ سنتے ہی کملا دیوی کے ہاتھ سے سینڈل چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔

ہم سب ہکا بکا ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کا چہرہ بڑا خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔ اور فرط غصہ سے ان کا سارا بدن لرز رہا تھا۔

سوم دت ڈاکٹر صاحب کے پیروں پر گر پڑا اور گڑ گڑا کر معافی مانگنے لگا۔ ڈاکٹر کملا بھی ہاتھ جوڑے منت کرنے لگیں کہ وہ اتنی سخت سزا نہ دیں۔ اس فریبی شوہر سے وہ نالاں ضرور تھیں لیکن اسے جیل بھجوانا انہیں کسی صورت گوارہ نہیں تھا۔

ڈاکٹر صاحب واقعی کوتوالی فون کرنے پر تل گئے تھے۔ مگر ہم سب نے بیچ بچاؤ کر کے ان کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ خصوصاً وہ ڈاکٹر کملا کی التجاؤں سے پسیج گئے اور اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بولے "کاش تو اس گھر میں جہان بن کر نہ آیا ہوتا تو میں تجھے ہتکڑیاں پہنا کر ہی دم لیتا۔ بے رحم انسان! تجھے تو انسان کہنا بھی انسانیت کی توہین

کرتا ہے۔ ایسی خلیق بیوی کے ہوتے ہوئے تجھے یہ فریب کاری کیوں کر سوجھی؟ مجھ سے معافی مانگنے کے بجائے اس کے پاؤں دھو کر پی ــــ"

اور سچ مچ سوم دت ڈاکٹر کملا کے پاؤں پکڑنے کے لئے جھکا لیکن اس دیوی نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا اور فوراً معاف کر دیا۔

چند ثانئے دیوان خانہ میں بھیانک خاموشی طاری رہی۔ اس سکوت کو توڑنے کی غرض سے میں نے سب کو مخاطب ہو کر کہا۔ "سوم دت بھلّہ نے بڑا غلط قدم اٹھایا تھا مسز کملا دیوی بھلّا قابلِ صد مبارک باد ہیں کہ انہوں نے ان کو معاف کر دیا اور نیک بن جانے کا موقع عنایت فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی ان دیوی جی اور ان کی معصوم بچی کا خیال کرتے ہوئے مسٹر بھلّہ کی اس غلطی کو در گذر کر دیا۔ ہمیں توقع ہے کہ آئندہ وہ ان فریب کاریوں سے توبہ کر کے اپنی زندگی راستبازی میں بسر کریں گے۔ خیر! اب خطرہ کے بادل چھٹ گئے سکھ اور شانتی کی قوس قزح نمودار ہو چکی ہے۔ اس خوشی کے موقع پر آئیے۔ ڈائننگ روم میں متفرق لوازمات سے سجی ہوئی میز ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ یہ دعوت سدھاکر اور شکنتلا کی منگنی کی تقریب کی دعوت سمجھ لیجئے اور ان نونہالوں کو مبارکباد دیتے ہوئے ان کے حق میں دعا کیجئے ــــ"

یہ سن کر ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ سدھاکر اور شکنتلا کو باری باری دیکھنے لگے جو پاس پاس کھڑے تھے شکنتلا کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور سدھاکر زیر لب مسکراتے ہوئے تشکر آمیز نظروں سے مجھے اور ڈاکٹر صاحب کو دیکھ رہا تھا۔

بہار گنج اور ودیا گنج نام رکھنے والے "گنجے" کو سوم دت کے سوا سب ہی نے

دادنی کہ ان ناموں کے مغالطہ ہی سے ایک ہونے والی "ٹریجڈی"، "کامیڈی" میں بدل کر رہ گئی۔

نوٹ

"پریم بابو" جن دنوں کالج میں زیرِ تعلیم تھے، اُن دنوں کا ایک واقعہ "سوچا تھا کیا" کہانی کے روپ میں آپ کے سامنے ہے۔

انفراغِ تعلیم کے بعد پروفیسری پہ فائز المرام ہونے سے قبل بیسیوں ہندوستانی گریجویٹوں کی طرح "پریم بابو بھی عرصۂ دراز تک بیروزگاری کی آگ میں جُھلستے رہتے تھے۔ لیکن یہ غیور انسان اخیر تک ضمیر فروشی سے بال بال بچا رہا۔ ہمارے ملک میں کس طرح دھن دولت کو تعلیم اور فہانت پر فوقیت حاصل ہے اس کا صحیح خاکہ آپ اِسی مجموعہ میں شریک ایک کہانی "صبح کا بھولا" میں دیکھیں گے۔ کہانی "جلی ہوئی دیا سلائی" میں پریم بابو نے اپنی جس ناکامیٔ محبت کا مختصر ذکر فرمایا ہے اُس کی تفصیل "صبح کا بھولا" میں ملاحظہ فرمائیے۔

"سوچا تھا کیا" میں پریم بابو کے احباب طالب اوم اور عشق باز برکاش سے آپ کی ملاقات ہوگی۔ ان کالج اسٹوڈنٹس سے مل کر آپ کو اپنے عہدِ طالب علمی کی شرارتیں یاد آجائیں گی۔

پبلیشر

(جب ہم بی۔ اے کے آخری سال میں تھے)

سوچا تھا کیا......؟

"بیٹا کہیں پھنس نہ جانا، یہ حیدرآباد ہے حیدرآباد! یہاں کی لونڈیاں ناکوں چنے چبوادیں گی تمہیں۔" اوم نے ایک بازاری اُستاد کا روپ دھارتے ہوئے رمیش سے کہا، اور پھر میری طرف پلٹ کر بولا۔

"یار پریم! ذرا تو ہی سمجھا اس لونڈے کو۔ ابھی تو دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے اور بیٹا چلے ہیں عشق کرنے، اور وہ بھی حیدرآباد کی چھوکری سے۔!"

رمیش ہی کیا، بلکہ ہماری ٹولی کا ہر فرد اوم کو اُستاد مانتے ہوئے تھا، اور اِسی لئے ہم سب اُسے دادا ہی کہا کرتے تھے۔ اب جو دادا نے رمیش کی "ابتداءِ عشق" کی داستان سُنی تو اُسی کو لتاڑ دیا۔ رمیش قدرے عاجزی سے بولا۔

"لیکن دادا! جس لڑکی کا میں نے ذکر کیا ہے، وہ عام لڑکیوں کی طرح نہیں ہے۔ گو میں اُس سے دو تین ہی دفعہ ملا ہوں، پھر بھی میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ بڑے بلند کردار کی لڑکی ہے۔"

اوم نے ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا، اور اپنی ہنسی پہ قابو پانے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔ "بلند کردار کی ـــــ بھئی خوب!"

جہاں تک لڑکیوں کا سوال تھا اوم ہم میں سب سے زیادہ تجربہ کار تھا۔ کم بخت، ہر لڑکی کے چال چلن کا اندازہ اس کے چلنے کے ڈھب یا اس کی شکل وصورت دیکھتے ہی لگایا کرتا تھا۔ اور اس کا یہ قیافہ اکثر صد فیصد صحیح ثابت ہوتا تھا۔ اس لئے دادا کے اس بے معنی قہقہہ پر بھی ہم نے کوئی تعجب نہیں کیا اور بہت کچھ مطلب نکالتے ہوئے سب رمیش کا مونہہ تکنے لگے۔ اس کا رنگ فق تھا اور چہرے پر ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں۔ دادا کی اس بھبتی پر وہ بیچارہ بس بل کھا کر ہی رہ گیا۔ بھلا دادا کے سامنے اُس کی کیا چلتی؟ وہ تو ہمارے گروپ میں ابھی نیا نیا ہی آیا تھا۔ پھر بھی اس قلیل عرصہ ہی میں وہ دادا کی شخصیت سے پوری طرح مرعوب ہو چکا تھا۔ دو تین مرتبہ، باتوں ہی باتوں میں وہ میرے سامنے اس کا اقبال بھی کر چکا تھا۔ مجھ سے تو وہ پہلی ہی ملاقات میں کچھ بے تکلف سا ہو گیا تھا۔ اور اپنا دِل میرے سامنے اُس نے آئینہ کر دیا تھا۔ یہ پریم کتھا بھی آج سے کئی روز قبل وہ مجھے سنا چکا تھا۔ جس لڑکی سے اُسے محبت ہو چکی تھی اُس کی شکل فلم اسٹار "شیلا رامانی" کی صورت سے مشابہ تھی، اس لئے چاہے اس کا نام کچھ ہی رہا ہو، رمیش اُسے پیار سے "شیلا" ہی کہنے لگا تھا۔ اور وہ لڑکی بھی اس خطاب پر نازاں تھی۔ جہاں تک رمیش کا خیال تھا یہ شیلا بھی اُس کی محبت کا دم بھرنے لگی تھی —— آج جب اس محفل میں اُس نے اپنا من ہرن کرنے والی شیلا کا ذکر چھیڑ دیا تو دادا پہلے تو جل ہی گیا۔ اور پھر رمیش کو نصیحت کے ڈوز پلانے لگا۔ دادا کو یہ مطلق گوارہ نہیں تھا کہ رمیش کسی شیلا، ویلا کی محبت کا راگ الاپنے

لگے۔ اس کی وجہ میں اور طالب خوب جانتے تھے.....

جس دن رمیش ہمارے گروپ میں آکر شریک ہوا تھا، اُس روز کوئی گھنٹہ بھر دادا اُس سے باتیں کرتا رہا تھا۔ اور جب رمیش چلا گیا تھا تو دادا نے مجھے اور طالب کو بتا دیا تھا کہ وہ رمیش کو اپنی بہن راگنی کے لئے پسند کر چکا ہے۔ یہ سُن کر ہم دونوں حیران رہ گئے تھے جب ہمیں ایک دوسرے کا مونہہ تکتے ہوئے دادا نے دیکھا تو اُس نے اس طرح وضاحت کی ـــــ رمیش کو وہ آج سے قبل دو مرتبہ راگنی کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ کسی ایک دعوت میں جہاں کہ رمیش کے علاوہ دادا اور راگنی بھی مدعو تھے، وہ راگنی اور رمیش کی نگاہوں اور طرزِ گفتگو سے یہ جان چکا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ اس دعوت میں پہنچنے میں دادا کو کچھ دیر ہو گئی تھی اور اس طرح اُس کو راگنی کی کرسی سے دُور کی کرسی پر جگہ ملی تھی۔ کھانے کی میز پر راگنی اور رمیش پاس پاس بیٹھے تھے۔ اور دادا تو لڑکیوں کی نگاہوں کو دیکھ کر ہی سب کچھ بھانپ لیا کرتا ہے۔ اُسی روز دادا کو یقین ہو گیا تھا کہ راگنی رمیش کو دل دے بیٹھی ہے۔ دوسری دفعہ دادا نے ان دونوں کو عابد روڈ پر شاپنگ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُس وقت بھی وہ خوش ہی ہوا تھا اور ان دونوں کے مستقبل کے بارے میں کچھ پروگرام بنا رہا تھا۔ جب رمیش ہماری ٹولی میں شریک ہوا تو دادا کو اپنے سہانے سپنے سچے ہوتے دکھائی دینے لگے تھے۔ میں نے راگنی کو دیکھا تھا۔ واقعی وہ حسین تھی اور رمیش سا شکیل نوجوان اُس کے لئے بطور رفیق زندگی بالکل موزوں تھا۔ لیکن ـــــ آج

اس محفل میں رمیش کسی شیلا کے عشق کا قصہ چھیڑ بیٹھا تھا — پھر بھلا داوا مضطرب نہ ہوتا تو کیا......

طالبؔ نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا اور میں داوا اور رمیش کو باری باری دیکھنے لگا۔ داوا بے کل سا ہو گیا تھا۔ رمیش بھی صورت اُتارے بیٹھا تھا۔

شیلا کے بارے میں جس قدر معلومات رمیش مجھے بہم پہنچا چکا تھا اُس سے تو یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ بیچارے اوم کی اُمیدوں پر پانی پھر جانا یقینی ہے۔ رمیش اور شیلا کے تعلقات کا تو یہ عالم تھا کہ اس ہفتہ عشرہ میں وہ سلک ازدواج میں منسلک ہونے والے تھے۔ اور آج ہماری محفل میں ذکر چھیڑنے کی اصل وجہ بھی یہی تھی۔ پرکاش ہمارے گروپ میں ایک عجیب و غریب لڑکا تھا۔ لڑکیوں کی تاک جھانک کرنے میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اس کی یہی علّت اُسے کالج سے "رسٹی کیٹ" کرا چکی تھی۔ باپ نظام آباد میں مہاجن تھا۔ اُس سے لڑ جھگڑ کر پرکاش کچھ روپیہ لے آیا تھا اور پتھر گٹی پر حضرت نے اب زنانہ پارچات کی ایک شاندار دوکان کھول لی تھی۔ شادی کے لئے پارچات کی خرید و فروخت کے سلسلہ میں وہ رمیش سے بات چیت کر رہا تھا۔ ظالم کچھ اس قدر بلند آواز میں اُس لونڈے کو مشورے دے رہا تھا کہ یہ "پرائیویٹ ٹاک" سب کی دلچسپی کا موزوں بن گیا۔ عاشق مزاج پرکاش کی تو یہ خواہش تھی کہ کسی طرح رمیش اپنی شیلا کو کپڑا پسند کرنے کے بہانے ہی اس کی دوکان پر لے آئے اور یہ چاہتے کم از کم اس کی دید ہی سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لیں۔ پر بات اتنی بڑھی کہ داوا کے بھی کان کھڑے ہو گئے اور شیلا کا نام ایک

تیر بن کر دادا کے کلیجے میں جا چُبھا۔ میں اور طالب تو یہ نظارہ دیکھکر یقین کر چکے تھے کہ دادا اب رمیش اور شیلا کی محبت کی ریل کو اچانک سُرخ جھنڈی دکھا کر ایک دم بریک لگوا دیا۔ اس خیال سے میں نے اُس وقت رمیش کی مدد کرنا ضروری سمجھا۔ اور دادا سے مشورہ طلب لہجہ میں کہنے لگا۔

"یار اوم! شیلا اور رمیش کی محبت اُس منزل پر پہنچ چکی ہے جہاں کہ دخل اندازی اب نقصان دہ ثابت ہو گی۔ جو تیر کمان سے نکل چکا ہے اُسے ہم دوبارہ ترکش میں نہیں پا سکتے۔ اس لئے میری رائے میں مناسب یہی ہو گا کہ رمیش کو شیلا سے شادی کرنے کی اجازت دے دی جائے۔"

میری زبان سے، خلاف توقع یہ کلمات سُن کر دادا اُچھل پڑا، اور قدرے تنک کر بولا۔

"پریم! تو بھی آج بچوں کی سی باتیں کرنے لگا ہے۔ کہیں مُٹھی تو نہیں گرم کر دی گئی تیری؟ میں تو رمیش کے بھلے ہی کے لئے کہہ رہا ہوں۔ یہ لڑکا یہاں نیا نیا آیا ہے۔ بھلا حیدرآبادی چھوکریوں کے چلتّر یہ کیا جانیں؟ ریاست حیدرآباد کی مردم شماری کے ہندسے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں مرد پچھتّر لاکھ ہیں اور عورتیں ایک کروڑ۔ یہاں پچیس لاکھ عورتیں سر پلس ہیں۔ وہ کہاں کھپتی ہوں گی یہ بتا کیا جانیں! جن کماری جی پر یہ مٹ رہا ہے نہ جانے وہ کتنوں کے پہلو گرما چکی ہوں۔۔۔؟"

"دادا"! رمیش چلّا کر بولا۔ آپ میری توہین کر سکتے ہیں، لیکن اُس معصوم لڑکی پر گندگی اُچھالنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔۔۔!"

"معصوم لڑکی"! دادا نے نفرت سے کہا۔ اور اپنی جگہ پر بل کھانے لگا۔ وہ طیش میں اور کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہی ہو رہا۔

میں نے طالب کی اور دیکھا۔ طالب بھی دادا ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دادا کے چہرے سے جیسے آگ برس رہی تھی۔ وہ رمیش کو کچھ ایسی نظروں سے گھور رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو ——— "اگر یہی معاملہ تھا تو میری بھولی راگنی سے محبت کرنے کا ڈھونگ کیوں رچایا تھا۔؟" ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اگر دادا کا بس چلتا تو وہ اس کمینے پن پر رمیش کو گولی ہی مار دیتا ——— ایک طرح سے دادا کی ناراضگی حق بجانب تھی۔ بھلا رمیش کو کیا حق پہنچتا تھا کہ وہ راگنی کو محبت کا فریب دئے بازاروں میں لئے لئے پھرتا رہا۔ واقعی ایک لڑکی سے محبت کرنے کے بعد دوسری کو پھانس لینا شرافت سے بعید ہے ——— لیکن دادا کو بھی تو کسی اجنبی لڑکی پر اس طرح چوٹ نہیں کرنی چاہیئے تھی۔! مگر اس وقت دادا کے مقابلے میں رمیش کی طرفداری کرنے کی کسی میں جسارت نہیں تھی۔

آخر پر کاش کسی کم فہم وکیل کی طرح "ایمانڈولی نپائے" (آپس میں نپٹارہ) کرا دینے پر اُتر آیا۔ اور بولا "بھئی رمیش ہم ایک تجویز پیش کرتے ہیں۔ اگر ماننے کو تیار رہو تو تمہارا ہی بھلا ہے۔"

لیکن رمیش ہنوز بھرا بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے ایک قسم کی بیزاری ٹپک رہی تھی۔ وہ تو کچھ نہ بولا۔ اس کا پتّہ سنبھالتے ہوئے میں نے پرکاش سے پوچھا۔

"بھئی، اگر بھلے کی ہے تو کہتے کیوں نہیں ؟ آخر اس تمہید کی کیا ضرورت ہے؟"

پرکاش کم بخت اپنی عادت سے مجبور تھا۔ وہ بس رمیش کی شیلا کی دید سے آنکھیں ٹھنڈی کرنے پر تلا ہوا تھا۔ جھٹ بولا۔ "سنو رمیش! دادا کی نگاہ کبھی خطا نہیں کرتی۔ اگر واقعی اپنی محبوبہ کا چال چلن پرکھنا چاہتے ہو تو دادا کو پوشیدہ طور ہی سے کیوں نہ ہو اپنی شیلا کی ایک جھلک ضرور دکھا دو۔"

بس، پھر کیا تھا؟ یہ متھا و پاس ہو گیا کہ دادا سمیت اتوار کی شام کو ہم سب "عزیزیہ ہوٹل" کے کمرہ نمبر ۱۲ میں چھپ کر بیٹھ جائیں۔ اور رمیش اپنی محبوبہ شیلا کو کمرہ نمبر ۱۳ میں، کچھ عرصہ کے لئے کسی بہانے لے آئے۔ عزیزیہ ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۲ اور ۱۳ کے درمیان صرف ٹک وُد کا ایک پارٹیشن تھا، جہاں آسانی کے ساتھ رمیش کی شیلا کو پرکھا جا سکتا تھا۔

پھر مٹنگ برخاست ہو گئی۔ اور سب اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ میں اور طالب، سلطان بازار میں دادا کے مکان سے تھوڑے ہی فاصلہ پر رہتے تھے۔ اسی لئے ہم تینوں اپنی اپنی سائیکلوں پر سوار ہو کر ایک ہی سمت ساتھ ساتھ جانے لگے۔ پرکاش کی تجویز پر شیلا کو دادا کی کسوٹی پر پرکھنے کے فیصلہ سے سب متفق ہو گئے تھے۔ لیکن میں اور طالب خدشہ محسوس کر رہے تھے۔ ہمیں شبہ تھا کہ راگنی کا خیال آتے ہی یہ دادا اپنا فیصلہ سنانے میں ضرور تعصب سے کام لے گا۔ چاہے

شیلا کی صورت سے اس کے سیتا ساوتری ہونے کے اوصاف ٹپکتے ہو، یہ موذی یقیناً اُس چھوکری کے آوارہ ہونے کی سند دے دیگا۔ محض اپنی بہن راگنی کی خاطر ــــ۔

ہم آہستہ آہستہ سائکلوں پر چلے جا رہے تھے۔ دادا میرے اور طالب کے بیچ میں اپنی بی۔ ایس۔ اے کو پیڈل مارتا ہوا، نیچی نظریں کئے چلا جا رہا تھا کہ طالب نے ٹھونگا دیا ــــ

"اوم، کیا سوچ رہے ہو؟"

"اب کیا ہوگا۔؟" دادا نے بڑے تردّد میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔

"بھئی ایک نظر شیلا کو دیکھ لو۔" میں نے رائے دیتے ہوئے کہا۔ اگر اس کی صورت اور چال ڈھال دیکھ کر تمہیں کوئی شبہ نہ ہو تو بیچارے رمیش کو شادی کی اجازت دے دو۔"

دادا نے اپنی شعلہ ریز نگاہوں سے مجھے گھورا۔

طالب نے ایک پلک جھپکا کر مجھے اشارہ کیا اور دادا کا دل ٹٹولنے کے لئے مسکراتا ہوا بولا۔ "دادا! اگر مونہہ میٹھا کرو تو ہم مشورہ دیں۔"

"یار بول بھی؟" دادا نے آنکھوں میں التجا لئے کہا۔

طالب کی سائیکل کسی دودھ والے سے ٹکرانے ہی والی تھی کہ اس نے پھرتی سے موڑ کر دادا سے زیادہ قریب کر لیا اور اُس کے کندھے پہ ہاتھ مارتا ہوا بولا۔

"یار۔ سوچتے کیا ہو؟ بس فیصلہ سنادو کہ رمیش کی شیلا آوارہ ہے ۔۔۔"

"لیکن یہ تو کل اتوار کو فیصلہ ہونا ہے۔" دادا البتہ لہجہ میں کہنے لگا۔ "بھلا اُس چھوکری کو دیکھے بغیر فیصلہ کیسے سنا سکتا ہوں ۔۔؟" آخری الفاظ دادا نے قدرے چڑ کر کہے۔

طالب ایک مکار وکیل کی طرح دُور کی کوڑی لاتا ہوا بولا۔

"فیصلہ آج ہی بلکہ اسی وقت ہو سکتا ہے ۔ دادا! ذرا سوچ تو جو کنواری کنیا، ایک اجنبی نوجوان کے ساتھ کسی ہوٹل کے کمرے میں تنہا آسکتی ہے، کیا وہ شریف اور باعصمت کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے۔؟"

"اوہ مار لیا ۔۔۔" اوم نے طالب کی پیٹھ تھپک کر کہا۔ بس کل یہی فیصلہ سنا دیا جائے گا۔

اور پھر حسب پروگرام ہم اتوار کی شام کو عزیزیہ ہوٹل کے کمرہ نمبر بارہ میں جا بیٹھے ۔ حالانکہ پرکاش بہت دور شاہ علی بنڈہ میں رہتا تھا، لیکن وہی سب سے پہلے نازل ہوا۔ کورم پورا ہو جانے پر بھی رمیش کا کہیں پتہ نہیں تھا اور کمرہ نمبر ۱۳ ابھی تک بند ہی تھا۔ رمیش اور شیلا کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا ۔ پرکاش کا بُرا حال تھا۔ وہ ہر پل بار بار باہر جھانک کر دیکھتا ۔ اوم نے سب کو اپنا ہم خیال بنانے کے خیال سے ایک مختصر تقریر کر ڈالی، جس کا ماحصل یہی تھا ۔۔۔

"وہ ایک غیر شادی شدہ لڑکی ہے ۔۔۔ رمیش اس کے لئے ایک غیر مرد ہے ۔ ہوٹل، بدنام جگہ ہوتی ہے ۔ جہاں نوجوان لڑکے اسی

قسم کی آوارہ لڑکیاں لا کر دل بہلاتے ہیں۔ جو کنواری لڑکی، شادی سے قبل، ہوٹل کے تنہا کمرے میں ایک پرائے مرد سے ملنے کی جسارت کر رہی ہو، وہ ضرور اس سے پیشتر بھی، کئی اور آوارہ لونڈوں کے پہلو گرما چکی ہو گی۔ وہ شریف اور باقرہ ہو ہی نہیں سکتی۔"

دادا کی تقریر اُمید سے زیادہ موثر رہی۔ اور چند ساتھیوں نے تو شیلا کو دیکھنے کے ناٹک میں حصّہ لینے ہی سے انکار کر دیا۔ بس اب رمیش کا انتظار تھا کہ وہ آئے تو اِس فیصلہ نما نیزہ سے اُس کا دل چھید دیا جائے۔

لیکن ایک پرکاش تھا جو رمیش کی پھانسی ہوئی اُس چڑیا کو دیکھنے کے لئے مضطرب تھا۔ وہ بار بار مشورہ دے رہا تھا کہ فیصلہ چاہو جو سنا دو، لیکن کم از کم اُس پکھیرو کو دیکھ تو لو۔ کچھ ساتھی پرکاش کی رائے سے متفق ہو گئے۔ لیکن ظاہراً سب ہی دادا کے ساتھ تھے، جس نے سرے ہی سے اُس لڑکی کو دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

اتنے میں کمرہ نمبر ۱۳ کے تالے میں چابی گھومی اور دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ پرکاش نے پارٹیشن کی درازیں سے جھانکنے کی پہل کی۔ دادا اور کچھ ساتھی رمیش کو فیصلہ سنانے کے لئے باہر نکل گئے تھے۔

پرکاش نے ہلکی آواز میں کہا بھی۔

"یارو۔ ارے دیکھ تو لو۔ سالے رمیش نے سچ مچ اندر کے اکھاڑے

کی ایسرا اُڑائی ہے۔ لڑکی بڑی شریف معلوم ہوتی ہے۔ اس کے دل پر گھونسہ مت مارو۔ ارے کم از کم درشن تو کر لو اُس دیوی کے۔"

لیکن دادا کا سب پر رعب جو طاری تھا۔ دو چار لڑکوں کے سوا کسی نے روزن تک پہنچنے کی ہمت تک نہ کی۔ میں نے سوچا۔ ایک نظر دیکھ تو لوں۔ رمیش تعریفوں میں اس قدر رطب اللسان ہوا کرتا ہے۔ اُس کی پسندیدہ شیلا آخر کیسی ہے؟ آخر اس ارادے سے میں نے پرکاش کو سوراخ کے پاس سے ہٹایا اور دیکھنے لگا۔

پہلے تو کرسی کے پاس تپائی پر پرس اور ایک زنانی چھتری رکھی ہوئی دکھائی دی ـــ رمیش اندر نہیں تھا، شائد دادا اور اُس کے ہم خیال ساتھیوں نے اُسے باہر بُلا لیا تھا۔ میز کے پاس کرسی پر ایک معصوم لڑکی سہمی ہوئی سی بیٹھی دکھائی دی ـــ وہ گویا اس غیر معمولی ماحول ہی سے خوفزدہ سی ہو گئی تھی ـــ میں نے اُس کے نازک اندام ڈھانچہ اور سندر مکھڑے کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ حسُن و جمال کی تصویر ـــ سر بھرے دادا کی چہیتی بہن ـــ اوم کی معصوم اور مقدس راگنی تھی وہ ـــ

غیر متوقع طور پر اس کمرے میں راگنی کو دیکھ کر میں اس قدر حیرت زدہ ہو گیا کہ بڑی دیر تک جنبش نہ کر سکا۔ جس وقت پرکاش نے مجھے وہاں سے ایک جھٹکے کے ساتھ سرکایا تو میں جیسے خواب سے چونک کر باہر بھاگا۔ اور دادا کو تلاش کرنے لگا کہ فیصلہ سنانے سے قبل حقیقت حال اُس پر واضح کر دوں۔

مجھے رمیش نیچی گردن کیے ہوئے آتا دکھائی دیا۔

"سناؤ رمیش!" میں نے اتنا ہی کہا اور اس کے پژمردہ چہرے کو دیکھ کر تڑپ گیا۔

"دادا نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے —" وہ گلوگیر آواز میں بولا۔

"کیا؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔

"وہ آوارہ اور عصمت فروش لڑکی ہے —" رمیش نے جوں توں جملہ پورا کیا اور آگے بڑھ گیا۔

مجھ پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا دادا نے سم آلود نیزے سے معصوم راگنی کا کلیجہ چھید ڈالا۔

میں ہلکے قدموں سے ہوٹل کے بڑے ہال، رستوران میں داخل ہوا۔ جہاں ایک بلوری میز پر دادا، طالب کے پاس بیٹھا کیک کھا رہا تھا۔ اور اس کے دوسرے ساتھی بھی ہنسی کا گول گپّہ بنے سامنے کی پلیٹوں کو خالی کر رہے تھے۔

میں دور ہی کھڑا تماشہ دیکھتا رہا — دادا نے سوچا تھا کیا اور ہو کیا گیا —؟ اب میں اُسے کیسے بتاؤں کہ ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۲ میں کوئی آوارہ عصمت فروش، بدچلن چھوکری نہیں بلکہ اس کی معصوم بہن راگنی بیٹھی ہے — دادا کو میں یہ کیسے بتاؤں کہ دادا تو نے جو فیصلہ کیا ہے وہ غلط ہے — تو اندھا ہے —!!

ہیروئن

آج بھی سامنے والے مکان کا دروازہ بند تھا اور گودریج کا تالہ ساکنانِ مکان کی عدم موجودگی کا زبانِ حال سے اعلان کر رہا تھا۔

میرے لئے اس مکان کے کواڑ کھلے یا بند ہونے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، لیکن ایک ہفتہ قبل جب لالی نے مجھے اپنی آپ بیتی سنائی اور آنسو بھرے نین مجھ پہ گاڑ کر میری امداد کی طالب ہوئی تو میں نے اُسے تسلّی دی تھی اور یقین دلایا تھا کہ اس کی ضرور مدد کروں گا۔ میرے اس مختصر سے جملے سے اُسے کچھ ڈھارس سی بندھ گئی تھی۔ اور بے بس لالی اپنی میلی لیکن قیمتی ساری کے پلّو سے آنسو پونچھتی ہوئی چلی گئی تھی۔ اس روز میں سارا دن بس اسی کے متعلق سوچتا رہا کہ میں اس لڑکی کی کس طرح مدد کر سکتا ہوں۔ پولیس میں اگر اطلاع دوں تو اس کے خاندان کی بدنامی کا اندیشہ تھا، جس کے لئے اُس نے مجھے منع بھی کر دیا تھا۔ اپنے والدین کے پاس جانے کو بھی وہ تیار نہیں تھی —— لیکن میں ابھی کسی نتیجہ پر بھی نہیں پہنچ سکا تھا کہ دوسرے ہی دن سے اس کے مکان کا دروازہ مقفل دکھائی دینے لگا۔ نہ جانے لالی کو لے کر گنیشی لال کہاں چلا گیا؟ ممکن ہے کہ گنیشی کے کان میں یہ بھنک پڑ گئی ہو کہ اس کی عدم موجودگی میں لالی میرے مکان میں گئی تھی۔ اور

اُس نے لالی کے چال چلن پر شبہہ کر کے مکان ہی بدل لیا ہو ـــــ مالک مکان بھی قریب ہی اس محلہ میں رہتا ہے اگر اس سے مل کر دریافت کیا جائے تو اس بات کی تصدیق ہو سکے گی کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں۔ مگر ان لوگوں میں دلچسپی لینے کا سبب کہیں وہ مجھ سے پوچھ بیٹھا تو میں کیا جواب دوں گا! ہاں البتہ اس بہانے میں مالک مکان سے مل سکتا ہوں کہ میرے کسی دوست کو مکان کی ضرورت ہے۔ کیا آپ کا یہ مکان خالی ہو چکا ہے' وغیرہ۔

سامنے والے مکان پر تالہ دیکھ کر میں کچھ بے قرار سا ہو گیا تھا اور لالی پر کیا گزر رہی ہو گی یہ معلوم کرنے کی مجھے کرید ہو رہی تھی۔ واقعی وہ اس وقت بے بس تھی۔ اس سے جو غلطی سرزد ہو چکی تھی اس پر وہ نادم تھی اور اپنی ناعاقبت اندیشی پر شرمندہ بھی تھی۔ لیکن اب اس کے اس طرح پچھتانے سے بگڑی بننا مشکل تھی اس نے جو حالات اپنی اس لغزش کے متعلق مجھے سنائے تھے میں اُن پر غور کرنے کی کوشش کرنے لگا اور اس دن کی صبح میرے تصور میں لوٹ آئی۔ جب وہ میرے کمرے میں آئی تھی۔۔۔۔۔

پچھلے ہفتے کھڑکی کے پاس والی اسی میز کے سامنے میں بیٹھا ایک کہانی لکھنے میں مصروف تھا کہ سامنے والے مکان کے دروازے میں مجھے لالی دکھائی دی۔ میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی جو میں اپنا لکھنا چھوڑ اس کی دید میں محو ہو جاتا۔ میں نے ایک نظر اُسے دیکھا اور پھر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ دو تین پیراگراف لکھنے کے بعد جوں ہی میں نے نظر اٹھائی تو لالی اب بھی وہیں کھڑی تھی اور اسی طرح مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی اس کا اس انداز سے مجھے دیکھنا میرے لئے واقعی ایک غیر معمولی بات تھی لیکن میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ میں بھی اس جوان چھوکری سے بیٹھا ہوا نظریں لڑاتا رہوں میں

پھر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ مجھے تو اس روز وہ کہانی ختم کرنی تھی اور اسی دن ڈاک سے اشاعت کے لئے بھجوانی تھی، اس لئے کہانی کا بقیہ حصہ پورا کرنے کے لئے انگلیوں میں قلم تھامے میں سوچنے لگا۔ لیکن کہانی کے پلاٹ کی بجائے میرے دماغ میں لالی ہی کے خیالات رقص کرنے لگے۔

یہ لالی کس قدر خوب صورت ہے۔ یہ حسن بے پناہ اور یہ چھٹتی ہوئی جوانی۔ گنیشی بھاگوان ہے جو اسے ایسی حسین بیوی ملی۔ کوئی چھ ماہ سے لالی کو لئے گنیشی لال سامنے والے مکان میں رہنے آیا تھا۔ یہ مکان گلی میں کھلنے والی میری کھڑکی کے مقابل تھا اور یہ گلی اس سڑک سے آکر ملتی تھی جس کے سامنے میرا صدر دروازہ کھلتا تھا۔ میں بیرونی ملاقاتی کمرے کے بجائے اسی کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھا لکھنے کا عادی تھا اور لکھنے کے دوران میں اکثر گنیشی اور لالی کو سامنے والے مکان میں آتا جاتا دیکھا کرتا تھا۔ گنیشی کے علاوہ ایک اور نوجوان اتو کھے لال، جس کا نام مجھے بعد میں معلوم ہوا، گاہے گنیشی کے ساتھ گاہے گنیشی کی عدم موجودگی میں لالی کے پاس آیا کرتا تھا۔ وقت بے وقت اس گھر میں ریڈیو بجتا رہتا تھا۔ لالی لبا اوقات اپنا گھریلو کام ختم کر کے دروازہ میں آکھڑی ہوتی تھی۔ لیکن جب بھی اس طرح وہ دروازہ میں کھڑی ہوا کرتی تھی اس کی نگاہیں حد نظر تک راستہ پر لگی ہوتی تھیں۔ وہ کسی کو تاکتی جھانکتی نہیں تھی بلکہ پڑوس کا کوئی لونڈا یا منچلا رہرو اس پر نظریں گاڑھی دے، یا خاص مقصد سے اُسے گھورنے لگے تو وہ دروازہ پر پڑی چلمن کی اوٹ میں ہو جایا کرتی تھی۔ اس طرح دروازہ پر کھڑے رہتے وقت اُس کی نگاہیں گنیشی کے انتظار سے لبریز ہوا کرتی تھیں۔ اور جب گنیشی کو وہ دُور سے آتا دیکھ لیتی تھی تو اس کے چہرے

پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ جاتی اور وہ اندر چلی جاتی تھی۔ لیکن اس صبح وہ سڑک کی طرف دیکھنے کے بجائے میری کھڑکی کی سمت ہی دیکھ رہی تھی حسب معمول نہ تو اس نے نیا ؤ سنگھار ہی کیا تھا اور نہ ہی وہ کوئی بھڑکیلا لباس پہنے ہوئے تھی۔

میں مزید ایک لفظ بھی نہ لکھ سکا اور میں نے پھر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ لیکن اس دفعہ لالی وہاں نہیں تھی۔ اس کے دروازے پہ کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ میں ابھی اُدھر ہی دیکھ رہا تھا کہ مجھے اپنے ملاقاتی کمرہ میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

"کون؟" میں نے بآواز بلند کہا۔

"میں ہوں ..... میں ..... لالی" جواب ملا۔

"کیا چاہیے تمہیں؟" میں نے استعجاب سے دریافت کیا۔

دروازہ پر کا پردہ سرکا اور وہ حسین لڑکی لجاتی شرماتی اندر آ گئی۔ فی الحقیقت وہ اس قدر حسین تھی کہ اسے تنہا اپنے کمرے میں اتنے نزدیک سے اس کے گلابی مکھڑے اور دلکش ڈھانچہ کو دیکھکر میں قدرے مرعوب سا ہو گیا۔ وہ مطلق میک اپ نہیں کئے ہوئے تھی۔ ساری بھی گو قیمتی تھی لیکن میلی میلی سی تھی۔

"بیٹھو" دیوار کے پاس رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کر کے میں نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔

وہ شرماتی ہوئی بیٹھ گئی اور اپنی انگلی پر ساری کا پلو لپیٹتی ہوئی نیچی نظریں کئے کہنے لگی "آپ حیران ہوں گے بابو جی کہ میں اس وقت آپ کے پاس کیوں چلی آئی؟"

جب میں نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش بیٹھا اس کی صورت تکنے لگا تو

شائد میرے چہرے پر ہویدا جذبات حیرانگی کو دیکھ کر وہ آگے بولی ــــ
"پھر بھی میں آپ کے لئے بالکل اجنبی تو نہیں ہوں" پھر وہ خاموش ہوگئی اور مجھے اس انداز سے دیکھنے لگی گویا مجھ سے سننا چاہتی ہے کہ میں اسے ضرور جانتا ہوں۔

"جہاں تک میرا خیال ہے تم سامنے کے مکان میں رہنے والے گنیشی لال کی بیوی ہو ــــ" میں نے کہا اور اس کی شرمگیں آنکھوں کو دیکھنے لگا۔

"بیوی ہی!" اس نے تنفّر آمیز طنز سے کہا اور اس کی کٹورہ سی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو ڈھلک گئے۔

میرا استعجاب بڑھ گیا۔

"میں اس لئے نہیں آئی ہوں" وہ آنسو پوچھتی ہوئی بولی "کہ آپ کے پاس اپنی بدنصیبی کا دکھڑا رو کر آپ کی پریشانی کا سبب بنوں۔ خیر اس وقت تو اپنی ضرورت سے میں یہاں آئی ہوں۔ اگر آپ مجھے .... کچھ روپیہ .... بطور قرض دے سکیں تو ــــ" باقی جملہ اس کے حلق میں پھنس کر رہ گیا۔

"کس قدر روپیہ درکار ہے تم کو ــــ اور گنیشی لال کہیں باہر گیا ہوا ہے کیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"آنسوؤں کی لڑیاں اس کے بیب ایسے گالوں پر لڑھک گئیں۔

"دو دن سے اس کا پتہ نہیں ــ" اپنے جذبات پر قابو پاتی ہوئی وہ بولی۔ آنسو تھے کہ آنکھوں سے امنڈے چلے آرہے تھے۔ انہیں پوچھتی ہوئی وہ کہنے لگی۔ "اور اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔ کسے جا کر اپنی بے بسی کی داستان سناؤں بابو جی ــ" اور بے تحاشہ ہچکیاں لے لے کر

رونے لگی" پاس پھوٹی کوڑی نہیں۔ کس سے بھیک مانگوں؟ کوئی ٹھکانہ نہیں جہاں جا کر مونہہ چھپا سکوں ۔"

میں اُس کے اِس انکشاف پر ششدر رہ گیا۔

وہ گویا دل کی بھڑاس نکال دینے پر تلی نظر آ رہی تھی۔ آنسو پوچھتے ہوئے بولی " اس محلہ میں چھ ماہ سے میں مقیم ہوں۔ اس دوران میں آپ سے کبھی کوئی واسطہ تو نہیں پڑا تو بھی آپ کی صورت اور طرز رہائش سے آپ کی شرافت کا اندازہ ہوا اُس لئے بڑی ہمت کر کے ایک آس لئے آپ کے پاس آئی ہوں کہ آپ ہی میری کچھ سہائتا کریں گے۔"

بہزار وقت یہ چند جملے اس نے ہچکیاں لے لے کر ادا کئے۔ اس کی حالت زار سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی امداد کرنے کے لئے فوراً آمادہ ہو گیا، اور اُسے تشفی دیتے ہوئے میں نے کہا ۔" کس قدر رقم چاہیئے تم کو ۔۔۔ رو ؤ نہیں حوصلہ سے کام لو۔"

" اس وقت آپ مجھے پچیس روپے عنایت فرما دیجئے"۔ اس نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔

مجھ سے اس کی بے بسی دیکھی نہ گئی۔ میں نے کہا" لیکن تم بڑی ہی مصیبت زدہ معلوم ہوتی ہو۔ جب تم نے مجھ پہ اتنا بھروسہ کیا اور مجھے اس قابل سمجھا ہے اور تم نے کہا ہے کہ گنیشی دوبارہ نہیں آئے گا' تو بُرا مت ماننا اگر میں یہ پوچھوں کہ کیا وہ تمہارا شوہر نہیں تھا ۔۔؟"

"جی نہیں ۔۔" اس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا اور پھر رونے لگی۔

تو کیا اب تم تنہا رہ گئی ہو؟ مجھ سے پچیس روپے قرض لے کر تم پوری زندگی

تو بسر نہیں کر سکتیں۔ آخر وہ کون تھا اور تم اس کے ساتھ کس حال میں رہ سکیں؟ اگر نامناسب نہ ہو تو کیا تم مجھے اپنی روداد سنا سکتی ہو؟ ممکن ہے میں تمہارے مستقبل کے متعلق کچھ سوچ کر صحیح معنوں میں تمہاری مدد کر سکوں —" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہرج تو کوئی نہیں۔ بلکہ اس صورت میں میرے دل کا بار بھی کچھ ہلکا ہو جائے گا۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ میری ذلیل کہانی سن کر آپ مجھ سے ہمدردی کے بجائے نفرت کرنے لگیں گے۔" وہ بڑی عاجزی سے بولی اور اس نے شرم سے آنکھیں نیچی کر لیں۔

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ حتی المقدور تمہاری مدد کروں گا۔ انسان سے غلطی ہوا ہی کرتی ہے۔ آخر تم بھی انسان ہو تعجب نہیں تم سے بھی کوئی لغزش ہو گئی ہو۔ اور انسان ہونے کی حیثیت سے میں تمہارے ساتھ انسانیت ہی برتوں گا۔"

غرض دم دلاسا دینے پر لالی نے مجھے اپنی دردناک آپ بیتی سنا ڈالی۔

اس کا پورا نام لال کنور تھا۔ قاضی پیٹھ کے سیٹھ من سکھ لال کی وہ اکلوتی بیٹی تھی۔ ان کا خاندان دولتمند اور فیشن پرست تھا۔ سینما بینی اور سیر و تفریح ان کا خاص شغل تھا۔ لال کنور کی تعلیم پر بھی انہوں نے کافی دولت صرف کی تھی۔ میوزک اور کلاسیکل ڈانس میں بھی لال کنور خاص مہارت رکھتی تھی۔ بچپن ہی سے وہ نہایت چنچل اور منہ پھٹ واقع ہوئی تھی۔ اپنی ایک سہیلی رام پیاری کے ساتھ وہ اکثر سینماؤں اور ہوٹلوں کی سیر کیا کرتی تھی۔ رام پیاری ایک آوارہ لڑکی تھی اور گنیشی لال سے اس کی آشنائی تھی گنیشی

کالج سے نکالا ہوا ایک بدنام طالب علم تھا۔ ایک روز اس نے رام پیاری کے ساتھ لال کنور کو دیکھ لیا تو ایک ہی نظر میں اس پر فریفتہ ہو گیا۔ جب قاضی پیٹھ میں فلم "شہنائی" چل رہی تھی تو گنیشی نے رام پیاری اور لال کنور دونوں کو ساتھ لے جا کر وہ فلم دکھائی۔ اس روز انوکھے لال نامی ایک اور نوجوان بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ بھی لال کنور کو دیکھ کر اس کی محبت کا دم بھرنے لگا۔ اس نے پہلی ملاقات میں لال کنور کے حسن و جمال کی بڑی تعریف کی اور یہ بھی کہا کہ اُسے تو کسی فلم میں ہیروئن ہونا چاہیئے تھا۔ اس پر رام پیاری نے بھی اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ واقعی رقص و موسیقی کی ماہر اور اس قدر حسین و جمیل ہوتے ہوئے وہ اس وقت تاریکی میں کیوں پڑی ہوئی ہے؟ یہ سن کر لال کنور کے دل میں فلم اسٹار بننے کی اُمنگ اٹھی اور اس روز سے ہمیشہ وہ یہی سوچنے لگی کہ ہیروئن بننے کی تمام صفات اس میں ہوتے ہوئے وہ کیوں فلم لائن میں شریک نہیں ہو جاتی؟ یوں تو شروع ہی سے اُسے فلم اسٹار بننے کی خواہش تھی۔ لیکن اس دن کی تعریفوں کے بعد ایکٹریس بننے کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ پھر سب نے مل کر دوبارہ فلم شہنائی دیکھی۔ اور رام پیاری نے ریحانہ اور لال کنور میں موازنہ کیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ لال کنور ریحانہ سے بھی اچھا رقص کرتی ہے جب لال کنور نے ریحانہ کو کولھے مٹکاتے ہوئے جوانی کی ریل چلاتے دیکھا تو اُسے بھی اپنی جوانی کی ریل چلانے کا خیال پیدا ہوا۔ دو تین مرتبہ اس نے شہنائی انوکھے اور گنیشی کے ساتھ باری باری سے دیکھا۔ گھر آ کر وہ تنہائی میں ریحانہ کی نقل اُتارنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ پھر اُسے اپنی جوانی کی ریل کے لئے ڈرائیور کی تلاش ہوئی پہلے تو اس کی نظر انتخاب

انوکھے لال پر پڑی۔ گنیشی سے اس لئے اس نے آنکھیں لڑانا روا نہ سمجھا کہ اسے وہ رام پیاری کا حق سمجھتی تھی۔ اس دوران میں انوکھے بھی کتے کی طرح دم ہلاتا ہوا اس کی محبت کا دم بھرنے لگا تھا۔ انوکھے حیدرآباد کا رہنے والا تھا اور چھٹیوں میں گنیشی لال کے ہاں آیا ہوا تھا۔ چھٹیوں کے اختتام پر جب وہ واپس جانے لگا تو اس نے لال کنور کو اپنے ہمراہ چلنے کی دعوت دی۔ لال کنور لاکھ آزاد سہی، لیکن تھی آخر ہندوستانی لڑکی۔ کسی صورت بھی اس کے والدین اسے تنہا ایک اجنبی کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ انوکھے لال نے اُسے اغوا کرنے کا پروگرام بنایا لیکن لال کنور اپنے ماتا پتا سے اس طرح جدا ہونے کو مطلق تیار نہ ہوئی، ہاں ایکٹریس بننے کے لئے وہ تیار تھی۔ اس بات کے لئے وہ آمادہ تھی کہ اُسے کوئی ریحانہ کی طرح نچا کر اس کی فلم تیار کرے۔ اور ایک دن وہ شہرۂ آفاق ہیروئن بن جائے ـــــ انوکھے کی طرح گنیشی بھی اس بھولی چڑیا کو پھانسنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ امیر بھی تھا اور انوکھے اس کی ہی دولت پر عیاشیاں کیا کرتا تھا۔ گنیشی انوکھے کے مقابلے میں زیادہ گھٹا ہوا تھا۔ اس نے لال کنور کی دکھتی رگ پکڑلی اور اُسے سبز باغ دکھائے کہ حیدرآباد میں ایک نئی فلم کمپنی کھلی ہے جس میں نئے چہروں کی ضرورت ہے۔ اسے ایسا سنہرا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیئے۔ گنیشی کا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ شہرت کی بھوکی لال کنور اس کے ساتھ حیدرآباد چلنے پر راضی ہوگئی۔ گنیشی لال کو اس نے ایک تنہا کمرے میں ریحانہ کی طرح کولھے مٹکا کر چھاتیاں تھرکا کر اور آنکھیں نچا کر جوانی کی ریل چلا کر بھی دکھائی اور گنیشی نے اُسے یقین دلا دیا کہ حیدرآباد کی نئی فلم

کمپنی میں اُسے ضرور ہیروئن کا کام مل جائے گا ۔ انوکھے لال گنیشی کے احسانوں میں دبا ہوا یہ سب کچھ دیکھتا رہا اور اُف تک نہ کر سکا۔ بلکہ گنیشی کی ہاں میں ہاں ملا کر اس نے یہ تک کہہ دیا کہ ہاں گنیشی کا ایک دوست اس نئی کمپنی میں کیمرہ مین ہے۔ حیدر آباد پہنچتے ہی بس کام بن جائے گا۔ اب سوال تھا ماں باپ سے جدائی کا بلکہ ہمیشہ کی جدائی۔ کیونکہ وہ اس تجویز پر کسی حالت میں بھی متفق نہ ہو سکتے تھے۔ اس پر انوکھے اور گنیشی نے حیدر آباد کی ایک نامور ایکٹرلس کی مثال پیش کرنی جو لپنے رشتہ داروں کی مرضی کے خلاف بمبئی بھاگ گئی تھی اور جب اس نے فلم لائن میں شہرت حاصل کرلی اور شہرۂ آفاق ہیروئن بن گئی تو اب وہی رشتہ دار جب کبھی وہ حیدر آباد آجاتی تو اس کے پیچھے جاتے ہیں۔ اس طرح ماں باپ کی ناراضگی کا مسئلہ بھی چند دنوں کا ہے۔ جب تم ہیروئن بن جاؤ گی اور تمہاری فلم قاضی پیٹھ میں لگے گی تو وہی ماں باپ تمہاری شہرت دیکھ کر تمہیں سینہ سے لگا لیں گے۔ بس پھر کیا تھا حیدر آباد بھاگ چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ چھٹیاں ختم ہوتے ہی انوکھے حیدر آباد روانہ ہو گیا۔ اس نے یہاں آتے ہی پہلے یہ مکان کرایہ پر لیا اور پھر گنیشی لال اس پری کو شیشے میں اُتار کر لے آیا۔

اس طرح لال کنور کو لالی بننا نصیب ہوا۔ کئی دن تک اس کی جوانی کی ریل کی ریہرسل کرائی گئی۔ کچھ روز تو بہانہ بازی کی گئی کہ گنیشی کا وہ دوست جو کیمرہ مین ہے مالک فلم کمپنی کے ساتھ فلم کا سامان خریدنے بمبئی گیا ہے۔ ان دونوں کے واپس آتے ہی لالی کو ان کے سامنے پیش کر دیا جائے گا اور وہ ہیروئن بنجائیگی۔ جیسے جیسے دن گزرنے لگے لالی کو بڑا تلخ تجربہ ہونے لگا۔ اس کی جوانی کی ریل چل

توڑ چکا تھا لیکن عجیب عجیب غیر مانوس اسٹیشنوں سے گزر رہی تھی جہل، فریب، توہین، بے عزتی، عریانی کے اسٹیشنوں پر رک رک کر چلی جاتی تھی کہ عصمت دری کے جنکشن پر کوئلہ پانی ہی ختم ہو گیا۔ اس ہبل ناتجربہ کار کو آشیانہ سے باہر نکلنے پر دنیا کا اصلی روپ دیکھنے کو مل گیا تھا۔ بدکردار گنیشی، ہیروئن بنا دینے کا لالچ دے کر اس کا سب کچھ لوٹ چکا تھا اور یہ بے وقوف لڑکی ایک نہ ایک دن ہیروئن بن جانے کی آس میں اس کی ہر دست درازی سہتی رہی تھی۔ فلم کی نوکری تو محض ایک بہانہ تھی، آخر کب تک لالی ان چکموں میں آسکتی تھی۔ ربڑ کو زیادہ کھینچنے سے آخر وہ ٹوٹ ہی جاتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں رنجش پیدا ہو گئی۔ فی الحقیقت گنیشی، لالی سے پوری طرح سیر ہو چکا تھا اور کچھ دنوں سے انوکھے کی معصوم بہن موہنی سے عشق لڑانے لگا تھا اور اب تو وہ موہنی سے شادی رچانے کا منصوبہ کر چکا تھا۔ اس نے لالی سے چھٹکارا پاتے کے لئے اس نے روپوشی اختیار کر لی اور لالی کو یقین تھا کہ اب وہ واپس نہیں آئے گا۔

آخر لالی نے بتایا کہ پچھلی رات انوکھے اس کے پاس آیا تھا اور بجائے اس کے کہ اس بے بس کی کچھ مدد کرتا اس نے ڈرا دھمکا کر اپنی خواہش پوری کی۔ ساری رات وہ اس کے پاس رہا اور سویرے جاتے ہوئے کہہ گیا کہ اب ہمیں تمہاری ضرورت نہیں رہی ہے بہتر ہے کہ تم اس مکان کو خالی کر کے چلی جاؤ۔ یہ سن کر لالی کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ وہ بھیری ہوئی شیرنی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی اور اس کا مونہہ نوچ لیا اور کہا اگر دونوں نے اس طرح اسے علیحدہ کرنا چاہا تو وہ پولیس میں جا کر حقیقت حال بیان کر کے دونوں کو گرفتار کرا دیگی۔ اس پر انوکھے اُسے قتل کی دھمکی دے کر چلا گیا۔۔۔ اب غریب لالی کو دن

میں تارے دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ سوجھتا نہیں کہ کیا کرے اور کہاں جائے؟ اس کی حالت پہاڑی پر سے کھڈ میں گرے ہوئے پتھر کے مترادف تھی۔ جان سے زیادہ چاہنے والے ماتا پتا کی یاد اُسے شب و روز تڑپاتی رہتی۔ لیکن وہ پامال تمنّا اس تباہ حالی میں گھر لوٹنا نہیں چاہتی تھی حالانکہ وہ ان کی مفارقت نہیں برداشت کر سک رہی تھی لیکن اپنی بربادی کا انکشاف بھی ان پر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اب بھی یہ خواہش تھی کہ وہ جس جنون کو سر میں لئے گھر سے نکلی' ماں باپ اور عزیز و اقربا کو چھوڑا اُسے خود پورا کرے اور ایک شہرت یافتہ ہیروئن بن جانے پر ماں باپ سے جا ملے اور انہیں منا لے لیکن اب اس کے پاس ایک پھوٹی کوڑی تک نہیں بچی۔ گھر سے اُڑا کر لایا ہوا زیور اور نقدی گنیشی لے کر چمپت ہو گیا تھا۔ پہننے کے لئے کپڑے تک نہیں رہے تھے کچھ ساریاں لانڈری میں بھجوائی تھیں انہیں واپس لانے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ ٹائیلیٹنگ ختم ہو چکا تھا۔ کھانے پینے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ مجھ سے اس نے پچیس روپے اس لئے مانگے تھے کہ کچھ اپنی حالت سدھار کر خود فلم کمپنی میں جا کر ملازمت حاصل کرے گی اور ایک دن ضرور ہیروئن بن کر رہے گی۔

خیر میں اس کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ پچیس روپے اُس کے حوالے کر کے میں نے اُسے پورا یقین دلا دیا تھا کہ میں ضرور اس کی مدد کروں گا اور اُسے اس جہنّم سے نکالنے کی راہ ڈھونڈوں گا۔ حالانکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ میری حیثیت اس معاملہ میں اس اسٹیشن ماسٹر کی سی ہے جو اسٹیشن کے حدود سے گاڑی نکل چکنے پر سرخ جھنڈی ہوا میں لہرا رہا ہو۔ پھر بھی میں سوچتا رہا اور بڑے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ اس راہ بھٹکی بھیڑ کو ان خونخوار بھیڑیوں کے

جنگل سے چھڑانے کے لئے تو مناسب یہی ہو گا کہ اسے اسکے ماتا پتا کے پاس واپس بھجوا دیا جائے۔ اور پولیس کی مدد سے گنیشی اور انوکھے کا سراغ لگا کر انہیں کڑی سے کڑی سزا دلوا دی جائے تاکہ دوسروں کے لئے عبرت ہو۔ لیکن اس واقعہ کے دوسرے ہی روز سے سامنے والے مکان پر گودریج کا تالہ لٹکا مجھے مونہہ چڑاتا ہوا نظر آیا۔

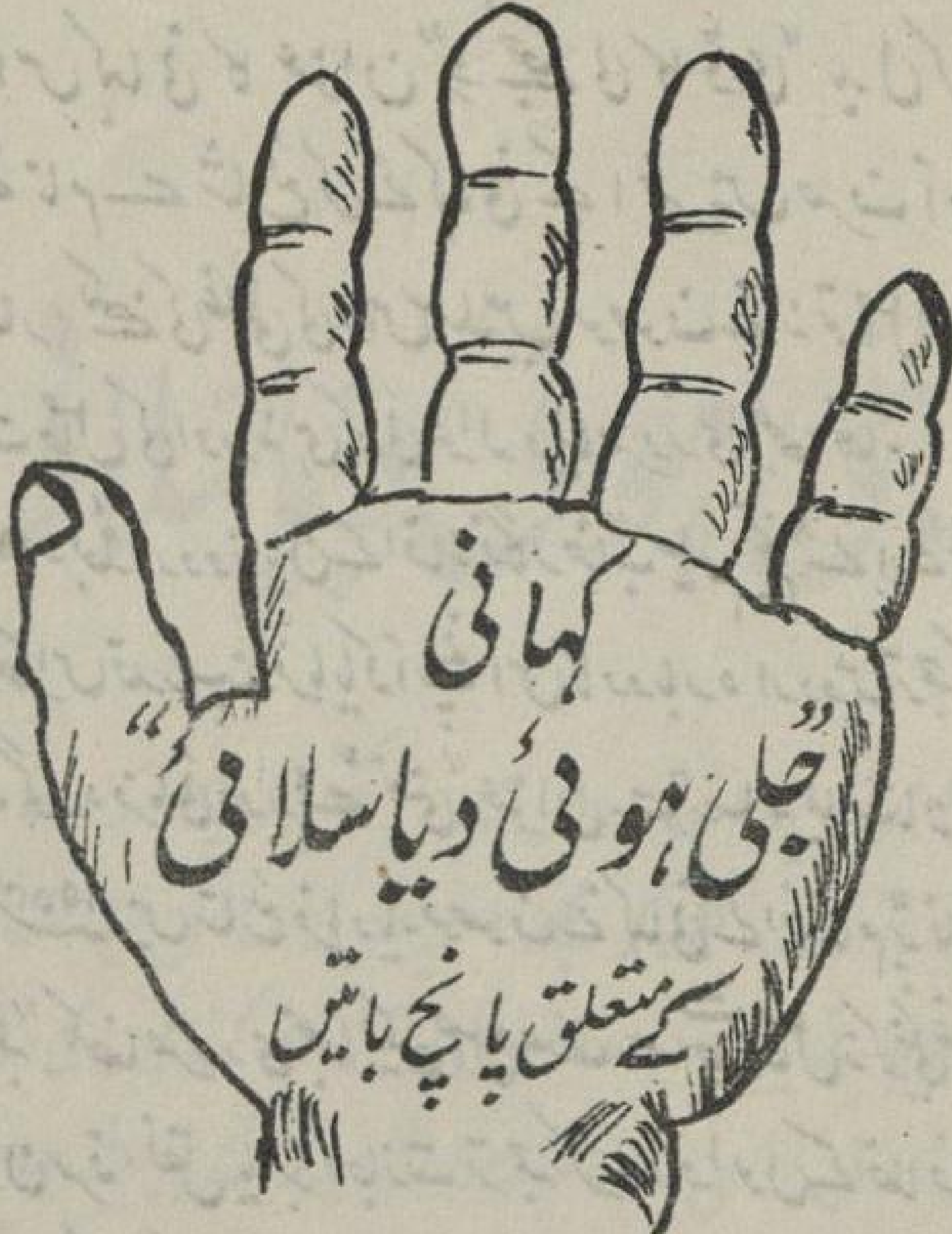
مالک مکان سے ملنے میں اسی وقت جانا چاہتا تھا اور اس ارادے سے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن میں نے ابھی قدم بھی نہ اٹھایا تھا کہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے باہر گلی میں اچھی خاصی بھیڑ اکٹھی ہو گئی اور مالکِ مکان پولس انسپکٹر کی موجودگی میں سامنے والے مکان کا تالہ توڑنے لگا۔ میری کھڑکی سے لگا ایک شخص سہما ہوا اپنے ساتھی سے چپکے چپکے کچھ کہہ رہا تھا ان کی گفتگو کا لفظ "قتل" مجھے صاف سنائی دیا اور میں بھونچکا سا دوڑا ہوا باہر پہنچ گیا۔

کافی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ پولس کے جوان انوکھے اور گنیشی کو ہتکڑیاں لگائے میری دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ استفسار کرنے پر مجھے پتہ چلا کہ گنیشی نے شادی کا فریب دے کر انوکھی کی معصوم بہن موہنی کی آبرو لوٹی تھی اور وہ چکمادے کر قاضی پیٹھ بھاگ جانا چاہتا تھا کہ انوکھے موہنی کو تھانہ لے گیا اور پولس کی مدد سے وہ گنیشی کو گاڑی سے اتار لایا۔ تھانہ پر انوکھے نے جو رپورٹ لکھوائی تھی اس میں گنیشی پر موہنی کی عصمت دری کے علاوہ یہ الزامات بھی لگائے تھے کہ اس نے قاضی پیٹھ کی رام پیاری کا ناجائز حمل ساقط کرایا تھا اور لال کنور کو اغوا کر کے حبس میں رکھا اور پھر قتل کر دیا جس کی لاش اسی مقفل مکان میں پڑی ہوئی ہے۔

اتنی دیر میں سامنے کا مکان کھلوایا گیا اور پولس انسپکٹر سرکاری ڈاکٹر اور مالک مکان کے ساتھ مجھے اور میر محلہ کو لئے اندر داخل ہوا۔ مکان کے اندر مارے تعفن کے دم گھٹنے لگا تھا اور ہم نے جو نظارہ اندر دیکھا وہ بیان کرنے کی قلم میں طاقت نہیں یقین جانئے میرا سر چکرا گیا بمشکل دیوار کا سہارا لے کر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ فرش پر ایک جوان عورت کی لاش خون میں لت پت پڑی ہوئی تھی۔ اسے قتل ہوئے کافی عرصہ گزر جانے کی وجہ سے شکل پہچانی نہ جاتی تھی۔ مارے بدبو کے دم گھٹنے لگا تھا یہ قیامت خیز نظارہ دیکھ کر میرے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ نہ جانے پولس انسپکٹر اور ڈاکٹر نے کیا کارروائی کی مجھے تو کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ میرے کانوں میں جیسے اس پگلی لال کنور کی آواز گونج رہی تھی۔

"بابو جی! میں ہیروئن بنوں گی —"

لیکن شہرۂ آفاق ایکٹرس یا ہیروئن بننے کے بجائے وہ میرے اس دردناک افسانے کی ہیروئن بن کر رہ گئی۔



۱- یہ کہانی پہلی دفعہ "سالنامہ شمع دہلی" (جنوری ۱۹۵۱ء)
میں اشاعت پذیر ہوئی تھی۔

۲- ہندی زبان کے ایک شریف کہانی نویس "شری پروا
اُسے دیدہ دلیری سے لفظ بلفظ سرقہ کرکے ایک ہندی
پتریکا "منوہر کہانیاں" (ستمبر ۱۹۵۱ء) میں "جلی ہوئی بلائی"
کے عنوان سے اپنے نام سے شائع کرنے کے ناقابلِ معافی جرم
کے مرتکب ہوئے تھے۔

۳- پونہ کے مراٹھی مایک "نہاراشٹر" کی اکتوبر ۱۹۵۲ء
کی اشاعت میں ایک معزز مراٹھی مصنف "شری منوہر دیکھنے"

نے اس کہانی کا عنوان "وِجھلے لی کا ڈی" بدل کر اسے اپنے نام سے شائع کر کے کہانی کے اخیر میں صرف (ماخوذ و مستعار) لکھنے کی غلطی کی۔ اس سلسلہ میں موصوف نے نہ تو اصل مصنف سے اجازت حاصل کی اور نہ ہی کوئی حوالہ دینا ضروری سمجھا تھا۔

۴۔ لہٰذا اردو زبان کے افسانہ نگار جناب "سلیم انجم" نے اسے غیر زبان میں پڑھکر اس قدر پسند فرمایا کہ آپنے اس کا دوبارہ اردو میں ترجمہ کرنے کی زحمت گوارہ فرمائی اور اسے "نلنی" عنوان سے "رسالہ جمالستان دہلی" جون ۱۹۵۵ء میں شائع فرمادیا۔ موصوف نے کہانی کے اختتام پر "فلاں زبان سے ترجمہ" لکھنا ضروری سمجھا لیکن اصل مصنف سے اجازت حاصل نہ کرنیکی غلطی کر بیٹھے۔

ان سرقہ، نقل یا بلا اجازت ترجمہ کرنے والوں کے خلاف مصنف کی جانب سے کوئی قانونی کارروائی کی جانے سے قبل ہی ان تینوں حضرات نے اپنی چوک بھول پر اظہار ندامت کرتے ہوئے مصنف سے معافی مانگ لینے کی شرافت برتی اور اس طرح یہ سنگین معاملہ بیرون عدالت ہی بڑی نرمی سے رفع دفع ہو گیا۔

۵۔ "جلی ہوئی دیا سلائی" پروفیسر پی۔ من بابی کی "ماسٹر پیس" کہانی ہے اس میں ذرا شک نہیں۔ اس کہانی کا ترجمہ تلگو، گجراتی اور بنگلہ زبانوں میں بھی مصنّف کی اجازت سے شائع ہو چکا ہے۔ اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس زبان میں بھی یہ کہانی چھپی ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ ذرا آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

پبلیشر

"جلی ہوئی دیا سلائی"

آج میں اپنا اٹھارواں ناول مکمّل کر چکا تھا۔

اب انتساب لکھ کر مجھے اطمینان کا سانس لینا تھا۔ یہ پبلیشر تو بس سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔ تقاضوں پر تقاضے کرنا ان کی سرشت میں داخل ہے۔ اِس ناول کو کسی کے نام سے معنون کر کے پبلیشر صاحب کو کل ہی بھجوا دونگا۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ اس کا انتساب کس کے نام کیا جائے؟ اس سے قبل سترہ ناولوں کو میں اپنے کچھ دوستوں، ادیبوں اور چند عزیز طلبا اور طالبات کے نام ارپن کر چکا تھا۔ یہ اٹھارواں انتساب کس کے نام ہو۔۔۔؟ اُس جھونپڑی میں ایک چٹائی پر بیٹھا میں سوچنے لگا۔ ٹین کے اوندھے ڈبّے پر رکھا ہوا دیا جل رہا تھا اور اس کے دھوئیں سے ایک لکیر نکل کر جھونپڑے کی فضا میں دُھندلاہٹ پیدا کر رہی تھی۔ چُوہے نے سیاہی اُلٹ دی تھی۔ اپنے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ نہ جائے اِس خیال سے میں نے ناول کا آخری باب پنسل سے پورا کر لیا تھا۔ سیاہی کا بڑا دھبہ نصف چٹائی پر اور نصف فرش پر اب خُشک ہو چکا تھا۔ اس دھبے سے تھوڑے ہی فاصلے پر میرے لکھے

ہوئے کاغذات بکھرے پڑے تھے۔ اور میں دوزانو بیٹھا، اب انتساب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس سوچ بچار کے دوران میں میری نگاہ اِس سیاہ بدنما داغ پر جم جاتی تھی۔ پنسل کا سرا دانتوں میں دبائے میں سوچنے لگا۔ سترہ ناولوں میں کھیپے ہوئے دوستوں اور واقف کاروں کے علاوہ ایک ایک شناسا کی شکل میری نگاہوں کے سامنے آنے لگی ــــ آیا انتساب اِس رفیق کے نام کیا جائے یا فلاں ادیب کے نام ــــ میں بس فیصلہ ہی کرنے والا تھا کہ ......

ایک گورا گورا پاؤں ــــ اور پھر دو ــــ اس سیاہ دھبے کے آس پاس دو پاؤں آکر رُک گئے ــــ وہی گورے گورے دو پاؤں جن سے میری نظریں خوب شناسا ہو چکی تھیں ــــ میں نے کسی قدر سر اُٹھا کر اُن پاؤں کی مالکہ کو دیکھا۔

نلّو ــــ خوبصورت نلنی اپنے دلفریب چہرے پر معصومیت لیے، چائے کی پیالی اپنے نازک ہاتھوں میں تھامے کھڑی تھی۔ گورے گورے پاؤں والی نلّو ــــ! نہ صرف نلنی کے پاؤں ہی گورے تھے بلکہ چہرہ بھی گورا اور جاذبِ نظر تھا، گلا اور گردن بھی گوری تھی، دونوں بازو اور دونوں ہاتھ پاؤں بھی سڈول اور گورے تھے، اور ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیاں بھی دلفریب اور گوری گوری تھیں۔ لیکن علاوہ پاؤں کے اُس کے جسم کے یہ دوسرے حصّے میں نے بہت کم دیکھے تھے۔

جب میں لکھتا ہوتا نلنی چائے لیکر آتی اور مجھے اس کے آنے کا پتہ سب سے پہلے یہی دو گورے گورے پاؤں دیتے، جو اس وقت سیاہی کے

کالے دھبے کے اِرد گرد رُکے ہوئے تھے ـــــ یہ سیاہی کا دھبہ اور نلّو کی زندگی ـــ! یہ بھی سیاہ وہ بھی سیاہ!! اب یہ دھبہ خشک ہو گیا ہے لیکن نلّو کا تاریک جیون اس سے بھلایا نہیں جاتا۔

میں نے نلّو سے چائے کی پیالی لے لی۔ اور ایک گرم گرم چُسکی لے کر اُسے اپنے سامنے رکھ دیا ـــ نلّو جا چکی تھی۔ میں اس لذیذ چائے کو دیکھتا ہوا نلّو کے بارے میں سوچنے لگا ـــ

یہ حُسن کی دیوی نلنی نہ میری بہن تھی نہ بیوی نہ اس سے میرا اور کوئی رشتہ تھا۔ پھر بھی آبادی سے دُور گاؤں سے باہر اس جھونپڑے میں ہم دونوں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ وہ جوان اور سُندر تھی۔ میں بھی بدشکل اور بوڑھا نہیں تھا۔ پھر بھی ہم ایک گاڑی میں سفر کرنے والے دو اجنبی مسافروں کی طرح اِس کُٹیا میں جیون بتا رہے تھے۔ یہ کُٹیا اس چھوٹے سے گرام سے باہر گرام مکھیا کے باغ میں بنی ہوئی تھی۔ اور گاؤں کے مکھیا کا یہ باغ ندی کے کنارے بڑے پُر فضا مقام پر تھا۔ یہ گاؤں نہ میرا پیدائشی مقام تھا نہ نلنی کا میکہ یا سسرال۔ یہاں میں بھی پردیسی تھا اور نلّو بھی اجنبی تھی۔ گرام مکھیا کا لڑکا رجّب میرا شاگرد تھا اور اس نے گرمیوں کی طویل تعطیلات گذارنے کے لئے مجھے یہ جھونپڑا خالی کرا دیا تھا ـــ اور میں نے اپنے اٹھارویں ناول کی تکمیل کے لئے یہیں بسیرا اختیار کر لیا تھا۔

اس باغ میں دو جھونپڑیاں تھیں۔ ایک ندی کے کنارے کے رُخ والی یہی میری قیام گاہ اور دوسری باغ کے پچھمی سرے پر بنی ہوئی

تھی، جس میں چھدّا مالی اپنے بیوی بچّوں کے ساتھ رہتا تھا جب تک نلّو اس جھونپڑی میں نہیں آئی تھی، چھدّا کی بیوی ہی میری روٹی اور چائے کا انتظام کرتی تھی۔ اس کے بدلے میں جو چند ٹکے میں چھدّا کو دے دیتا تھا وہ میاں بیوی اُسی پر خوش ہو جاتے تھے۔ اب نلّو کے آجانے سے چھدّا کی یہ آمدنی رُک گئی تھی۔ نلّنی نے یہ سارے کام سنبھال لئے تھے پر اب بھی چھدّا گاہے گاہے خوشبودار، خوشنما پھول مجھے لا دیا کرتا تھا اور میں اُسے کچھ نہ کچھ "بخشیش" دے دیتا تھا۔ لیکن یہ معمولی رقم اس معاوضہ کے مقابلہ میں بہت تھوڑی ہوتی جو کہ اُسے میری چائے اور روٹی کے انتظام کا مِلا کرتا تھا۔ شائد اسی کارن چھدّا اور اس کی بیوی کو نلنی کا آنا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

جو پھول چھدّا مالی اور اس کی مالن مجھے لا دیتے تھے اُن میں سے ایک یا دو گلاب کے پھول میں اپنے لئے رکھ لیتا اور باقی سارے نلنی کے سپرد کر دیتا تھا۔ نلّو اُن میں سے چند پھول گلدستہ کی شکل میں پرو کر ایک گلدان ..... گلدان کاہے کا ایک ٹوٹی ہوئی صراحی کی گردن میں لگا کر میری چٹائی کے سرہانے رکھ دیا کرتی تھی۔ بچے ہوئے پھولوں سے بنائی ہوئی لڑیاں لبا اوقات اُس کی ناگ جیسی چوٹی میں لہراتی نظر آتی تھیں۔

میری نظر صراحی کی گردن میں لگے ہوئے گلدستے پر جا پڑی۔ جو پھول صُبح لگائے گئے تھے وہ اب مرجھا چکے تھے ـــ مرجھائے ہوئے پھول اور سیاہی کا یہ کالا دھبّہ ـــ اپنی خوشبو سے فضا کو مہکانے

والے اور چند لمحے خوشنما نظر آنے والے پھول، آنکھوں کو ٹھنڈک اور دماغ کو فرحت بخشنے کے لئے لگائے گئے تھے۔ لیکن اس وقت وہ مرجھا چکے تھے۔ میں اب اُن کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اور اسی طرح یہ سیاہ دھبہ میرے سامنے تھا۔۔۔ یہ دھبہ اُس روشنائی کا تھا جو میری کہانیوں کے لئے تھی۔ لیکن ایک چوہے نے اُسے اُلٹ دیا اور اب چٹائی کے کونے اور فرش پر اس کا وجود بدنما معلوم ہو رہا تھا۔۔۔ گلدان میں مرجھائے ہوئے پھول بدل دئے جا سکتے ہیں، لیکن یہ بدنما سیاہ داغ مٹائے نہیں مٹے گا۔۔۔ نلنی کے جیون کو میں نے روشنائی کے کالے دھبے سے غلط تشبیہ تو نہیں دی تھی۔ اس پری چہرہ لڑکی کا وجود کس لئے تھا اور وہ اب کس مقام پر تھی ۔۔۔ میری اس سیاہی کو اگر کوئی چوہا لڑھکا نہ دیتا تو اسی سیاہی سے میں اپنا اُنیسواں ناول لکھ کر ادبی دنیا میں ایک مثال قایم کر دیتا۔ لیکن کسی چوہے نے دوات لڑھکا دی اور وہی سیاہی ایک بدنما دھبہ بن کر رہ گئی ۔۔۔ ایک ایسا داغ جو ماسوا بدنمائی کے اور کسی مطلب کا نہ رہا تھا، نلنی کے تاریک جیون کی طرح ۔۔۔ اور نلنی کے پرسکون جیون میں انتشار کا باعث بھی تو کوئی ایک چوہا ہی تھا۔ نِکّو نے مجھے اُس کا نام نہیں بتایا تھا ۔۔۔ بھلا کون ہو گا وہ جس نے اس معصوم دوشیزہ کے سنہرے سپنوں کو ملیا میٹ کر دیا اور اُس کا جیون تاریک بنا کر رکھ دیا۔

اس مصیبت زدہ لڑکی کی روداد سُن کر میرے رونگٹے کھڑے

ہوگئے تھے۔ بقول اُس کے اس کا جینا اب غیر ضروری تھا۔ وہ اپنے وجود کو اس دھرتی پر ایک بوجھ سمجھ رہی تھی، ایک بے کار اور بدنما شے، بالکل اس کانے دھبّے کی طرح۔

"پریم بابو، آپ کی چائے ٹھنڈی ہوگئی ہے——"

نلّو نے گویا مجھے نیند سے چونکا دیا۔ وہ شائد دروازہ میں کھڑی مجھ کو دیکھ رہی تھی۔ اُس نے یہی دیکھا ہوگا کہ میں نے چائے کی ایک چسکی لی اور پیالی کو نیچے رکھا، تو بس وہ رکھی ہی رہ گئی اور میں نے پھر کوئی گھونٹ نہ لیا۔ اس سے قبل تو میرا یہ معمول تھا کہ میں لکھنے کے دوران میں نلّو نے پیش کی ہوئی چائے کے پیچھے بعد دیگرے گھونٹ لیتا چلا جاتا تھا۔ لیکن اس وقت صرف ایک گھونٹ میں نے ایسا پیا کہ لکھنا لکھانا موقوف کرکے بس خاموش ہی بیٹھا رہا۔ اور بیچاری نلنی شائد یہ سمجھی ہو کہ مجھے چائے پسند ہی نہ آئی——

"اوہ!" میں نے خجالت سے کہا اور چائے پینے لگا۔

واقعی چائے بدمزہ ہوگئی تھی۔ بھلا ٹھنڈی چائے میں بھی کوئی ذائقہ ہوتا ہے؟ مجھے ایکدم اپنے ایک بچھڑے رفیق کا خیال آگیا، جو ہمیشہ چائے کو برف کرکے پینے کا عادی تھا۔ پرکاش——!

ارے ہاں۔ اس ناول کا انتساب میں پرکاش ہی کے نام سے کیوں نہ کردوں——؟

پرکاش—— میرا بچھڑا ہوا دوست!

اب میں اس پرکاش ہی کے بارے میں سوچنے لگا۔

نظام آباد کے مہاجن کا اکلوتا بیٹا تھا وہ ـــ اس کا باپ مزدوروں، کسانوں کو تاڑی پینے کے لئے روپیہ قرض دیا کرتا تھا۔ چوگنا بیاج لگاتا اور ان کی فصلیں کاٹ کر وصول کر لیا کرتا تھا۔ اپنے دھان کے لہلہاتے کھیتوں سے وہ بیچارے جفاکش کسان ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ اور وہ لوبھی سرمایہ دار اس طرح ان کاشتکاروں کا خون چوس چوس کر اپنی پیاس بجھاتا رہتا تھا ـــ مگر پرکاش باپ کے خلاف تھا۔ صرف اسی رویّہ کے کارن وہ ہمیشہ باپ سے جھگڑتا رہتا تھا۔ باپ کی یہ حرکت اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ لیکن مجبور تھا۔ بیچارہ، باپ کا کچھ نہ بگاڑ سکتا تھا۔ بعد میں وہ مقامی کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں بھی آنے جانے لگا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پرکاش سے میری پہلی ملاقات "نظام کالج ہوسٹل" میں ہوئی تھی۔ میں ان دنوں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ ایک روز میں اپنے ایک شاعر دوست امرت سے ملنے نظام کالج ہوسٹل گیا تھا۔ اور وہیں پرکاش مجھے مل گیا۔ اس ملاقات سے قبل وہ مقامی رسائل میں میرے چند افسانے پڑھ چکا تھا۔ مجھ سے مل کر بس کھل اٹھا ـــ اور پھر ہماری دوستی بڑھتی گئی۔ میں نے پرکاش کی طبیعت میں عاشق مزاجی پائی تھی۔ وہ اکثر لڑکیوں کی تاک جھانک میں لگا رہتا تھا۔ اُن دنوں لکھی گئی اپنی کہانیوں میں پرکاش کا کردار میں عریاں کرتا رہا۔ جنھیں پڑھ کر وہ خود بھی متاثر ہو جاتا تھا اور مجھ سے کہنے لگتا تھا ـــ

"پریم! ابھی داد دیتا ہوں تیرے افسانوں پہ۔ واقعی اصلیت تو نے خوب بیان کی ہے۔ لیکن یار! مجھے ڈر ہے کہ تو اس کافر فسانہ نگاری کو مونہہ لگا کر اپنے آپ کو تباہ کرے گا۔ معاف کرنا، تیرا مستقبل مجھے بھیانک نظر آرہا ہے۔ اب بی۔ اے ایم۔ اے کیا ہونا ہے تو نے! بس ناول نگاری ہی کو اپنا کر رہ جا۔ پر ذرا یہ تو سوچا ہوتا میرے یار، کہ بھارت جیسے ملک میں تیرے جیسے کہانی نویسوں کو پالنے کا کون ٹھیکا لے گا۔؟ لیکن ہم کتنا ہی کہیں تو پہلے آدمی تجھ پر کچھ اثر نہ ہوگا ــــ یہ کافر مونہہ لگ کر نہ چھوٹے گی۔ مگر یار پریم! کسی دن تو اتفاق سے اگر سچ مچ بڑا مصنف بن بیٹھا تو اپنے اس پرکاش کو نہ بھلا دیجو۔ اپنی کسی چیٹ پٹی کتاب کا انتساب اپنے اس عاشق مزاج دوست کے نام بھی کر دیجو ــــ"

نو سال بیت گئے اس واقعہ کو ــــ لیکن مجھے ایسا لگ رہا ہے گویا کل ہی کی بات ہے۔ اس طویل مدت میں کتنی ہی تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ اپنی عشق بازی میں پرکاش بی۔ اے تک نہ کر سکا۔ ایک کالج کماری کے ساتھ بدنام ہو کر کالج سے نکال دیا گیا۔ پھر نظام آباد جا کر باپ سے بٹوارہ شروع کر دیا۔ کچھ دنوں کیلئے وہ مقامی کمیونسٹ پارٹی کا سکریٹری بھی چن لیا گیا تھا۔ بعد میں سنا گیا تھا کہ اس کے باپ کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اخباروں میں یہ خبر میں نے پڑھی تھی۔ کسی نوعمر کاشتکار پر اس قتل کا مقدمہ بھی چلتا رہا تھا ــــ اس دوران میں میں ایم۔ اے فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہو کر پروفیسر ہو گیا۔ کالج لائف میں محبت کی

ایک ٹھوکر مجھے بھی کھانی پڑی تھی۔ پرکاش کی طرح چھچھوری عشق بازی تو میں نے کی نہیں۔ البتہ ایک پاکباز لڑکی کو میں نے ضرور چاہا وہ بھی مجھ پر جان چھڑکنے لگی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو جیون ساتھی بنانے کے خواب ہی دیکھ رہے تھے کہ غربت اور امارت کی ٹکر ہوئی۔ اس کے باپ نے اسے ایک سرمایہ دار کے پلّے باندھ دیا اور میں دل مسوس کر رہ گیا۔ کیا کرتا چپ ہو رہا! میرا قصور صرف یہ تھا کہ میں نہ کوٹھی کا مالک تھا نہ میرے کوئی کار تھی۔ اور مقابل میں ایک بڑا صاحبِ ثروت تھا۔ میں نے پریم کی یہ ٹھوکر ایسی کھائی کہ سنبھل نہ سکا۔ اس ناکام محبت کی چبھن نے میری تحریر میں خونِ جگر بھر دیا۔ کہانیاں اور بھی تیز رفتاری سے لکھنے لگا۔ بقول ؎

اشکوں میں کوئی حسن ہی پایا نہیں جاتا
جب تک کہ لہو دل کا ملایا نہیں جاتا

اور شاید یہی وجہ ہے کہ میری تحریریں کامیاب رہیں۔ میری کتابیں ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ اور آج میرا یہ اٹھارواں ناول پریس جانے والا تھا۔ میں اسے اپنے پرانے رفیق پرکاش ہی کے نام سے معنون کروں گا۔ اس خیال سے میں نے انتساب کا خالی صفحہ نکالا اور لکھنے لگا——

انتساب

اپنے عاشق مزاج دوست

پرکاش

کے نام

جس نے عشق بازی میں .... "

میں ابھی اتنا ہی لکھنے پایا تھا کہ نلّو کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

وہ پوچھ رہی تھی۔ " کیا چائے بدمزہ ہے پریم بابو؟"

آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی وہ قریب آکھڑی ہوئی تھی۔ اس کے گورے گورے پاؤں اُن مرجھائے ہوئے پھولوں اور کالے دھبے کے بیچ میں تھے۔ ان پر نظر جمائے میں نے کہا۔

" نہیں نہیں نلّو، چائے تو بڑی لذیذ ہے۔"

اور میں نے پیالی ہونٹوں کو لگا کر اس ٹھنڈی چائے کا ایک گھونٹ اور پیا۔ اور بولا۔

" بات یہ ہے نلنی کہ اس سوچ بچار میں میں کچھ ایسا مدہوش ہوگیا تھا کہ اس مزیدار چائے کی موجودگی بھی فراموش کر گیا۔ حالانکہ یہ پوری برف ہو رہی ہے، پھر بھی مزا نہیں گیا۔"

مزید ایک گھونٹ میں نے پیا اور بولا۔

میرا ایک دوست تو گویا عادی تھا ٹھنڈی چائے پینے کا۔ اور دیکھو، میں آج اپنے اُس بچھڑے ہوئے ساتھی کے نام اس ناول کو معنون کر رہا ہوں۔"

نلنی اب قدرے ڈھیلی ہو چکی تھی۔ وہ میرے سامنے دیا رکھے ہوئے ٹین کے ڈبے کے پاس بیٹھ گئی۔ دیے کی بتی پر "گل" آگیا تھا، جو بجائے روشنی کے دھوئیں کی تخلیق کا باعث ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا، نلنی کی زندگی کی تشبیہ اس سے بہتر اور کسی چیز سے نہیں دی جا سکتی۔ یہ دیا جو

روشنی کے لیے بنایا گیا ہے اُس کی بتی پر "یہ گُل" نمودار ہو کر مقصد ہی فوت کئے دے رہا ہے۔ دیکھئے نا روشنی تو برائے نام ہو رہی ہے اور دھوئیں کی ریل پیل ہے ۔۔۔ واقعی نلّو کا جیون اس "گُل" والے دِئے کے مشابہ ہے۔

کچھ بولنا چاہیئے اس خیال سے میں نے کہا۔

"اچھا نلّو! کیا تم میری اس کہانی کو پڑھ چکی ہو؟ کیا رائے ہے تمہاری اس کہانی کے متعلق ۔۔۔؟"

ٹین کے ڈبّے کے پاس رکھی ہوئی تیل کی بوتل اٹھا کر نلنی قدرے محجوب سی ہو کر بولی ۔۔۔ "آپ نے دو باتیں خصوصیت سے بیان کی ہے اس کہانی میں ۔۔۔"

میں اس کہانی کے بارے میں نلنی کی رائے معلوم کرنے کے لئے بیقرار ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی مشتاق نظریں اس کے دلفریب چہرے پر گاڑ دیں اور مجسم کان بن بیٹھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ نلنی اس وقت نہایت ہی شاداں و فرحاں ہے۔ اُس دِن جبکہ وہ مجھے ملی تھی میں نے اُسے نظر بھر کر دیکھا تھا اور اس کے بعد آج ہی اسوقت میں اُسے بے تابی سے گھور رہا تھا۔ نلنی کے اُس دِن کے روپ میں اور آج کے اِس نکھرے حسن میں مجھے کافی فرق محسوس ہو رہا تھا۔

یہ باغ ندی کے کنارے پر تھا اور میں روزانہ سہ پہر ندی کے بہاؤ کے رُخ گاؤں سے تقریباً دو ڈھائی میل کے فاصلہ تک تفریحاً چلا جایا کرتا تھا۔ اُس روز گرام مکھیا کا فرزند رجب بھی اتفاقاً میرے

ساتھ تفریح کے لئے چل پڑا تھا۔ ہم دونوں ندی کے کنارے کنارے چل رہے تھے کہ رجب کہنے لگا " ذرا آگے چلنے پر اس ندی پر ایک بہت بڑا ریل کا پُل بنا ہوا ملے گا۔ اگر آپ پسند کریں تو ہم وہیں جاکر بیٹھیں گے۔" میں نے رضامندی ظاہر کی اور ہم چل پڑے۔
جس وقت ہم اُس پُل پہ پہنچے تھے تو دُور سے ریل گاڑی آتی ہوئی دکھائی دی۔ پُل زیادہ چوڑا نہیں تھا، البتہ اونچا بہت تھا۔ ریل گاڑی آتی دیکھکر ہم نیچے اُتر آئے اور چھوٹے بچوں کی طرح پُل پر سے گاڑی گذرنے کا نظارہ دیکھنے کے لئے ندی کے کنارے جا کھڑے ہوئے۔
جب گاڑی پُل پر سے گذرنے لگی تو ہم نے دیکھا کہ وہ مال گاڑی تھی۔ چھک چھک کرتی ہوئی وہ پل پر سے چلی جارہی تھی کہ اُس میں سے کوئی چیز گیند کی طرح اُچھل کر ندی کے پانی میں چھپاک سے گری۔ ہم نے غور سے دیکھا —— کوئی لڑکی پانی میں غوطے کھا رہی تھی۔ ندی کا پانی خصوصاً پُل کے پاس زیادہ گہرا تھا۔ پھر بھی میں نے عجلت سے کام لیا اور پانی میں چھلانگ لگادی، اور اس لڑکی کو زندہ سلامت ندی سے باہر نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ زرد رنگت کی ایک جوان لڑکی میری گود میں تھی —— یہی وہ نلنی ہے۔ اُس دن کا اس کا پیلا مرجھائے پھول سا چہرہ، اور آج اس کڑوے تیل کے ٹمٹماتے دیے کی روشنی میں کندن سا دمکنے والا نکھڑا —— اس دن تو وہ ایک زندہ لاش کے مترادف تھی۔ لیکن آج وہ شباب کی پوری جولانیوں سے بدمست ہوئی جارہی تھی۔

" آپ نے دو باتیں خصوصیت سے بیان کی ہیں اس کہانی میں۔" بوتل میں سے تیل دیئے میں ڈالتی ہوئی نلنی کہنے لگی۔

"پہلی بات، ایک جوان مرد اور ایک خوبصورت اجنبی لڑکی حالات سے مجبور ہو کر، ایک ہی کمرے میں رین بسیرا کرتے ہیں، اور ان سے کوئی لغزش نہیں ہوتی —— دوسری بات، آپ کا ہیرو ایک تعلیم یافتہ، کنوارہ، شکیل نوجوان ہے۔ اور ہیروئن سماج کی ٹھکرائی ہوئی الھڑ چھوکری جو اپنے گوہرِ عصمت کی حفاظت نہ کر سکی تھی اور کسی آوارہ منش کی ہوس کاری کا شکار ہو گئی تھی۔ اتفاقاً وہ اس ہیرو سے ملی —— اور آپ کا ہیرو، اس کے حالات معلوم کر کے بجائے اس پر پھٹکار بھیجنے کے اُس سے شادی کر لیتا ہے ——"

تیل کی بوتل وہیں ڈیٹے کے پاس رکھ کر نلنی نے ایک بار مجھے دیکھا۔ حالانکہ اس کی دلکش آنکھیں مجھے سب کچھ بتا چکی تھیں، پھر بھی میں نے پوچھا۔

"تو، تمہاری کیا رائے ہے نلّو ۔؟"

اپنے لبوں پہ شرم آنگیں مسکراہٹ نمایاں کئے وہ بولی "آپ بُرا نہ مانئے گا پریم بابو —— میں صحیح رائے بتاؤں گی، جھوٹ نہیں بولوں گی۔"

مزید تیل دیئے میں ڈال دینے کے باوجود روشنی میں کوئی خاص فرق نہیں ہوا تھا، لیکن نلنی کا حسن تھا کہ نکھرتا ہی جا رہا تھا۔ وہ ہلکی آواز میں کہنے لگی۔

"اِن دو باتوں میں سے ایک پر میں آپ سے متفق ہوں۔ اور — اور — دوسری —؟"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر پھر پُر خلوص نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے چائے کا آخری گھونٹ حلق میں اُتار لیا۔ اور اسے اطمینان دلانے کے لئے بولا۔ "کہو نلّو۔ میں حقیقت معلوم کرکے بُرا نہیں مانتا، بلکہ تصنّع اور بناوٹ سے مجھے چڑھ ہے۔"

"اور دوسری ..... دوسری بات سے مجھے اختلاف ہے۔" نلنی نے قدرے جھجک سے کہا اور نظریں جھکا لیں۔

"نلّو! کیا میں معلوم کر سکتا ہوں کہ کس بات سے تمہیں اختلاف ہے" میں نے خالی پیالی پرچ پر رکھتے ہوئے بے تابانہ پوچھا۔

وہ کچھ لجاتی ہوئی بولی — "سماج کی ٹھکرائی ہوئی ہیروئن سے ایک شریف ہیرو کی شادی ہو جانا — موجودہ دور میں ایک ناممکن بات ہے یہ — بالکل اَن ہونی ۔" اس نے نیچی ہی نظریں کئے ہوئے کہا اور پاس پڑی ہوئی ایک جلی ہوئی دیا سلائی اُٹھا کر دیئے کی بتی کے گُل کو جھڑانے لگی۔

میں نلنی کے جواب پر غور کرنے لگا۔ پہلی بات سے نلّو کو اتفاق تھا۔ ایک جوان مرد اور ایک اجنبی دوشیزہ کا ایک کمرے میں شب گذارنا اور کسی لغزش کا شکار ہونے سے بچ جانا — یہ تو اُس کی اور میری آپ بیتی کی ایک جھلک تھی۔ وہ جوان تھی اور دلکش اعضا کی مالکہ بھی — اور ادھر میں بھی ایک جوان مرد تھا۔ ہم دونوں کو حالات

نے اکٹھا کر دیا۔ اور کئی راتیں ہم اس جھونپڑے میں بتا چکے ہیں لیکن ہم نے کوئی پاپ نہیں کیا۔

دوسری بات سے نلنی متفق نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے خیال میں یہ ناممکنات میں سے تھا کہ سماج کی ٹھکرائی ہوئی لڑکی سے کوئی شریف نوجوان شادی رچانے کا حوصلہ کر سکے۔

نلنی کے مل جانے کے بعد ہی میں نے یہ کہانی لکھی تھی۔

خودکشی کرنے کے ارادے سے مال گاڑی سے چھلانگ لگانے والی نلنی — اُس نے بیان کی ہوئی آپ بیتی سے متاثر ہوکر ہی یہ افسانوی ترنگ میرے سازِ قلم سے اُٹھی تھی — اپنی سادہ لوحی سے، ایک فریب کار کی ہوس کا شکار ہو چکی تھی بیچاری — اور انجام کار اس نے بے حیائی کی زندگی بتانے کے بجائے، اپنے آپ کو موت کی آغوش میں دے دینا مناسب سمجھا تھا۔ اُس دن اپنی معصوم اور پیاری آنکھوں سے آنسوؤں کی بے شمار لڑیاں بکھیرتی ہوئی وہ بولی تھی —

"میں ایک دکھیا ہوں بابو جی — میں نے پاپ کیا ہے — گھور پاپ! اچھا ہوتا کہ مرنے ہی دیا ہوتا آپ نے —!!"

اور پھر نلنی نے میرے اصرار پر اپنی دلدوز کہانی سنائی تھی۔ مقامات اور کرداروں کے نام واضح نہیں کئے تھے اُس نے —

نلنی نے ایک غریب مزدور کے ہاں جنم لیا تھا۔ اُس کا باپ ایک سرمایہ دار کے زیر سایہ محنت مزدوری کر کے پیٹ بھرتا تھا۔ اسی مشقت کی کمائی سے اُس نے نلنی کو اپنی حیثیت کے مطابق زیور تعلیم

سے آراستہ کیا گیا تھا۔ جب سیٹھ کی بیوی کا انتقال ہو گیا تو سیٹھ کے کہنے پر بوڑھا باپ نلنی کو سیٹھ کے گھریلو انتظام کی نگرانی کرنے کے لئے کوٹھی میں لے آیا۔ سیٹھ جی ایک آوارہ کپوت کے باپ بھی تھے۔ وہ صاحبزادے نلنی پر ڈورے ڈالنے لگے۔ یوں تو نلنی کے حسن وشباب کو دیکھکر سیٹھ جی کی بھی رال ٹپکنے لگی تھی، شاطر بیٹا کھوسٹ باپ کے ارادے کو تاڑ گیا۔ پھر باپ راستے سے ہٹا دیا گیا اور بیٹے نے معصوم نلنی کو سیٹھانی بنانے کا لالچ دے کر رام کر لیا — بھولی الھڑ دوشیزہ فریب میں آگئی۔ اور وہ نلنی کو اپنی ہوس کاری کا شکار بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ چند روز تک اُن کے ناپاک تعلقات قائم رہے۔ اور جب نلنی کو پتہ چلا کہ فطری طور پر اس کے پاپ کا انکشاف ہونے والا ہے تو اس نے، اُس سے شادی کرنے کی استدعا کی لیکن حاملہ ہونے کی خبر سن کر اُس بدکردار نے طوطا چشمی اختیار کر لی۔ نہ صرف نلنی کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آنے لگا بلکہ اُس کی نظروں کے سامنے ایک اور چھوکری سے اُسی ڈرامہ کی "ریہرسل" کرنے لگا۔ نلنی نے اپنے بوڑھے باپ کو ہنوز اِن واقعات سے تاریکی میں رکھا تھا۔ وہ تو اپنے آپ کو عنقریب ہونے والی سیٹھانی سمجھ کر، میٹھے سپنوں میں مدہوش ہوئی جا رہی تھی۔ جب اُس مکار کا فریب اُس پر ظاہر ہو گیا تو وہ خودکشی کی ٹھان کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ ریل کی پٹریوں پر لیٹ کر اس نے جان دے دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس ارادہ کو لئے وہ ریلوے لائن پار کر رہی تھی کہ ایک مال گاڑی آہستہ آہستہ آ کر اُس کے سامنے

پٹریوں پر رینگ گئی۔ نلنی نے سوچا کہ اپنے شہر میں خودکشی کرنے کے بجائے بہتر یہی ہوگا کہ پردیس میں جاکر جان دے دے۔ تاکہ بوڑھے باپ کو کچلی ہوئی لاش دیکھ کر زیادہ صدمہ نہ ہو۔ اس خیال کے تحت وہ مال گاڑی کے ایک خالی ڈبے میں چھپ گئی اور موقع کی تاک میں بیٹھی رہی۔ جب مال گاڑی چلنے لگی تو اُس نے اپنے آپ کو مرنے کے لئے مستعد کرلیا۔ اور گاؤں کی اس بڑی ندی کو دیکھ کر ایکدم چھلانگ لگا دی۔ میری کوشش سے اُس کی جان تو بچ ہی گئی اور گناہ کے بارے بھی اُس نے خلاصی پالی۔ اس کا حمل ساقط ہو چکا تھا۔۔۔

نلنی نے جلی ہوئی دیاسلائی سے چراغ کا گُل جھڑا دیا اور جھونپڑی منور ہوگئی۔ اب دِئے کی لَو بڑی روشن جل رہی تھی۔ اور اس روشنی میں نلّو کا حُسن پھٹا پڑ رہا تھا۔ کچھ تامل کے بعد میں نے کہا۔ نلّو! یہ ناممکن نہیں ہے۔"

اور میں نے وہ جلی ہوئی دیاسلائی اُٹھالی جس سے نلنی نے دِئے کی بتی کا گُل جھڑا کر روشنی میں اضافہ کر دیا تھا۔ میں وہ جلی ہوئی دیاسلائی اُسے دکھاتا ہوا بولا۔۔۔

"دیکھو نلّو۔ پہلے تو اس دیاسلائی نے خود جل کر دِئے کو روشن کیا۔۔۔ پھر اس خیال سے کہ یہ سلائی جل جو گئی' اب بے کار ہے' اُسے پھینک دیا گیا۔۔۔ اُس سمے یہ گمان بھی نہ تھا کہ یہ جلا ہوا ٹکڑا کسی کام آسکے گا۔۔۔ لیکن اب تمہاری نازک' دلفریب انگلیوں کو دِئے کی لَو کے جھٹکے سے اِسی جلی ہوئی دیاسلائی نے بچایا ہے۔۔۔ دِئے

میں مزید تیل ڈالنے سے بھی وہ تاثیر پیدا نہ ہوسکی تھی جو اس جلی ہوئی دیا سلائی کے گُل جھاڑنے سے ہوئی ہے — دیکھو نا میری جھونپڑی روشن ہوگئی — نلو! اس جلی ہوئی دیا سلائی کے مانند بھی کبھی کا جیون ہے...... وہ بھی کسی کے کام آجائے تو...... !"

میں نے دیکھا نلنی کی آنکھوں سے آنسو اُمنڈنے لگے تھے۔

"آپ دیوتا ہیں پریم بابو!"

اُس نے اتنا ہی کہا اور اپنی سفید ساڑی سے آنسو پونچھنے لگی۔

پھر کچھ سوچ کر اس نے میرے سامنے رکھا ہوا انتساب کا صفحہ اُٹھا لیا۔ مجھے خیال آیا اب اس انتساب کو مکمل کر دینا چاہیئے۔ میں نے پنسل اٹھائی

نلنی قدرے جھک کر اس صفحے کو غور سے پڑھتی ہوئی تعجب سے بولی۔

"عاشق مزاج — پرکاش!"

میں نے کہا — "میرا لڑکپن کا دوست۔ میں اس کے نام سے اپنا اٹھارواں ناول معنون کر رہا ہوں — اب نہ جانے کہاں ہے بیچارہ —؟"

"یہ آپ کا عاشق مزاج دوست نظام آباد کے مہاجن کا بیٹا تھا؟"

نلنی نے مجھے دیکھتے ہوئے اُسی لہجہ میں پوچھا۔

میں نے کہا — "ہاں۔ اکلوتا بیٹا —"

"ٹھنڈی چائے پینے کا عادی — !" نلنی مجھے گھورتی ہوئی بولی۔

میں نے کہا — "ہاں، بالکل برف جیسی —"

نہ جانے نلنی کے دل میں کیا آیا کہ میرے ہاتھ سے پنسل لے لی۔ اور بولی۔

اس انتساب کی تکمیل اس طرح کی جا سکتی ہے —؟

میرا ادھورا جملہ تھا —

"اپنے عاشق مزاج دوست پرکاش کے نام، جس نے عشق بازی میں —"

نلنی نے آگے پنسل سے لکھ دیا —

"نلنی نام کی ایک معصوم لڑکی کو تباہ کیا۔ اور ان دنوں نظام آباد کی اپنی شاندار کوٹھی میں کسی اور نلنی کو پھانسنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے —"

مجھے اپنا سانس رُکتا ہوا معلوم ہونے لگا —

تو کیا وہ پرکاش ہی تھا جس نے نلنی کو کہیں کا نہیں رکھا تھا؟ اور جس نے اس لڑکی پر ہاتھ صاف کرنے کے لئے باپ کو بھی ہلاک کرنے پر دریغ نہ کیا تھا —!

میرا سر چکرانے لگا۔

اور اس شیطان کے نام میں اپنی کتاب معنون کرنے چلا تھا۔

میں نے نلنی سے پنسل لے لی — اور اُس انتساب پر لکیریں ڈال دیں۔ پھر ایک دوسرا صفحہ لیکر لکھنے لگا۔

"انتساب

معصوم نلنی کے نام

جو میرے تاریک جیون میں اُجالا بن کر داخل ہوئی۔"

اِدھر میں نے پنسل رکھی، اُدھر نلنی خالی پرچ پیالی اُٹھا کر

لجاتی ہوئی جانے لگی۔ کبھی میں، شرم و حیا کے اس مرقع کو اور کبھی اُس جلی ہوئی دیاسلائی کو دیکھنے لگا۔

واقعی، یہ جلی ہوئی دیاسلائی بھی کام آہی گئی۔

کس کا جیون مشابہ ہے اس جلی ہوئی دیاسلائی سے؟

میرا یا نلنی کا——؟"

مبارک باد

محترمی،

میں شمع کو پی من باسی کا شمارہ افسانہ "لین دین" (شمع ستمبر ۱۹۵۱ء) شائع کرنے پر مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

یہ ایک افسانہ اُن بہت سے افسانوں کی ایک کڑی ہے جن کے ذریعے شمع نہ صرف آزاد خیال لڑکوں لڑکیوں کو ان کے غیرضروری میل ملاپ کے خطرناک نتائج سے خبردار کر رہا ہے، بلکہ مصیبت زدہ لڑکیوں کی مدد کرنے والے بہادر اور نیک نوجوانوں کی مثالیں بھی پیش کر رہا ہے۔

موجودہ افسانے میں کملا کانت جی کا کردار قابل پرستش ہے۔ میرے شوہر نے بھی پچیس برس ہوئے ایسی ہی قربانی دیکر مجھے سہارا دیا تھا۔ افسوس ہے کہ آج وہ اس دنیا میں نہیں......

(نام شائع نہیں کیا جا رہا) لکھنؤ

شمع دہلی اکتوبر ۱۹۵۱ء

لین دین

شری متی پرمیلا دیوی اپنے شان دار دیوان خانہ میں تنہا بیٹھی شفیق بانو کا "فریبِ مسلسل" پڑھ رہی تھیں پچھلے ہفتہ ان کا بیٹا سریندر جب دہلی گیا تو راستہ میں کسی وہیلرس بک سٹال سے اس نے افسانوں کا یہ مجموعہ خرید لیا تھا۔ اس کی واپسی پر گوبند اس کا اسباب ترتیب سے لگا رہا تھا کہ پرمیلا دیوی نے یہ کتاب اٹھالی تھی' اور یہ سوچ کر کہ فرصت کے اوقات میں پڑھیں گے' انھوں نے اسے اپنے کمرے میں رکھ دیا تھا۔ آج ان کی سہیلی نرملا دیوی دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھا کر شام تک اُن ہی کے ساتھ ٹھہرنے والی تھیں۔ کھانوں کی تیاری میں آج انہوں نے خاص تکلف برتا تھا۔ اس لئے ابھی کافی وقت درکار تھا۔ مصراتی کو ضروری ہدایات کر کے اب وہ دیوان خانہ میں آکر ایک پنتھ دو کاج کی مصداق نرملا دیوی کا انتظار بھی کر رہی تھیں اور شفیق بانو کے افسانے بھی پڑھ رہی تھیں۔

گو باہر شدت کی گرمی پڑ رہی تھی لیکن شری متی پرمیلا دیوی کا دیوان خانہ کافی ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر خس کے پردے لگے ہوئے تھے جن پر گوبند گاہے گاہے پانی کا چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ علاوہ ازیں چھت پر

لگا ہوا برقی پنکھا درمیانی رفتار سے گھوم رہا تھا۔ اور پرمیلا دیوی "فریب مسلسل" پڑھ رہی تھیں۔

آج ہفتہ تھا۔ سریندر کا کالج اور اس کے پتا کملا کانت مجسٹریٹ کا دفتر ایک بجے ہی بند ہونا تھا' اس لئے لنچ پر سب کے اکٹھے ہو جانے کی توقع تھی۔

پرمیلا دیوی نے ابھی دوسرا ہی افسانہ ختم کیا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت گھبرائی ہوئی دیوان خانہ میں داخل ہوئی اور لڑکھڑاتی ہوئی ان کے پاس آ پہنچی۔ پرمیلا دیوی نے عینک کے کناروں سے دیکھا تو سامنے پڑوس کی لچھو ماسی بوکھلائی ہوئی کھڑی تھی۔ لچھمی ایک مزدور پیشہ عورت تھی۔ چار کمان والے سیٹھ روپ چند کے ہاں کھانا پکانے کا کام کرتی تھی۔ لیکن اس کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے سریندر اسے لچھو ماسی کہتا تھا۔ اور پرمیلا دیوی بھی ہمدردانہ سلوک کر کے وقتاً فوقتاً سبزی ترکاری اور ضرورت کی دوسری چیزیں دے کر اس کی مدد کیا کرتی تھیں۔ اس لئے لچھو ماسی جب بھی آتی تو باورچی خانہ یا پرمیلا دیوی کے کمرے ہی میں آیا کرتی تھی۔ لیکن آج اس کا اس طرح مجسمۂ اضطراب بنے سیدھا دیوان خانہ میں آ جانا خالی از حیرت نہ تھا۔

"کیا ہوا لچھمی تو اس طرح پریشان کیوں ہے؟" پرمیلا دیوی نے کتاب کو بند کرتے ہوئے پوچھا۔

چند لمحے تو لچھو ماسی کچھ بول ہی نہ سکی۔ بس ہانپتی کانپتی اُن کے سامنے کھڑی رہی۔ کچھ اور ہمت دلانے پر اس نے حیرت و استعجاب میں ڈوبی ایک اندوہناک خبر سنائی۔ لیکن پرمیلا دیوی نے جب اس سنسنی خیز خبر کو سنا تو وہ ذرا بھی سکتہ

میں نہیں آئیں اور نہ انھوں نے اپنی طرف سے کسی قسم کی حیرانگی کا اظہار ہونے دیا۔ اگر انہوں نے کچھ کیا تو صرف یہی کہ اس غریب عورت کو تسلّی دینے کے علاوہ ایک روپیہ بھی دیا اور کل سے اپنی کوٹھی میں کام کرنے کو کہہ دیا۔ اور لچھو ماسی مجسّمہ انکساری بنی ان کا شکریہ ادا کرتی اپنی پھٹی ہوئی جوتیاں گھسیٹتی ہوئی واپس چلی گئی۔

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ پرمیلا دیوی نے رسیور اٹھا لیا۔ اور بولیں۔

"ہیلو! کملا کانت مجسٹریٹ کا بنگلہ —— کس سے بولنا ہے آپ کو؟"

دوسری جانب سے آواز آئی "ماتا جی میں —— میں سرنیدر بول رہا ہوں ——" سرنیدر کی آواز کانپ رہی تھی —— "آپ نے کچھ سنا ماتا جی —— ہمارے کالج میں وہ جو مس شیاما پڑھتی تھی نا —— وہی جو میری سالگرہ کی تقریب میں ہمارے ہاں آئی تھی اور انھوں نے ایک گیت بھی گایا تھا ——!"

"ہاں بیٹا! میں پہچانتی ہوں شیاما کو۔ کہو، تم آگے کیا کہنا چاہتے ہو؟" پرمیلا دیوی نے پوچھا۔

"ہاں تو ماتا جی غضب ہو گیا —— پولیس والوں نے آج اسے گرفتار کر لیا ہے ——" سرنیدر نے اسی گھبرائی آواز میں کہا۔

"ہاں بیٹا، میں سن چکی ہوں ——" پرمیلا دیوی نے بتایا۔

"ارے! آپ کو کیسے معلوم ہو گیا؟ ابھی ابھی تو اس کی گرفتاری عمل میں آئی ہے!" سرنیدر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں مجھے بھی ابھی ابھی معلوم ہوا ہے ۔۔۔ اور یہ بھی میں سن چکی ہوں کہ شیاما کے پتاجی شریمان سیٹھ روپ چند جی بھی حراست میں لے لئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے فیملی ڈاکٹر ہری ہر کے بھی ہتھکڑی لگا دی گئی ہے۔ جنھوں نے اس مہاپاپ میں ان باپ بیٹی کو سہایتا کرنے کا جرم کیا تھا ۔۔۔"

"تو گویا پوری خبر سن چکی ہیں آپ ۔۔۔ اچھا۔ میں نصف گھنٹے میں گھر پہنچ رہا ہوں" اور ٹیلیفون بند ہو گیا۔

شری متی پرمیلا دیوی نے بھی رسیور رکھ دیا اور اپنی جگہ پر آکر پھر "فریب مسلسل" پڑھنے لگیں۔ اور کتاب کی مصنفہ کو داد دینے لگیں، جس نے مردوں کے فریب اور ہتھکنڈوں کو عریاں کر دیا تھا۔ بعینہ ایک عریاں ترین واقعہ آج اُن کے شہر میں پیش آگیا تھا۔ جس کی اطلاع سب سے پہلے انھیں مچھو ماسی دے گئی تھی۔ اس غریب نے اپنے بال سفید کرنے تھے لیکن ایسے واقعات اس نے کاہے کو سنے ہوں گے۔ کس قدر سنسنی خیز واردات ہو چکی تھی، جسے وہ بوڑھی ماسی بیان کرنے سے بھی ہچکچا رہی تھی۔ بڑی دیر میں اس نے لرزتے ہوئے دل اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے اس واقعہ کو دوہرایا تھا۔ حیدرآباد کی ایسی جلیل القدر شخصیت کی گرفتاری کوئی معمولی سانحہ نہیں تھا۔ سیٹھ روپ چند کی پراسرار گرفتاری نے سارے حیدرآباد میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ انہیں تنہا حراست میں نہیں لیا گیا تھا بلکہ ان کی اکلوتی نوجوان بیٹی شیاما اور ان کے خاندانی ڈاکٹر ہری ہر کو بھی پولیس نے پکڑ لیا تھا۔ اور ان تینوں پر الزام لگایا گیا تھا ایک تردوش بالک کی ہتیا کرنے کا جو کنواری

شیاما کے پیٹ سے ناجائز طور پر تولّد ہوا تھا۔

لیکن تعجب یہ ہے کہ اس قدر اندوہناک خبر سننے پر بھی شریمتی پرمیلا دیوی مطلق متاثر نہ ہوئیں۔ کچھو ماسی سے اس قیامت خیز خبر کو انھوں نے اس انداز سے سنا تھا جیسے انہیں شروع ہی سے علم تھا کہ ایک دن ایسا ہونے والا ہے' اور ایسا ہو کر ہی رہے گا۔ سریندر نے بھی دُکھے ہوئے دل سے یہ اطلاع سنانی چاہی لیکن انہوں نے اس پر بھی رنجیدگی ظاہر نہیں کی۔ صرف اُن کے لبوں پر ایک لمحہ کے لئے غیر ارادی طور پر طنز آمیز مسکراہٹ نمودار ہوگئی اور اسی طرح وہ اپنی جگہ پر آبیٹھیں اور کتاب کے بقایا اوراق پڑھنے میں مستغرق ہوگئیں۔

کوئی ایک ورق مزید پڑھنے کے بعد نہ جانے انہیں کیا خیال آیا کہ وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں اور کتاب میز پر رکھ کر اپنے پتی کے کمرے میں جا پہنچیں۔ اس کمرے میں داخل ہوتے ہی سامنے کی دیوار پر جو ایک ممبر نرس کی تصویر بڑے چوکھٹے میں لگی ہوئی تھی اُسے پرمیلا دیوی کوئی دو منٹ دیکھتی رہیں۔ اور ان کے چہرے پر جیسے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ پھر انہوں نے الماری کھول کر اس میں سے تصویروں کا ایک البم نکال لیا اور وہیں کرسی پر بیٹھ کر اس کی ورق گردانی کرنے لگیں۔

پہلی تصویر تھی اُن کے پتی شری کملا کانت جی کی ___ سیاہ گوان پہنے ہوئے جو انہوں نے یونیورسٹی سے ڈگری لیتے سمے کھنچوائی تھی نیچے لکھا ہوا تھا ___ "مکمل ___"

دوسرے ورق پر بسٹ پوز میں دو نوجوانوں کی ساتھ ساتھ کھنچی

تصویر تھی۔ جو کملا کانت جی نے اپنے دوست روپ چند کے ساتھ اپنے شباب کے دنوں میں کھنچوائی تھی ـــــ پرمیلا دیوی اس تصویر کو بڑے غور سے دیکھنے لگیں۔ اس تصویر کا عنوان تھا "روپ کمل" ـــــ تصویر میں آگے کملا کانت بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے" روپ چند کھڑے ہوئے تھے۔

پرمیلا دیوی نے ایک ورق اور اُلٹا ـــــ اب ان کے سامنے ان کی اپنی جوانی کی تصویر تھی نیچے لکھا تھا "مس پرمل ـــــ" اور کونے پر باریک ہندسوں میں بیس سال قبل کی تاریخ درج تھی۔ اس تصویر نے پرمیلا دیوی کو آج سے بیس سال قبل کے زمانہ میں پہنچا دیا جبکہ وہ مس پرمل کی حیثیت سے کالج میں پڑھتی تھیں۔ اور وہ سوچنے لگیں وہ بھی کیا زمانہ تھا۔؟ جوانی کی راتیں امنگوں کے دن ـــــ

مس پرمل انٹرمیڈیٹ میں پڑھتی تھی۔ انہی دنوں روپ سے اس کی ملاقات ہوئی۔ روپ ایک شکیل بانکا نوجوان، جار کمان کے لکھ پتی جوہری کا اکلوتا بیٹا۔ اس کی وجاہت اور امارت پرمل کو رام کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی ـــــ پہلے ملاقات، پھر دوستی اور تیسری منزل محبت کی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو والہانہ چاہنے لگے تھے ـــــ روپ نے ایک چاندنی رات میں چاند اور تاروں کو گواہ کر کے پرمل کو وچن دیا تھا کہ وہ اس سے بیاہ کرے گا۔ اسے اپنی دھرم پتنی بنائے گا۔ اس نے پرمل کو یقین دلایا تھا کہ اس کے بغیر روپ کے لئے جینا ناممکن ہے۔ پرمل بھی اس سے تعلقات بڑھاتی گئی۔ وہ اس کے وچن پر وشواس کر کے اس سے اندھی محبت کرنے لگی۔ وہ روپ کو اپنا ہونے والا پتی جان کر اس سے

میل بڑھاتی گئی۔ روپ اس کے ہاں آتا تھا، وہ بھی روپ کے ہاں جایا کرتی تھی۔ پرمل کا باپ ایک غریب شخص تھا۔ وہ ایک امیرزادے سے اپنی بیٹی کے اتنے گہرے مراسم پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے اشاروں کناؤں میں پرمل کو سمجھایا بھی۔ لیکن جوانی دیوانی کی مصداق پرمل تو دب کو اپناسب کچھ دینے کو تیار تھی، روپ پر مٹنے کو آمادہ تھی۔ اُس نے باپ سے کہا کہ وہ کوئی ننھی بچی تھوڑے ہی ہے۔ اسے اپنے اچھے بُرے کا امتیاز ہے۔ اور بوڑھا باپ یہ سوچ کر کہ بٹیا کالج میں پڑھ رہی ہے دنیا کی دھوپ چھاؤں سے واقف ہی ہوگی، دھوکہ نہ کھائے گی خاموش ہورہا۔

روپ اور پرمل کے سیر و تفریح اور پکنک کے پروگرام آئے دن بڑھتے گئے۔ ایک مرتبہ روپ اسے شہر سے باہر اپنے باغ میں لے گیا۔ دونوں جواں تھے، اور باغ میں تیسرا کوئی نہیں تھا۔ مالی کو روپ نے کسی بہانے کہیں بھیج دیا تھا۔ گویا دانستہ طور پر ہی اس نے ایسا کیا تھا۔ ایک گنجان جھاڑی میں روپ اور پرمل گھاس پہ بیٹھے پریم بتیاں کرنے لگے۔ شروع میں تو دونوں الگ الگ بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن پھر جب روپ اس کے قریب ہوتا گیا تو پرمل نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اس سے روپ کی ہمت بڑھ گئی اس نے پھر پرمل کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور وہ نیم دراز حالت میں اس کی گود میں لیٹی رہی۔ پہلے وہ اس کے سنہرے بالوں سے کھیلتا رہا۔ پھر اس نے اس کا بوسہ لینا چاہا۔ پرمل نے اپنے لب اوپر اٹھا لئے روپ نے اسی حالت میں اسے اور اچھی طرح اپنی آغوش کی گرفت میں لے کے

ایک دم بوسہ لے لیا ــــ پھر جب روپ کے ہاتھ کچھ زیادتی کرتے ہوئے اس پر پورا قابو پانے لگے تو پرمل نے روپ کو ہٹانا چاہا۔ اس نے کہا بھی۔

"بس پیارے روپ! زیادہ دست درازی نہ کرو ــــ چلو اب واپس چلیں ــــ بہت دیر ہوگئی ہے ــــ"

لیکن جب اس نے دیکھا کہ روپ اس پر بھی نہیں مانتا بلکہ آگے بڑھنا چاہتا ہے، تو اس نے بڑی شفقت اور منت کے ملے جلے لہجہ میں کہا۔

"پیارے روپ! شادی سے پہلے نہیں ــــ میں تمہاری بنتی کرتی ہوں ــــ ابھی نہیں ــــ ابھی نہیں۔ بیاہ سے پہلے نہیں ــــ"

لیکن .... اور وہ سسکتی رہ گئی۔

جب روپ کی اس بے دردانہ حرکت پر پرمل کی ہچکیاں بندھ گئیں تو اس نے اسے اپنی محبت اور وفاداری کا پورا پورا یقین دلا دیا اور دونوں گھروں کو لوٹ گئے ــــ راستہ بھر وہ خاموش ہی رہے ــــ ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے ــــ اور پھر آئے دن یہ کشیدگی بڑھتی ہی گئی پھر کالج کی طویل تعطیلات شروع ہوگئیں ــــ اور لمبی چھٹیوں کے بعد پرمل سے روپ طوطا چشمی اختیار کر چکا تھا۔ اور پرمل کی ایک سہیلی ریکھا نے اسے عجیب خبر سنائی ــــ چار مینار والے ایک دھنوان سیٹھ کی اکلوتی کنیا سے روپ کا بیاہ ہو چکا تھا۔ اور روپ کالج چھوڑ کر سیٹھ روپ چند کہلانے لگا تھا۔ پرمل کا دل دھک سے ہو گیا۔ اس کے رُخ کا رنگ اُڑ گیا، ہونٹ پھڑکنے لگے

جیسے لرزتی آواز میں وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن اس منحوس خبر سنانے والی ریکھا کی آنکھوں سے گنگ و جمن کی روانی دیکھ کر، وہ یہ کوشش کرنے لگی کہ اس کی نگاہ یا لہجہ سے وہ پریشانی اور اضطراب ظاہر نہ ہو جائے جو اس کے سینہ میں طوفان بپا کر رہا تھا۔ بڑے تسلی بخش لہجہ میں اس نے ریکھا سے آنسو بہنے کی وجہ دریافت کی۔ ریکھا نے روپ کی بے وفائی اور فریب دہی کا دکھڑا رو دیا۔ اور یہ بھی کہا کہ وہ بدمعاش اس یتیم لڑکی کا سب کچھ لوٹ چکا ہے اور وہ بے بس عنقریب ماں بھی بننے والی ہے۔ پریل نے جب یہ سنا تو اس کا کلیجہ بے اختیار مسوس گیا۔ دل میں کسک اور سینہ میں درد جانگداز کی ٹیس پیدا ہوئی —— اب روپ کی کمینگی اور مکاری اس پر منکشف ہو گئی۔ اور وہ سوچنے لگی۔ نہ جانے روپ نے اس طرح اور کتنی بے بس دوشیزاؤں کو ان کی دوشیزگی سے محروم کر کے پاپ کے گڑھے میں ڈالا ہو گا۔ لیکن پریل کا غم یہیں پر ختم نہیں ہو گیا۔ اسی شام کو اس نے ریکھا کی خودکشی کی قیامت خیز خبر بھی سنی —— اب وہ اپنے تاریک مستقبل اور بھیانک انجام کے بارے میں سوچنے لگی۔

اس روز وہ رات بھر نہ سو سکی۔ اس کو خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں وہ خود بھی حاملہ تو نہیں! ساری رات وہ معاملہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی رہی۔ صبح ہوتے ہی وہ اپنا معائنہ کرانے کی غرض سے ایک جہاں دیدہ بوڑھی نرس کے ہاں جا پہنچی۔ وہ بوڑھیا اس سمے کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ اور اس کا بیٹا کملا کانت تنہا گھر پہ تھا۔ پریل تو ہر نوجوان کو دیکھ کر سہم جانے لگی تھی۔ جیسے سانپ کا ڈسا رسی سے ڈرے۔ وہ بغیر کچھ کہے وہاں سے لوٹ آئی۔

دوسری دفعہ جب وہ نرس کے ہاں گئی تو اُسے پتہ چلا کہ وہ چند منٹ قبل ہی ڈیوٹی پر جا چکی تھی اور دوبارہ پرل کی کملا کانت سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس مرتبہ مختصر تعارف بھی ہو گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ کملا کانت ایک طالب علم ہے اسی سال بی۔اے کا امتحان دے رہا ہے۔ لیکن پرل تو ہر مرد سے خوف کھانے لگی تھی۔ اس نے دو چار باتیں کر کے ہی کملا کانت سے اجازت لے لی۔ گلی کے نکڑ پر پہنچنے پر جب اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ مجنون اُسی طرح دروازہ میں کھڑا اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ایک روز عابد روڈ سے پرل گذر رہی تھی کہ کملا کانت بس اسٹیج پر کھڑا اُسے مل گیا۔ وہ کیو (QUEUE) میں کھڑا تھا۔ پرل کو راہ سے گذرتا دیکھ کر کیو سے نکل کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ پیلیس ٹیمپا کے گیٹ کے پاس سے دونوں گذر رہے تھے کہ سینما کمپاؤنڈ میں داخل ہونے والی ایک پیکارڈ ہارن بجاتی ہوئی ان کے پاس آ رکی۔ دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ اس کار میں سیٹھ روپ چند جی اپنی نئی نویلی دُلہن کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ پرل تو اس کی صورت سے بیزار تھی۔ لرزتے ہوئے جسم اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے وہ آگے بڑھنا ہی چاہتی تھی کہ روپ کار سے اُتر پڑا وہ گھبرا گئی۔ اُسے ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگے۔ لیکن روپ بجائے اس کی طرف منعطف ہونے کے کمل کی طرف بڑھ گیا۔

کملا کانت بھی اس پر نظر پڑتے ہی خوشی سے چلّا اٹھا۔

"ہیلو روپ!"

اور دونوں بڑی مسرت سے باتیں کرنے لگے۔

پرل فٹ پاتھ پر سہمی ہوئی کھڑی روپ کی بیوی کو دیکھنے لگی۔

کمل روپ کا بڑا بے تکلف دوست معلوم ہوتا تھا۔ اور روپ کی بیوی بھی اُس سے ہنس ہنس کر گلے شکوے کر رہی تھی۔

پھر جیسے کمل کو کچھ خیال آیا۔ اور وہ پریل کی طرف پلٹ کر بولا۔

"اوہ! میں تو بھول ہی گیا ـــــ آپ سے ملئے ـــــ"

اور وہ روپ اور اس کی پتنی سے پریل کا تعارف کرانے لگا۔

"آپ سیٹھ روپ چند جی ـــــ میرے دوست ہیں اور یہ آپ کی پتنی لکشمی روپ۔"

پھر وہ پریل کی طرف مڑ کر بولا" اور آپ ......"

لیکن کملا کانت آگے کچھ اور کہنے بھی نہ پایا تھا کہ روپ بولا" میں آپ سے واقف ہوں۔ آپ میرے ہی کالج میں پڑھتی تھیں۔"

اور پھر روپ کمل سے مصر ہوا کہ وہ اس کے ساتھ سینما چلے۔ کمل نے پریل سے استدعا کی کہ وہ بھی ان کا ساتھ دے۔ لیکن وہ اپنی مصروفیات کا بہانا کر کے ٹال گئی۔ کمل، روپ اور اس کی بیوی کے ساتھ پیلیس میں چلا گیا۔ پریل تنہا لوٹ آئی۔ لیکن اس کے دل میں اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔ اسے اندیشہ ہونے لگا تھا کہ تنگ دل روپ اس کی تباہی کا بھید کمل کو بتا دے گا۔ اور کمل جو اس میں دلچسپی لے رہا تھا وہ ختم ہو جائے گی۔ اُمید یاس میں اور خوشی رنج میں تبدیل ہو گئی۔

اسی ہفتے وہ کمل کی ماتا جی سے ملی۔ کمل گھر پر نہیں تھا۔ جہاں دیدہ زن نے اس کا پورا معائنہ کرنے کے بعد عجیب طرح کی نظروں سے اُسے دیکھا۔ اس کی نگاہ میں حیرت، پریشانی اور رحم کا اشتراک تھا۔ پھر اس نے ہمدردی اور دم سازی کا دم بھرتے ہوئے پریل سے کہا کہ خطرہ کی کوئی بات نہیں۔ تمہاری

زندگی میں بھونچال ضرور آیا تھا لیکن اب اس کی کوئی علامت باقی نہیں رہی۔
یہ سن کر اس کے دل کا بار ذرا ہلکا ہوا اور اس نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور
زہرہ سے رخصت ہو کر جانے ہی والی تھی کہ کمل آ گیا۔ وہ از راہ اخلاق اس سے
خیریت پوچھنے لگا۔ اس کا جی رکھنے کے لئے پرمل نے بھی ایک لمحہ کے عرصہ خفیف
کے لئے اپنے چہرہ پر مسرت و اطمینان کے آثار پیدا کر لئے اور بات کرنی چاہی۔
لیکن الفاظ اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئے اور وہ کوئی عذر لنگ پیش کر کے
چل پڑی۔ وہ خوفزدہ تھی کہ بدمعاش روپ نے کمل کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔
اور اب کمل کو اس کی ماتاجی سے بھی اس کی زندگی کے بھونچال کا پتہ لگ جائیگا۔
پھر بھلا وہ کس منہ سے کمل سے بات کر سکتی تھی۔ امر واقعہ یہ تھا کہ امید کا اور
اس کے دل کا تعلق ہمیشہ کے لئے منقطع ہو چکا تھا۔

اس کے بعد وہ کئی دن تک کمل سے گریز کرتی رہی۔

جس روز بی اے کے امتحان کا نتیجہ اخبار میں شائع ہوا پرمل نے غیر ضروری
طور پر اخبار کی ایک کاپی خرید لی۔ اس نے خود تو انٹرمیڈیٹ کا امتحان
دیا تھا پھر بھلا بی اے کے نتیجہ کا اخبار خریدنے کا آخر کیا راز تھا؟ لیکن پرمل
کے دل کے گوشہ میں امید و بیم کی ایک کرن پھوٹ پڑی تھی۔ کوئی احساس تھا
جس نے اسے اخبار خریدنے پر مجبور کیا تھا۔ اور وہ بیقراری سے بی۔ اے کے
رزلٹ پر نگاہ دوڑانے لگی۔ اور پھر کملا کانت کا نام پڑھ کر اس کی باچھیں
کھل گئیں ——— لیکن معاً وہ سوچنے لگی' اب خوش ہونے نہ ہونے سے کیا حاصل ہے؟
کمل تو اب اس سے یقیناً متنفر ہو چکا ہوگا۔ مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی
جب شام کو کمل مٹھائی کا بڑا سا پیکیٹ لئے اس کے دروازہ پر دستک دے رہا تھا۔

اس وقت گھر میں وہ تنہا تھی اس نے کمل کو اندر بلالیا۔ کمل نے مٹھائی اس کے حوالے کردی۔ وہ مارے خوشی کے پھولا جامہ میں نہیں سمارہا تھا۔ اس کے پلنگ کے پاس کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔

"پرل! مابدولت کامیاب ہوگئے ہیں مبارکباد دو۔"

سامنے پرل کے بستر پر بی۔اے کے رزلٹ کا اخبار کھلا پڑا تھا۔ اور کمل نے دیکھا اس کے نام کے اطراف سرخ پنسل سے ایک دائرہ بنا ہوا تھا۔ وہ خوش ہو کر بولا۔

"اچھا، تو آپ پہلے ہی معلوم کر چکی ہیں!"

"جی ہاں!" پرل نے اپنی بے بسی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیے۔"

"شکریہ"! کمل نے کرسی سے اُٹھ کر ایک خاص انداز سے فرشی سلام کرتے ہوئے کہا اور پرل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پھر بیٹھ گیا۔ پرل کی آنکھوں میں دل رکھا ہوا تھا، جو کمل کو سب کچھ بتا گیا۔ پھر بھی وہ اس کی زبان سے سننے کا متمنی ہوا اور کہنے لگا۔

"پرل! تمہارے کمرے میں یہ اخبار اور اس اخبار میں چھپے ہوئے میرے نام پر یہ دائرہ بنا دیکھ کر میرا شبہ یقین سے بدلنے لگا ہے۔"

پرل بغیر کوئی جواب دیئے خطاوار آنکھوں سے اس کی صورت تکنے لگی۔

کمل نے اس کے چہرے پر آنکھیں گاڑ دیں اور بے تابی سے بولا۔

"سچ سچ بتادو پرل۔ کیا تمہارے دل میں میرے لئے کچھ پریم ہے؟"

پرل نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں

کمل بابو! میری یہ بساط کہاں کہ میں آپ کی محبت کا دم بھر سکوں؟"
اور اس کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگنے لگیں۔ پھر بھی ایک آس تھی کہ اس کی امیدوں کا چراغ روشن ہو جائے۔

"پرل۔ میں تمہاری زبان سے اقرار سننا چاہتا ہوں۔" کمل نے اس کی دلفریب انگلیاں اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ اس کا دل احساسات سے لبریز تھا۔

"کمل بابو! میں ایک گنہگار لڑکی ہوں۔ کیا آپ کی ماتاجی نے آپ کو میرے متعلق کچھ نہیں بتایا؟" اس نے گلوگیر آواز میں کہا اور نگاہیں نیچی کر لیں۔

"ماتاجی نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔ وہ تو اپنے کسی مریض کا راز منکشف نہیں ہونے دیتیں۔ البتہ میرے دریافت کرنے پر انہوں نے کہا تو اس قدر کہا کہ یہ ایک دکھیا لڑکی ہے۔ بے بس زمانہ کی ستائی ہوئی۔" کمل نے کہا اور پرل کو مترحم نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ وہ بڑی کشمکش میں مبتلا دکھائی دے رہی تھی۔

"تو سنئے کمل بابو! میں خود آپ کو سناتی ہوں۔ سچ جانئے میں آپ کو فریب دینا نہیں چاہتی۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ مجھ سے محبت کریں بلکہ میں نفرت کئے جانے کی مستحق ہوں۔ میری نادانی اور بے بسی کے سبب ایک ڈاکو۔"

کمل نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

پرل حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

کمل کی آنکھیں محبت سے مخمور ہو رہی تھیں۔ اس نے پرل کی لمبی لمبی دلفریب انگلیوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

"پرل! وہ ڈاکو مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔ اس نے یہ اسی غرض سے

مجھے بتایا تھا کہ میں تم سے نفرت کرنے لگوں۔ تم سے کنارہ کشی اختیار کرلوں۔ لیکن پرل، مجھ پہ بھروسہ کرو۔ میں تو اسی دن سے تم میں دلچسپی لینے لگا تھا، جب تم پہلی مرتبہ ماتاجی سے ملنے آئی تھیں۔ اور پھر دو چار ملاقاتوں میں مجھے تم سے اُنسیت سے ہو گئی تھی۔ لیکن اس روز سینما ہال میں روپ نے مجھے بڑے فخریہ لہجہ میں تمہاری تباہی کی واردات کا ذکر سنایا۔ تمہاری جانب سے میرے دل میں منافرت پیدا کرنے کی غرض سے بڑی شیخی سے اس نے تمہاری بے بسی کا تذکرہ کیا۔ اور...... اُس ملاقات کے بعد میں روپ سے دوبارہ نہیں ملا۔ آج امتحان کا نتیجہ معلوم کرکے وہ معہ اپنی بیوی کے مجھے مبارکباد دینے میرے گھر پر آیا تھا۔ لیکن میں نے ماتاجی سے کہلوا دیا کہ مجھے اس سے ملنا نہیں ہے...... اور پرل! میں تمہاری مبارکباد کی تشنگی لئے ہوئے یہاں دوڑا آیا ہوں۔ میں تم سے حقیقی محبت کا خواستگار ہوں۔ مجھے یقین دلاؤ کہ تم مجھے پریم کی بھیک دو گی۔ میری محبت کو قبول کرو گی۔ بولو۔ بولو پرل!"

اور پرل کے پیاس بھرے نین پریم کی برکھا برسانے لگے۔ لیکن زبان سے اُس نے کچھ نہیں کہا۔ بس مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر لجاتے ہوئے کمل کے ہاتھ میں تھما دیا اور جب کمل لقمہ توڑ چکا تو اس نے شرمگیں مسکراہٹ کے ساتھ بچا ہوا ٹکڑا کھا کر اس انوکھے انداز سے اپنی محبت کا اقرار کرلیا۔

اور اس طرح کملا کانت نے پرل کو اپنا لیا۔ اور پھر وہ کس قدر خوش تھی زمین پہ پاؤں نہ پڑتے تھے۔......

شری متی پرمیلا دیوی نے البم کا چوتھا ورق اُلٹا اور سوچنے لگیں اگر دیوتا کے روپ میں انہیں کملا کانت جی نہ مل گئے ہوتے تو یقیناً وہ ذلت

کے عمیق غار میں جاگری ہوتیں۔ کملا کانت جی نے بڑے ایثار و قربانی کا ثبوت دیا۔ اور ایک تباہ حال بے بس ابلا کو نئی زندگی بخشی۔

اب اُن کے سامنے ان کی شادی کی تصویر تھی۔

دونوں نے اپنے پریم کی ایک بگیا لگائی اور اس بگیا کو پریم نیر سے سینچنے لگے اور پھر ایک ننھا پودا اگ آیا۔

پرمیلا دیوی نے البم کا ایک اور ورق اُلٹا۔ سریندر کے بچپن کی ایک تصویر ان کے سامنے تھی — ان دو سچے پریمیوں کے پریم بندھن کی یہ ایک نشانی، ان کا پیارا بچہ سریندر!

انھوں نے پھر البم کی وہ تصویر نکالی جس کا عنوان تھا "روپ کمل" — کمل کے پیچھے اُس کے کندھوں کا سہارا لئے روپ کھڑا تھا...... واقعی آج اُسے سہارے کی ضرورت تھی..... لیکن کیا وہ کسی سہارے کا مستحق تھا؟ کمل ...... کملا کانت جی آج سٹی مجسٹریٹ ہیں اور روپ کو مجرم کی حیثیت سے اُن کے سامنے پیش ہونا ہے۔

تھوڑی دیر پہلے جب لچھو ماسی نے آکر شری متی پرمیلا دیوی کو سیٹھ روپ چند کی مع ان کی جوان بیٹی اور رنگیلی ڈاکٹر ہری ہر کے گرفتاری کی اندوہناک خبر سنائی تو انہیں ذرا تعجب نہ ہوا۔ ان کی دانست میں .... گویا.... جوانی میں غریبوں کی بہو بیٹیوں کی عصمت دری کرنے والے سرمایہ دار روپ چند کا بڑھاپے میں یہی انجام ہونا لازمی تھا۔ اس کی کنواری کنیا شیاما حاملہ ہوگئی تھی۔ اور اس کے نوزائیدہ بالک کی ہتیا کرنے کے جرم میں پولس نے تینوں کو حراست میں لے لیا تھا۔ پولس اس وقت موقع واردات پر پہنچی تھی جب

سیٹھ جی کی کنواری بیٹی کا پھولا ہوا پیٹ ہموار ہو چکا تھا اور وہ ڈاکٹر کے سامنے ننگی بے ہوش پڑی ہوئی تھی ۔ اور پھر پولیس نے تینوں کو مردہ بچہ سمیت موقع واردات پر حراست میں لے لیا تھا۔

شری متی پرمیلا دیوی اپنی زندگی کا مقابلہ سیٹھ روپ چند کے جیون سے کرنے لگی ــــ روپ کی کنواری گنہگار بیٹی شیاما ــــ اور میرا ہونہار بیٹا سریندر ــــ روپ ہتھکڑیاں پہنے جیل کی تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا ہے ــــ اور میرے پتی دیو شری کملا کانت جی انصاف کی مسند پر بیٹھے اس ڈاکو کا نیائے کریں گے، جس نے نہ جانے کتنی بے بس لڑکیوں کا کنوارا پن لوٹا تھا۔ خود کمل کی پریل کو اس نے کہیں کا نہ رکھا تھا اور اس پر اسے مطلق ندامت نہیں تھی ۔ برخلاف اس کے وہ شیخی سے بیان کرتا پھرتا تھا۔ آج کمل، روپ کو کڑی سے کڑی سزا دے سکتا ہے، کنواری بیٹی کے ناجائز بچے کو ہلاک کرنے کی پاداش میں۔ بیس سال کے بعد دو دوست عدالت میں ملیں گے ــــ ایک منصف اور دوسرا مجرم! مجرم کہلاتے ہوئے روپ تجھے شرم تو محسوس ہو رہی ہوگی ــــ لیکن تو میری تباہی پر ذرا بھی نادم نہ ہوا تھا ــــ مجھ بے بس کی دنیا اجاڑ کر تو نے شیخی بگھارنے میں بھی عار نہ سمجھی تھی ــــ سزا تو بہرحال تجھے ملنی ہی تھی، جو دیر میں مل رہی ہے۔ سنسار میں دیر ہے پر اندھیر نہیں ــــ

البم ہاتھ میں لئے شری متی پرمیلا دیوی تخیلات میں کچھ ایسی گم ہو گئی تھیں کہ شوہر کے اندر آ جانے کا بھی انہیں احساس نہ ہوا ــــ شری کملا کانت جی ابھی ابھی کچہری سے لوٹے تھے ۔ انہوں نے پاس آ کر دیکھا کہ پرمیلا دیوی

کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک رہے ہیں۔

"پرمل!"

انہوں نے ہیٹ ہینگر پہ لٹکاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہوا پرمل —؟"

پرمیلا دیوی نے البم میز پہ ڈال دیا اور دوڑ کر شوہر کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"میرے دیوتا —"

گویا آج ہی کمل نے پرمل کو نو جیون بخشا تھا —

ڈاکٹر راجو — ایک رفیق محسن ڈاکٹر راجو سے آپ "صبح کا بھولا" اور "سکّے کے دو پہلو" میں ملیں گے۔

"سکّے کے دو پہلو" میں راجو کی روداد پڑھ کر آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔

"صبح کا بھولا" میں بے روزگار پریم بابو پر ترس کھا کر ڈاکٹر راجو نے انھیں ایک فرم میں روزانہ صرف تین گھنٹے کام کرنے کے معاوضہ میں ماہانہ چار سو روپئے تنخواہ کی ملازمت فراہم کر دی تھی لیکن صرف دو گھنٹے بعد ہی ان حضرت نے ملازمت ترک کر دی اور فرماتے کیا ہیں کہ صبح کا بھولا اگر شام لوٹ آئے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔

پبلیشر

صبح کا بھولا

میں نے چائے کا ایک گرم گھونٹ حلق میں اُتارا اور پیالی کو پرچ میں رکھ کر اُسے حسرت بھری نگاہوں سے تکنے لگا۔ یہ لبالب پیالی تھوڑی ہی دیر میں خالی ہو جائے گی ـــــ بالکل خالی ـــــ میری جیب کی طرح میری جیب میں بھی تو اب آخری دُوّنی باقی رہ گئی تھی، جس کے بل پر میں لذیز چائے کی اس پیالی کا آرڈر دے سکا تھا ـــــ صرف ایک دُوّنی۔ سکّۂ عثمانیہ کی ننھّی سی دُوّنی ـــــ اور اِس دُوّنی کے بعد میری جیب بالکل خالی ہو جائے گی، جیسے کہ یہ پیالی اب خالی ہونے والی تھی۔

میں نے چائے کا مزید ایک گھونٹ لیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر دُوّنی نکال لی پیالی میں بچی ہوئی چائے اور اُس دُوّنی کو دیکھنے لگا۔ اگر یہ دُوّنی میرے پاس بچ نہ گئی ہوتی تو مجھے اس گرین ہوٹل میں داخل ہونے کا حوصلہ ہی نہ ہوا ہوتا ـــــ کتنا بڑا سہارا تھی یہ ننھّی سی دُوّنی، جس کی موجودگی نے مجھے اتنے عالیشان رستوران کی شاندار شیشے کی میز پہ لذیز چائے سے لطف اندوز ہونے کا شرف بخشا تھا۔ لیکن یہ ننھّی رفیقہ بھی اب چند لمحوں کی ساتھی تھی۔ بس چائے میرے حلق

سے نیچے اُتر جانے کے بعد یہ دُوّنی گرین ہوٹل کے بڑے پیٹ والے ایرانی کی ملکیت بن جائے گی ___ اور اس طرح یہ دُوّنی کا سہارا ابھی ٹوٹ رہا تھا۔

دوّنی کا سہارا، اور ڈاکٹر راجو کا سہارا ___ کیا فرق تھا ان دو سہاروں میں ___؟ چائے پی چکنے کے بعد دوّنی کا سہارا ٹوٹ رہا تھا اور نوکری چھوڑ دینے کے بعد ڈاکٹر راجو کا سہارا ختم ہونے والا تھا۔ ڈاکٹر راجو اور یہ دوّنی ___! جس طرح دوّنی کی موجودگی سے میں گرین ہوٹل میں داخل ہو سکا تھا، بالکل اسی طرح ورنگل سے حیدرآباد آ کر ڈاکٹر راجو کے بل بوتے پر میں ملازمت حاصل کر سکا تھا۔

ایک پاگل انسان کی طرح میں اُس دوّنی کو ہیر پھیر کر دیکھنے لگا اور ساتھ ہی پیالی میں بچی ہوئی چائے کی مقدار حلق میں اتارنے لگا۔ میرے اس انہماک کو دو نوجوانوں کی آمد نے یکلخت توڑ دیا۔ وہ دونوں میرے سامنے والی میز پر آ بیٹھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اُن میں سے چاکلیٹی ٹائی والے نے بھورے بالوں والے اپنے ساتھی سے سرگوشی کی۔ اور وہ بھورے بالوں والا مُڑ مُڑ کر عجیب انداز سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر وہ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔

اس چاکلیٹی ٹائی والے ہی کے دفتر سے ابھی ابھی نوکری چھوڑ کر، میں اس رستوران میں، اپنی آخری دولت اس دوّنی کی چائے پینے آیا تھا ___ اور اب شاید ایک بج گیا تھا جو یہ چاکلیٹی ٹائی والا بھورے بالوں والے اپنے ساتھی کے ساتھ، یہاں لنچ اُڑانے آیا تھا۔

میں اس وقت کی اُن کی کانا پھوسی کا رہیں سن سک رہا تھا، لیکن میرا

خیال تھا۔ صرف خیال ہی نہیں بلکہ مجھے یقین تھا کہ یہ جاکلیٹی ٹائی والا بھورے بالوں والے اپنے ساتھی کی نظروں میں مجھے پاگل ہی گردان رہا ہوگا۔ یہ اس کمپنی کا منیجر ہے، جس کمپنی کی ملازمت سے میں دست بردار ہوکر آرہا تھا۔ کچھ دیر پہلے جب میں نے اس منیجر سے ترک ملازمت کا ذکر کیا تھا تو وہ مجھے اس ارادے سے باز رکھنے کی حتیٰ الامکان کوشش کرتا رہا تھا، مجھے منانے لگا تھا۔ جب میں نے صاف جواب دے دیا تھا تو وہ مجھے ایسے انداز سے گھورنے لگا تھا، گویا میں پریم ایم اے نہیں بلکہ کسی چڑیا گھر کا کوئی جانور اس کے مقابل آکھڑا ہوا تھا۔

اس وقت بھی میرے سامنے کے میز پر بیٹھے ہوئے بھورے بالوں والے اپنے ساتھی سے، وہ میرے پاگل پن کے متعلق ہی گفتگو کر رہا ہوگا۔ اس کا ساتھی کبھی مجھے اور کبھی میری انگلیوں میں تھمی ہوئی اس ننھی سی دوئی کو انوکھے انداز سے دیکھنے لگتا۔ شاید اسے یہی ثبوت میرے پاگل ہونے کا مل رہا تھا۔ اس کی نظروں میں ایک باولے انسان کی طرح میں اس ننھی سی دوئی کو الٹ پھیر کر دیکھنے میں مصروف تھا، جیسے اس پر بنی ہوئی چار مینار کی تصویر میں کچھ کھوج رہا تھا۔ لیکن اس بھلے آدمی کو کیا معلوم کہ یہی دوئی میرا آخری سرمایہ تھی۔ اور بھارت کے بٹوارے سے کسی اکھنڈ بھارت پریمی کو اتنا صدمہ نہیں ہوا ہوگا جتنا اس ننھی سی دوئی کے چلے جانے کے خیال سے مجھے ہو رہا تھا۔ مجھے کوفت ہو رہی تھی کہ آخر یہ سرمایہ بھی اس بڑے پیٹ والے ایرانی کو دے ڈالنا پڑے گا۔ اس دوئی کی جدائی سے میں نڈھال

ہوجاؤں گا جیسے کوئی ماتا اپنے ننھے بچے کے بچھڑ جانے سے ادھ موئی ہوجاتی ہے۔

سامنے کی میز پر بیٹھے ہوئے ان دونوں کی سرگوشی کی مجھے ذرا پروا نہیں تھی۔ صرف اس بات کی چِنتا تھی کہ ڈاکٹر راجو کو میں اب کیا جواب دُوں گا؟ جس ملازمت کو میں ابھی چھوڑ کر آرہا تھا، اُسے حاصل کرنے میں میری ایم اے کی ڈگری کی بہ نسبت ڈاکٹر راجو کی دو انگشت سفارشی چِٹھی نے زیادہ کام کیا تھا۔ اُن کی سفارش ہی سے مجھے یہ ماہانہ چار سو روپے تنخواہ کی ملازمت مل سکی تھی۔ آج صبح ساڑھے دس بجے نوکری ملی اور ساڑھے بارہ بجے میں نے چھوڑ دی ــــ شائد اسی لئے یہ چاکلیٹی ٹائی والا مینجر اپنی ساتھی کو میرے پاگل پن کا باور کرا رہا تھا۔

چائے ختم کر کے میں اُس خالی پیالی اور اپنی خالی جیب کے بارے میں سوچتا ہوا اس قیمتی دونّی کو دیکھنے لگا۔ مجھے رہ رہ کر ڈاکٹر راجو کا خیال آرہا تھا۔ اس ملازمت کی خاطر مجھے خط لکھ کر اُس نے ورنگل سے حیدرآباد بلا لیا تھا اُسے پورا یقین تھا کہ اُس کی کوشش سے میری بے روزگاری کا خاتمہ ہوجائے گا۔ ڈاکٹر راجو کا مرسلہ نامہ اس وقت بھی میری جیب میں تھا۔ خط کا خیال آتے ہی میں نے دونّی جیب میں رکھ لی اور خط نکال لیا۔ اور راجو کے لکھے ہوئے ان جملوں پر میری نگاہ پڑنے لگی۔

"پریم! مجھ پر وشواس کر اور پہلی ہی گاڑی سے بلدہ چلے آ۔

میں تجھ کو "جے ہند جنرل مارٹ" میں خاصی ملازمت دلا سکتا ہوں۔ اپنی زندگی بے روزگاری میں تباہ مت کر۔ کہانیاں اور کتابیں لکھ کر تو اپنا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ یہ سرمایہ دار پبلشر تیرا سارا خون چوس لینے پر بھی تجھے پوری روٹی نہیں دیں گے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تو لکھنا لکھانا ہی چھوڑ دے۔ خوب لکھ پریم! لیکن اسے اپنا ذریعۂ معاش بنا کر تو جی نہیں سکتا۔ "جے ہند جنرل مارٹ" میں تجھے صرف تین گھنٹے روزانہ کام کرنا ہوگا۔ بچا ہوا وقت تو لکھنے میں گذار سکتا ہے۔"

میں نے راجو کے اس خط کو لپیٹ کر پھر جیب میں رکھ لیا۔ اور پچھلے واقعات ایک فلم کی مانند میری نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔

ڈاکٹر راجو کے اس خلوص بھرے خط کو پڑھ کر میں پہلی گاڑی سے تو نکل نہ سکا تھا، کیونکہ ورنگل سے حیدرآباد پہنچنے تک کا کرایہ میرے پاس نہیں تھا۔ ایڈیٹروں اور پبلشروں سے جو رقمیں مجھے آنیوالی تھیں وہ کئی گاڑیاں گذر جانے تک بھی وصول ہونے کی آس نہیں تھی۔ اس لئے میں نے کالج لائف میں انعام ملا ہوا ایک طلائی تمغہ جسے میں جان سے زیادہ عزیز سمجھ کر سنبھالے ہوئے تھا اونے پونے دام میں مہاجن کے ہاتھ فروخت کر کے رقم حاصل کر لی اور ریڈی میڈ کپڑے پہن کر دوسرے روز ڈاکٹر راجو کے پاس آگیا تھا۔

اور آج صبح ڈاکٹر راجو نے ایک پرچہ لکھ کر مجھے دیا اور کہا کہ اسے کنگسوے پر لے جا کر "جے ہند جنرل مارٹ" کے ڈائرکٹر صاحب

کو دیتے ہی تجھے نوکری مل جائے گی۔ اُس پرچہ کا مضمون ابھی تک مجھے یاد ہے ---

"شریمان سیٹھ جی!

اپنے جن بھائی کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا

وہ یہی ہیں۔ کرپا کر کے ان کو فوراً کام پر لگا لیجئے ---

(ڈاکٹر) راجو ---"

اس مختصر پرچے کی عبارت پڑھ کر جب میں نے راجو بھیّا کی محبت بھری آنکھوں کو دیکھا تھا تو وہ مجھ پر شفقت برساتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

"اس کمپنی کے ڈائریکٹر نہایت دولتمند اور قدرداں شخص ہیں شروع شروع میں وہ تجھ کو چار سو روپئے ماہوار دیں گے لیکن آئندہ بڑے اچھے پراسپیکٹس ہیں ---"

"چار سو روپے!" میرے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ اتنی بڑی رقم ہر ماہ ملا کرے گی اس خیال ہی سے میرا من ڈولنے لگا تھا۔ چار سو روپے یکمشت مجھے آج تک نہیں ملے تھے "لوک سیوک بکڈپو" کے مالک کے نام سے ایک کتاب لکھ دینے پر مجھے ڈیڑھ سو روپے ملے تھے اور وہ بھی کئی قسطوں میں۔ اور یہ کنگسوے پر کے "جے ہند جنرل مارٹ" کے سیٹھ جی، روزانہ صرف تین گھنٹے میرے کام کرنے پر مجھے ہر مہینے چار سو روپے ادا کرنے کا راجو کو وچن دے چکے تھے ---

"راجو بھیّا! تمہارا یہ احسان میں کبھی نہ بھولوں گا" میں نے آبدیدہ ہو کر راجو کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے

راجو گویا میرا مونہہ بولا بھائی نہیں بلکہ حقیقی ماں جایا ہے۔

"پریم! اس میں شکریہ کی کیا بات ہے؟ تو ایم اے ہے۔ چارسو روپے ماہانہ سے زیادہ کمانے کی قابلیت رکھتا ہے۔ میری جی لی خواہش ہے کہ تو اس سے بھی زیادہ کمانے لگے۔ اِن سیٹھ صاحب سے مراسم بڑھالے۔ پھر ترقی ہی ترقی ہے۔ اِن مہاشے کی دائم للرض اہلیہ میرے زیر علاج ہیں اور میری دواؤں سے اُن کو فائدہ ہو رہا ہے۔ اس لیے دونوں میاں بیوی مجھ سے بہت خوش ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ تو اس کمپنی میں رہ کر اپنا مستقبل سنوارے گا۔"

ڈاکٹر راجو کا پرچہ جیب میں ڈال کر جب میں گھر سے باہر نکلا تھا، تو اس خیال سے کہ کنگسوے یہاں سے بہت دُور ہے میں پیدل نہیں جا سکوں گا میں نے ایک تانگے والے کو روک کر پوچھا تھا۔ "بھئی کنگسوے چھوڑنے کیا لوگے؟"

"کس جگہ اُترو گے بابو جی؟" تانگہ والا میرے اس سمے پریدھان کیے ہوئے اُجلے ریڈی میڈ لباس کو گھورتا ہوا بولا تھا۔ اس بیچارے کو کیا پتہ کہ میرے پاس یہی ایک جوڑا سلامت ہے۔

"ہمیں جے ہند جنرل مارٹ جانا ہے" میں نے تانگہ والے کو پتہ بتایا۔

"تین روپے دے دینا بابو جی۔" اس نے شاید مجھے جے ہند جنرل مارٹ کے ڈائریکٹر کا داماد سمجھ لیا تھا۔ میں نے اپنی جیب ٹٹولی ڈاکٹر راجو کے سفارشی پرچے کے نیچے میری اُنگلیوں کو چار آنے سہمے ہوئے محسوس ہوئے۔ اونے پونے دام میں فروخت کردہ طلائی تمغہ کی

رقم میں سے بس یہی چونّی باقی رہ گئی تھی۔ میں کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"اچھا آپ کیا دیدیں گے بابوجی؟" تانگہ والا میرے پیچھے پیچھے تانگہ چلاتا ہوا بولا۔ وہ شاید مجھے سونے کی چڑیا سمجھ کر اس طرح ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے اس سے بغیر نظریں ملائے کہا "دو چار آنے دے دیں گے"۔ اور کسی جواب کا انتظار کئے بنا آگے بڑھ گیا۔

"جیب میں صرف چونّی اور بابو صاحب چلے ہیں جے ہند جنرل مارٹ!" اُس نے طنزیہ کہا اور بیچارے گھوڑے کو چابک رسید کرنے لگا۔

لیکن بھگوان کی کرپا سے بس اسٹیج پر جاتے ہی مجھے بس مل گئی، جس نے تھوڑے وقت اور صرف دو آنے میں مجھے کنگسوے پر اُتار دیا تھا۔ جیب میں بچی ہوئی دونّی اور ڈاکٹر راجو کا سفارشی پرچہ لئے ہوئے میں جے ہند جنرل مارٹ میں جا پہنچا۔ لب سڑک کے شاندار شو روم کو دیکھ کر میری آنکھیں چکا چوند ہونے لگیں۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر ایک سیلز مین گویا آرڈر لینے میرے پاس آ گیا۔

"فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" وہ لبوں پر مسکان لئے بچھا جا رہا تھا۔ کاش کہ اُسے پتہ ہوتا کہ نیا ریڈی میڈ لباس زیب تن کئے مجھ غریب کی جیب میں صرف ایک دونّی پڑی سسک رہی تھی۔

ڈائریکٹر صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کرنے پر اس نے ایک چپراسی کو میری رہنمائی کا اشارہ کیا اور مجھے اس چاکلیٹی ٹائی والے

منیجر کے روبرو پیش کیا گیا، جو اِس وقت میرے سامنے والی میز پر ڈٹا، لنچ اُڑاتے ہوئے اپنے ساتھی کو میرے پاگل ہونے کا یقین دلانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ جب میں نے ان مہاشئے کو ڈاکٹر راجو کا پرچہ دکھایا تھا تو ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے کرسی پیش کی گئی تھی اور پرچہ اندر ڈائریکٹر صاحب کو بھجوا دیا گیا تھا۔ دو ہی منٹ میں ڈائریکٹر صاحب کے کمرے سے چپراسی نے ایک دوسرا پرچہ لاکر منیجر کو پیش کیا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی ان مہاشئے نے، مجھے جاب (JOB) مل جانے پر مبارکباد پیش کی تھی۔

پھر حسبِ دستور اس نے آفس جوئن کرنے کے ایک فارم کی مجھ سے خانہ پری کرائی تھی۔ دفتر کی دیوار پر آویزاں گھنٹے نے اُس وقت دس بجائے تھے۔

یہی چاکلیٹی ٹائی والا منیجر مجھے ساتھ لئے شوروم اور دوکان سے گذرتا ہوا، اندر ڈائریکٹر صاحب کی ذاتی کوٹھی میں جا پہنچا تھا۔ پھر وہ مجھے ایک نہایت شاندار کمرے میں پہنچا کر بولا تھا۔

"یہ رہا آپ کا دفتر۔ یہاں آپ کو روزانہ تین گھنٹے کام کرنا ہوگا۔"

مَیں مسرّت سے جامہ میں پھولا نہیں سما رہا تھا۔ خوشیوں سے رقص کرتی ہوئی میری آنکھیں اُس کمرے کی ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ایک بڑی دیدہ زیب میز دلفریب لوازماتِ نوشت وخواند سے آراستہ گویا میری ہی منتظر تھی۔ مقابل کی دوسری ایک میز پر کوئی انگریز قسم کا نوجوان بیٹھا کام میں مصروف تھا، جو ہمیں دیکھ کر مودبانہ کھڑا ہوا

تھا۔ اس کی طرف اشارہ کر کے منیجر بولا تھا۔

"یہ ہیں آپ کے ساتھ کام کرنے والے مسٹر جونس! بیرونِ ہند کا سارا کاروبار اِن ہی کے ذمّہ ہے۔"

غرض ڈاکٹر راجو کے سفارشی پرچہ سے مجھے اس طرح روزگار مل گیا تھا۔

چاکلیٹی ٹائی والے منیجر کے چلے جانے کے بعد مسٹر جونس نے مجھے کام کی نوعیت بتائی...... جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بلیک میلنگ کا ایک بہت بڑا اڈا ہے۔ اسی لئے آفس کا ایک پوشیدہ کمرے میں انتظام کیا گیا تھا۔ جونس نہایت ہنس مکھ اور زندہ دِل نوجوان تھا۔ بہت جلد وہ مجھ سے بے تکلف ہو گیا۔ اس دوران میں سامنے دیوار پر بڑے طلائی چوکھٹے میں لگی ہوئی ایک تصویر پر میری نگاہ اُلجھ گئی۔ یہ تصویر میرے ایک کلاس فیلو جگّو کی تھی —— میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کمبخت جگّو کی تصویر، یہاں اِس شان سے کیوں لگوائی گئی تھی! میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس تصویر کو دیکھ کر لڑکپن کا زمانہ میری آنکھوں میں گھوم گیا۔

جگّو ایک نہایت غبی اور بد دماغ لڑکا میرا کلاس میٹ تھا۔ اس کا باپ ورنگل بلدیہ کا صدر اور ہمارے اِسکول کا چیرمن ہونے کے کارن اسکول کا ہر ٹیچر جگّو کو اس کی نا اہلیت کے باوجود پُر احترام نظروں سے دیکھتا تھا۔ ہر سالانہ امتحان میں جگّو کے فیل ہوتے ہوئے بھی اُسے پروموٹ کر دیا جاتا تھا۔ جگّو کے میٹرک پاس کرنے سے قبل ہی اس کے باپ کا

انتقال ہو گیا ـــ پھر کیا تھا؟ باپ کی ساری دولت جگو کے چرنوں میں آرہی۔ اور جس سال میں نے میٹرک پاس کیا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جگو ورنگل بلدیہ کا صدر اور ہمارے اسکول کا چیرمن بن چکا تھا ـــ

دیوار پر آویزاں اس تصویر کی دید میں مجھے اس طرح کھویا ہوا دیکھ کر مسٹر جولس نے کہا "یہی ہیں ہمارے ڈائریکٹر صاحب، اس کمپنی کے پروپرائٹر سیٹھ جگناتھ جی ـ"

میرے کانوں میں جیسے کسی نے گرم گرم سیسہ انڈیل دیا۔

کیا یہی جگو۔ سیٹھ جگن ناتھ جی آج مجھے خرید چکا تھا۔ بلیک میلنگ کرکے بڑھائی ہوئی اپنی دولت سے جگو میرے ذہن کا سودا کر چکا تھا۔ میرا ضمیر مجھ پر لعنت بھیجنے لگا۔ ایک بلیک میلنگ کرنے والے کی ملازمت اختیار کرنے پر ـــ جگو جیسے نالائق سرمایہ دار کے چند ٹکوں پر اپنی عقل و فراست بیچ دینے کی رذیل حرکت پر ......

میری میز کے سامنے والی کھڑکی ڈائریکٹر صاحب کے خانہ باغ میں کھلتی تھی۔ ان ڈائریکٹر صاحب عرف جگو کے متعلق سوچ بچار میں غلطاں و پیچاں باغ کے شاداب منظر کو دیکھتا ہوا میں پھر اپنے ماضی میں کھو گیا۔

میٹرک پاس کر لینے کے بعد میں ورنگل سے بلدہ آکر نظام کالج میں داخل ہو گیا تھا۔ ان ہی دنوں ورنگل ہائی اسکول کے سالانہ انعامی جلسہ کا دعوت نامہ مجھے بھی آیا تھا۔ میں نے دو تین مضامین میں امتیاز حاصل کیا تھا، اس لئے مجھے اپنے انعامات لینے کے لئے نمنترن بھجوایا گیا

تھا۔ لیکن میں نے اس جلسہ میں محض اس لئے شرکت نہ کی تھی کہ اس کی صدارت یہی جگّو صاحب فرمانے والے تھے اور طلبہ اور طالبات کو ان ہی کے دست مبارک دہ، سے انعامات لینے کا شرف حاصل کرنا تھا۔ اور آج ..... آج میں چند سکّوں پر اسی جگّو کے ہاتھوں بک گیا تھا۔ .....میں دل ہی دل میں کُڑھنے لگا۔

اتنے میں قدرت نے ایک نظارہ دکھا کر میرے مونہہ پر ایک ایسا زبردست تھپّڑ رسید کیا کہ میں بلبلا ہی اُٹھا، اور میری روح تلملا کر رہ گئی۔

کاش کہ اس جگّو، یا سیٹھ جگن ناتھ جی سے مجھے اِس حد تک ہی نفرت ہو کر رہ گئی ہوتی اور اپنے سرمایہ کے بل بوتے پر ایک دوسری ٹھوکر اُس کے لگا جُھکنے کا مجھے علم نہ ہوا ہوتا۔ کاش کہ میں نے اس کھڑکی سے نظر آنے والا وہ دردناک منظر ہی نہ دیکھا ہوتا۔

"یہ کون ہیں مسٹر جونس ۔۔۔؟" کرسی سے اُٹھ کر وہ نظارہ جونس کو دکھاتے ہوئے میں نے پُوچھا۔

دو خادم ایک مریضہ کو کرسی میں بٹھائے باغ میں لائے۔ اور ایک نیم کے پیڑ کے سایہ میں کرسی رکھ کر چلے گئے۔ میں کھڑکی سے قریب تر پہنچ کر اس منظر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ جونس بھی میرے قریب آ کھڑا ہوا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ میری انجلی ہے ۔۔۔ لیکن وہ اس قدر زرد پڑ گئی تھی، اور ایسی لاغر و ناتواں ہو چکی تھی کہ میری آنکھیں دل کی تائید کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہی تھیں۔ اس کی وہ کٹورا سی آنکھیں

اندر کو دھنس گئی تھیں، اور اُن کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ پچکے ہوئے گال اور گلاب سا مرجھایا ہوا مکھڑا دیکھا نہ جاتا تھا ــــ

"یہ ہیں مسز انجلی دیوی، ہمارے ڈائریکٹر صاحب کی بیٹر ہاف!"

جونس کا جملہ ختم ہوتے ہی میرا سر چکرانے لگا تھا۔ اس منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے، آنکھوں پر ہاتھ رکھے میں پیچھے ہٹ گیا۔ اور دیوار کا سہارا لینے کی کوشش میں، کھڑکی کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر قریب قریب گر پڑا۔

"میری انجلی اور اس کی یہ درگت!"

انجلی کو دیکھ کر مجھے کالج کے سنہرے دن یاد آ گئے ــــ

میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا، اُس دوران میں میری انجلی سے ملاقات ہوئی تھی۔ بی اے۔ پاس کرنے تک ہم ایک دوسرے پر جان چھڑکنے لگے تھے۔ اور آپس میں نشچے کر چکے تھے کہ بس اب ہفتہ عشرہ میں ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن جائیں گے۔ لیکن تقدیر ہم پر ہنس رہی تھی، اور وقت شیطانی قہقہے لگا کر ہمارا مذاق اُڑا رہا تھا۔

ایک دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا تصوّر ہی تصوّر میں اپنے سنہرے خوابوں کی تعبیر دیکھ رہا تھا۔ انجلی کے میرے جیون میں پدارپن کرنے کے بعد بھلا میری خوش قسمتی کا کیا ٹھکانہ ہو سکتا ہے؟ گھٹا گھر آئے جیسے رقص کرنے والے مور کے مانند میرا من ناچ رہا تھا کہ انجلی نے اچانک میرے کمرے میں داخل ہو کر مجھے چونکا دیا۔ اُس کی پژمردہ صورت دیکھ کر میرا دل دھک سا ہو گیا تھا۔

"انجلی!" میں نے دوڑ کر اُسے پکڑ لیا۔

"پریم! ہمارے پریم کی نیّا کنارے نہیں لگ سکی۔ منجدھار ہی میں غرق ہو کر رہ گئی ہے۔" وہ جوں توں بولی اور بے تحاشہ رونے لگی۔ چند ہی لمحوں میں اُس نے اپنے آنسوؤں سے میرے سینے کو تر کر دیا۔

"میری انجلی، بتاؤ تو سہی تمہیں کیا ہوا؟" میں نے تڑپ کر پوچھا۔

وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ "پریم۔ میرا بیاہ نشچت ہو گیا ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو انجلی؟" میں نے چلّا کر کہا۔ "تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" میں وفورِ جذبات سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔

وہ گلو گیر آواز میں کہنے لگی "پریم! تمہارا سب سے بڑا دوش یہ ہے کہ تم غریب ہو۔ پتا جی تمہیں اپنا داماد بنانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اس لئے ایک دھنوان رئیس سے انھوں نے میری بات پکّی کر لی ہے۔ اب مجھے بھول جاؤ پریم۔!" وہ پھر رونے لگی۔

"نہیں انجلی، میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔ میں تمہیں کسی حالت میں نہیں چھوڑوں گا۔"

"ایسا نہ کہو پریم! جہاں تک ہو سکے مجھے بھول جانے کی کوشش کرو۔ صبر سے کام لو۔"

"نہیں انجلی۔ میں تمہیں اب واپس نہیں جانے دونگا۔ تم۔ میرے ساتھ کہیں بھاگ چلو۔"

پاگل نہ بنو پریم! میرے پیار کو بدنام نہ کرو۔ مجھے غلط راہ پر مت ڈالو۔ اپنے ماتا پتا کے ماتھے پر کلنک لگانے کی مجھ میں سکت نہیں۔ خود

ہمت سے کام لو پریم، اور مجھے بھی سہارا دو۔" پھر اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا تھا، "تمہیں میری قسم پریم، میرے پریم کی سوگند، اپنی جان کو روگ نہ لگانا۔"

اور پھر وہ مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔ مجھے یہ تک نہ معلوم ہو سکا تھا کہ وہ کس کے گھر کی رونق بنی ہے ــــ اُس دِن کے بعد آج میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ ایسے ہولناک اور یاس کے عالم میں۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

میں نے انجلی کی سوگند کی لاج رکھی تھی اور اپنی دِل شکستگی کے باوجود اپنی تعلیم کو جاری رکھا تھا۔ اِسی دَوران میں مجھے راجُو جیسا رفیق مل گیا تھا۔ راجو اُن دنوں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا کورس پورا کر رہا تھا۔ اُس نے میری ڈھارس بندھائی اور جس دن میں نے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی، راجو بے حد خوش ہوا۔ اُس وقت تک وہ ڈاکٹر بن چکا تھا، اور اپنے فن میں اُس نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔۔۔

اور آج ڈاکٹر راجو نے سفارشی چِٹھی لکھ کر، میرے لئے روٹی کپڑے کا انتظام کر دیا تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا ــــ علم و دانش پر سرمایہ داری کو سبقت دینے والا جگّو، جے ہند جنرل مارٹ کا بلیک میلنگ کرنے والا سنچن ڈائریکٹر، اور مجھ سے میری انجلی چھین لینے والا سیٹھ جگن ناتھ میرے ذہن کو خرید رہا ہے، میرے ضمیر کا سودا کر رہا ہے۔ بھلا میں یہ کیسے گوارہ کر لیتا۔؟

میں ایکدم اُٹھ کھڑا ہوا۔ جونس مجھے سہارا دینے لگا تھا۔ لیکن میں نے اُس کے ہاتھ کو ایک جھٹکا مار کر چھُڑا لیا اور لیک کراس چاکلیٹی

ٹائی والے منیجر کے کمرے میں جا پہنچا، اور چلّا چلّا کر کہنے لگا۔

"مجھے نوکری نہیں چاہیئے، مَیں بھوکا ہی بھلا ہوں، مجھے ننگا ہی رہنے دو۔ پر مَیں یہ ملازمت نہیں کر سکتا۔ میں اس زندان میں ایک پل بھی سانس نہ لے سکوں گا۔"

منیجر بھونچکّا سا رہ گیا۔ اُس نے ایسی اچھی ملازمت ترک نہ کرنے کی مجھ سے استدعا کی۔ مجھے منانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن مَیں ٹس سے مس نہ ہوا میرے قدم نہ ڈگمگائے۔ اور میں اس ضمیر فروشی کے روزگار کو ٹھکرا کر چلا آیا...... اور اب میں اس شاندار رستوران کے بلّوری میز پر لذیذ چائے پی کر اپنی آخری دولت ٹھکانے لگا چکا ہوں۔ وہ چاکلیٹی ٹائی والا منیجر، بھورے بالوں والے اپنے ساتھی کے ساتھ لنچ اُڑاتا ہوا، اب شاید اُسے یقین دِلا چکا ہے کہ یہ شخص پاگل ہے۔ لیکن مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ مَیں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ اپنے محسن ڈاکٹر راجو کو کیا جواب دوں گا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میری اس حرکت پر مبادا وہ بھی مجھے پاگل تصوّر فرمالے۔ لیکن بقول شخصے:۔

صبح کا بھولا اگر شام لوٹ آئے تو اُسے بھولا نہیں کہتے....!

تار تار نقاب

جناب پی ۔ من باسی ہمارے نوجوان لکھنے والوں میں ایک خاص جگہ کے مالک ہیں۔ "جمالستان" کے قارئین ان کے قلم کی دلکش بوقلمونیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔

زیر نظر افسانے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس کامیابی سے وہ رومانی افسانے لکھ سکتے ہیں اسی کامیابی سے جاسوسی کہانیاں بھی۔ اس افسانہ میں وہ تمام دلچسپیاں اور رنگینیاں تو بدرجۂ اتم موجود ہی ہیں جو من باسی صاحب کے رومانی افسانوں کی خصوصیت ہیں لیکن اس کی جاسوسانہ نوعیت اور پراسراریت نے اس کے حسن اور دلکشی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ قارئین اسے پڑھ کر من باسی صاحب کی فنکارانہ صلاحیتوں کی داد دینے پر مجبور رہیں گے۔

اگست ۱۹۵۵ء نجم صدیقی (ایڈیٹر جمالستان)

میں ناشتہ سے فارغ ہو کر ڈائی ننگ ٹیبل پر بیٹھا کافی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اگر ملازم نے آ کر طالب کے فون کی اطلاع نہ دی ہوتی تو مزید دس منٹ میں نے کافی کے اس لطیف شغل میں گزار دیئے ہوتے۔ یہ طالب میرا لڑکپن کا بے تکلف رازدار دوست اور حیدرآباد سی آئی ڈی کا ایک کامیاب

دماغ ہے۔ فرصت کے لمحات ایک دوسرے کے ساتھ بڑی دلچسپی میں بسر ہوتے ہیں گا ہے میں اس کے ہاں جا کر بلیرڈ دیکھتا ہوں گا ہے وہ یہاں آ کر بیڈمنٹن کورٹ پر اچھل کود کرتا رہتا ہے۔ اس کی اکثر ملاقاتیں، میری کہانیوں کے لئے اچھا خاصا مواد فراہم کر دیتی ہیں۔ لیکن گذشتہ تین ماہ میں ایک دفعہ بھی وہ میرے ہاں نہیں آیا تھا۔ اس دوران میں ہر ہفتہ ہی میں اس کے گھر جاتا رہا تھا۔ لیکن یہ پولس والا بھی کسی ایسی منحوس ساعت دورے پر روانہ ہوا تھا کہ واپسی کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس لئے اب اچانک اس کے ٹیلیفون کی اطلاع پا کر مجھ پر یک گونہ مسرّت کا غلبہ طاری ہو گیا۔ جیسے فیل ہونے کا یقین کر لینے پر کوئی طالب علم بعد میں کامیابی کی خبر پا کر جذبہ فرحت سے دیوانہ وار جھوم اٹھتا ہے۔ اس خوشی اور بے قراری کے عالم میں سامنے رکھی ہوئی گرم گرم کافی کی نصف سے زیادہ بھری ہوئی وہ پیالی میں نے دو ہی گھونٹ میں خالی کر دی۔ اور تیزی سے دیوان خانے میں جہاں ٹیلیفون نصب تھا، جا پہنچا۔

"ہیلو طالب!" میں نے رسیور اٹھاتے ہی کہا۔

دوسری جانب وہ رسیور تھامے شاید میرا منتظر ہی تھا۔ ایک دم بولا "بھئی پریم، کہیں باہر تو نہیں جا رہے ہو؟ ایک ضروری کام سے میں ابھی تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تم خوشی سے آ سکتے ہو" میں نے کہا "تم سے ملنے کی خواہش دل میں لئے میں نے بھی دیدِ دولت کے کئی پھیرے کئے ہیں۔ لیکن اس سی آئی ڈی کی ملازمت نے تم کو کہیں کا نہیں رکھا۔ جب دیکھو دورے پر۔

وہ شاید فون پر کھل کر بات کرنے کے موقف میں نہیں تھا۔ ہلکی ہنسی کے بعد جلدی ہی سے بولا۔ "اچھا تو میں اسی وقت آرہا ہوں۔ اتنے دنوں کی عدم موجودگی کی ساری کسر نکال دوں گا۔ خوب باتیں ہونگی۔"

"شکریہ۔" میں نے کہا اور فون بند ہو گیا۔

جس کام کیلئے میں طالب سے خاص طور پر ملنا چاہتا تھا اس کے متعلق سوچنے لگا۔ پھر میں نے اپنی وہ الماری کھولی جس میں کہ میں اپنی ادھوری کہانیوں کے مسودے اور اخبارات کی سنسنی خیز خبروں کے تراشے رکھا کرتا ہوں۔ ان تراشوں میں بھی میرے لئے بہت سارے افسانے پنہاں ہوا کرتے ہیں۔ مجھے مطلوبہ تراشہ نکالنے میں زیادہ وقت ضائع کرنا نہیں پڑا۔ جسے کوئی تین مہینے قبل میں نے ایک مقامی اخبار سے تراش لیا تھا۔ اس کی عبارت پڑھ کر میں طالب سے ملنے کیلئے مضطرب ہو اٹھا تھا۔ لیکن اس دوران میں میری اس سے ملاقات ہی نہ ہو سکی تھی، اور تراشہ الماری میں پڑا رہا۔ اس لئے اب طالب کے میرے ہاں آنے کی خبر نے مجھے مسرور کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس معاملے پر روشنی ڈال سکے گا۔ اپنے دیوان خانے میں ایک صوفے پر بیٹھا میں طالب کا انتظار کرنے لگا۔ اور وقت گذارنے کی غرض سے اس کٹنگ کی عبارت پر طائرانہ نظر دوڑاتا رہا۔

مجھے وہ دن یاد آیا جب مس سرلا نے مجھے اندر جیت سے ملایا تھا۔ سرلا نظام کالج میں بی اے کے آخری سال میں زیر تعلیم ہے۔ میں ہر شام اسے پرائیویٹ طور سے پڑھانے اس کی کوٹھی پر جایا کرتا ہوں۔ اور ایسی ہی ایک شام اس نے اپنے دیوان خانہ میں اندر جیت سے میرا تعارف کرایا تھا۔

اندرجیت ایک گورا چٹا دراز قد شکیل نوجوان تھا۔ پچھلے ہی سال اس نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کیا تھا۔ دورانِ تعلیم میں وہ کرکٹ کا نامور کھلاڑی رہ چکا تھا اور اب بھی ہندوستان بھر میں اس کے کھیل کی دھاک تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے یورپ جانا چاہتا تھا۔ اس کے پتاجی نے اسے اجازت نہ دی تھی۔ انھوں نے یہ کہہ کر اسے روک لیا تھا کہ اپنی جوان بہن اور بوڑھے باپ کو کس پر چھوڑ جاتے ہو۔! کم از کم مالا کے ہاتھ پیلے ہونے دو۔

"مالا" ہاں۔ یہی اندرجیت کی معصوم بہن کا نام تھا۔ امیر خاندان کا اکلوتا چشم و چراغ اندرجیت بھلا اسے ملازمت کی کیا ضرورت تھی! جب یورپ کا پروگرام منسوخ ہو گیا تو وہ کھیل کود اور تفریحات میں وقت گذارنے لگا تھا۔ اور ساتھ ہی مالا کے لئے اچھے لڑکے کی تلاش میں بھی تھا۔ اس نے ایک خوبصورت "بے بی آسٹن" خرید لی تھی۔ پہلے میں سرلا کی "ڈیلو" میں اندرجیت کو اس کے پاس بیٹھا ہوا دیکھا کرتا تھا۔ اب اندرجیت کی بے بی آسٹن میں سرلا اس کے ساتھ دکھائی دینے لگی تھی۔ جب کسی شام سرلا کو اس کے ساتھ فلم دیکھنے جانا ہوتا تو وہ مجھ سے فون پر پڑھنے کی چھٹی حاصل کر لیتی اور پھر میں اپنی گیلری میں کھڑا سامنے کی تارکول کی سڑک پر سے ان دونوں کو پاس پاس بے بی آسٹن میں بیٹھے گذرتے ہوئے دیکھتا۔ ان مشاہدات سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ سرلا کے پتا سیٹھ شیو نارائن بھی ان جوان دلوں کے میل ملاپ پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتے تھے۔ ان کی خاموشی نیم رضامندی کا پہلو لئے ہوئے تھی۔ لیکن اخبار کی اس کٹنگ میں شائع شدہ خبر کی تشہیر ہوتے ہی سیٹھ شیو نارائن کا رویہ یک لخت بدل گیا تھا۔ وہ

اندرجیت کی صورت دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن اندرجیت نے بھی پھر کسی کو اپنی صورت نہیں دکھائی۔ وہ روپوش ہو چکا تھا۔ پولس گرفتاری وارنٹ لئے اس کا سراغ لگانے میں مصروف تھی۔ اور سیٹھ شیو نارائن ہی کیا جس کسی نے بھی اس خبر کو پڑھا اس کے دل میں اندرجیت کی جانب سے منافرت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ کسی کو تو یہ کہتے ہوئے بھی سنا گیا کہ وہ اپنی بہن کو ٹھکانے لگا کر یورپ جانا چاہتا تھا۔ یقیناً فرار ہو کر یورپ ہی گیا ہوگا۔ مجھے یہ سب باتیں سُن سُن کر کوفت ہوتی۔ میں نے کتنی ہی توقعات اس لڑکے سے وابستہ کر رکھی تھیں، ان کو ملیامیٹ ہوتے دیکھ کر میرے دل میں خلش ہونے لگتی تھی۔ اور میں طالب سے ملنے کیلئے کچھ بیتاب سا ہو جاتا تھا۔

اندرجیت کی وہ معصوم بہن مالا بھی نظام کالج میں انٹر آرٹس میں پڑھتی تھی۔ اب تو یہی کہا جا رہا ہے کہ اس بچی کی "ہابی" ہی اسے لے ڈوبی۔ شروع ہی سے رقص و موسیقی کی وہ دلدادہ تھی۔ نظام کالج میں اسٹیج کئے جانے والے اکثر ڈراموں میں مالا نے ہیروئن کا رول ادا کیا تھا۔ اور انعامات پائے تھے۔ پھر اس کے اس آرٹ کے شوق نے آگے چل کر جنون کی صورت اختیار کر لی تھی اور وہ بے وقوف لڑکی فلم ایکٹرس بننے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ عزت دار باپ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی معصوم بیٹی فلموں میں ناچ تھرک کر خاندان کو کلنک لگوانے کا سبب بنے۔ ہمارے موجودہ گندے فلمی ماحول سے چونکہ اندرجیت بھی واقف تھا، اس نے بھی مالا کو یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ اس ارادے کو ترک کر دے۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ ایک دوشیزہ کو اداکاری کی منزل پر پہنچنے کیلئے فلمی دنیا کے ایسے ایسے تنگ دروازوں

سے گزرنا پڑتا ہے۔ کہ ان میں جڑی ہوئی یہ ہے کی لوک والہ میوں میں اس کی دوشیزگی، عصمت وعفت کا دامن الجھ کر تار تار ہو جاتا ہے۔ اور جب اس کے تن پر حیا و شرم کی کوئی دھجی تک نہیں باقی رہ جاتی تو اسے شہرت یافتہ ہیروئن کے خطاب سے سرفراز کیا جاتا ہے ۔۔ یہ اور بات تھی کہ مالا اپنے بھائی کی اس رائے سے متفق نہیں تھی۔

جب کسی بات کی تکمیل کا وقت آتا ہے تو خود بخود کئی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ جس آرزو کو بیٹے مالا کئی دنوں سے ترتیب رہی تھی ایک دن اس کے بر آنے کا بھی وقت آگیا۔ گذشتہ اکتوبر میں بمبئی کے کسی فلمی ادارے کا ایک نمائندہ اقبال چند نئے چہروں کی تلاش میں حیدرآباد آیا تھا۔ اپنے مقصد میں کامرانی حاصل کرنے کیلئے اقبال چند نے مقامی اخبارات میں مختلف زاویوں سے چٹپٹے اشتہارات شائع کرائے تھے۔ آج کل نوے فیصدی جوان لڑکیوں کے سر میں فلمی اداکارہ بننے کا سودا ہوتا ہے۔ گرانڈ ہوٹل کے ایک شاندار کمرے میں اقبال چند ایسی نیم پاگل لڑکیوں سے ملاقاتیں کرتا رہا۔ مالا بھی اس سے ملی تھی۔ اُس کے حسن و کمال موسیقی اور دلکش رقص نے اس فلمی نمائندے پر جادو کر دیا تھا۔ اس نے مالا کو چن لیا اور مالا اس کے ہمراہ بمبئی جانے پر راضی ہو گئی۔ چونکہ سکندرآباد میں اقبال چند کا کچھ کام ادھورا رہ گیا تھا۔ اس لئے وہ فوراً بمبئی نہ جا سکا۔ وہ مالا کو لئے ہوئے ہوٹل سے اُٹھ کر سکندرآباد میں اپنے ایک دوست کے ہاں جا رہا۔ جب مالا گھر نہ لوٹی تو اندرجیت کو تشویش ہوئی اور اس نے اس کی تلاش شروع کر دی۔ نظام کالج کی کچھ لڑکیوں نے اُسے بتایا کہ بمبئی کا اقبال چند کسی نئی تیار ہونے والی فلم میں ہیروئن کا رول دینے

کی غرض سے مالا کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اندرجیت نے بہن کے اغوا کی رپورٹ پولیس میں لکھوادی اور خود بھی ٹوہ میں لگا رہا۔

پھر امادس کی ایک تاریک رات اس سچی کہانی نے عجیب پلٹا کھایا۔ اندرجیت کے پتاجی کا ایک بنگلہ سکندرآباد میں ریلوے اسٹیشن کے عقب میں واقع ہے، جسے وہ اکثر کرایہ پر اٹھادیا کرتے ہیں۔ یہ بنگلہ ان دنوں بالکل خالی تھا۔ اس حلقہ کے انسپکٹر کا بیان ہے کہ اس رات بارش ہو رہی تھی۔ آدھی رات بیت جانے پر وہ اس بنگلہ کے سامنے سے گذر رہا تھا کہ ایک دلدوز نسوانی چیخ اسے سنائی دی۔ وہ چونکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بنگلے کا پھاٹک چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ اسی وقت ایک کار جس کے تمام شیشے چڑھے ہوئے تھے اور اندر کی روشنی بھی گل تھی، تیزی سے پھاٹک سے نکلی اور اس کے پاس سے گزر کر تاریکی میں روپوش ہو گئی۔ سب انسپکٹر نے ٹارچ کی روشنی ڈال کر اس کار کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ جب وہ بنگلہ کے اندر پہنچا تو وہاں ایک جوان لڑکی کو خون میں لت پت پڑا دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ لاش کے پاس مقتولہ کا پرس پڑا پایا گیا۔ اس میں سے دیگر اشیا کے علاوہ ایک چٹھی بھی برآمد ہوئی۔ یہ چٹھی مالا کو سوم ناتھ نے بھجوائی تھی۔ سوم ناتھ اندرجیت کا دوست تھا۔ اپنی دوستی کا حوالہ دیتے ہوئے اس نے بمبئی والے اقبال چند کی بدچلنی کی پول کھول دی تھی۔ اور لکھا تھا کہ وہ کسی صورت یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کے دوست کی بھولی بہن کو غلط راہ پر ڈالا جائے۔ اندرجیت اور اس کے پتاجی کی ناراضگی کا تذکرہ کرتے ہوئے سوم ناتھ نے لکھا تھا کہ اندرجیت تو مالا کو قتل کر دینے پر تلا ہوا تھا۔ پر وہ اُسے منالینے

میں کامیاب ہو گیا ہے۔ غرض اس مختصر چٹھی کے مضمون سے اس معاملہ پر روشنی پڑ سکی کہ بھائی اور تیا جی سے صلح کرا دینے کی غرض سے نصف شب گئے سومناتھ مالا کو اس بنگلے میں لے کر گیا تھا۔ پولس سب انسپکٹر نے جس کار کا نمبر نوٹ کیا تھا وہ اندر جیت کی بے بی آسٹن تھی۔ کچھ جوان ہمراہ لئے سب انسپکٹر اندر جیت کے گھر پہنچا۔ اندر جیت غائب تھا اس کے بوڑھے باپ نے اپنے بیان میں لکھوا دیا کہ وہ خود تو رات بھر گھر سے باہر نہیں نکلا تھا، اندر جیت اپنے دوست سومناتھ کے ساتھ گاڑی میں سر شام ہی سے کہیں گیا ہوا ہے۔ پولس نے اندر جیت اور اس کی کار کی تلاش شروع کر دی اور اس کے گھر پر بھی پہرہ لگا دیا کہ بڑے میاں پر نگاہ رکھی جائے۔ سومناتھ بھی گھر پر نہ ملا۔ دوسری صبح اندر جیت کی بے بی آسٹن ٹینک بنڈ کے نیچے ایک کھائی میں ٹوٹی ہوئی پڑی پائی گئی۔ سومناتھ کی لاش بھی دبی ہوئی ملی تھی۔ اس دن سے اندر جیت روپوش ہے۔ اور پولس گرفتاری وارنٹ لئے اس کے سراغ میں لگی ہوئی تھی۔

اس معاملہ کی تہہ میں پہنچنے کے لئے میں طالب سے ملنے کو بے قرار تھا۔ اخبار کی کٹنگ کی عبارت میں اسی واقعہ کو نمک مرچ لگا کر پیش کیا گیا تھا۔ میں اس واردات کے پنہاں پہلو پر غور کر رہا تھا کہ طالب آ گیا۔ جیسے ہی اس کی جیب پورٹیکو میں رکی ملازم نے آ کر مجھے اس کی آمد کی اطلاع دی۔ ملازم کو تو میں نے کافی لانے کے لئے اندر بھجوا دیا اور جیسے ہی طالب دیوان خانے میں داخل ہوا۔ اسے چھیڑنے کی نیت سے میں نے کہا:۔

"صبح ہی شیطان کی صورت دیکھنی پڑی۔ نہ جانے آج کا دن کس قدر نحوست میں گذرے گا۔"

اس طنز پر مسکراتا ہوا وہ سامنے کے صوفے پر آ بیٹھا۔

جہاں انسان کی پہنچ نہیں ایسے غیر مانوس مقامات سے طالب معجزانہ طور پر قاتلوں اور خطرناک غنڈوں کو گرفتار کر کے قانون کے سپرد کر چکا ہے۔ اور اس کے پیش کردہ دلائل کی بنا پر مجرم پھانسی چڑھ چکے تھے یا جیل میں سڑ اگئے۔ اس لئے حیدرآباد کے بدمعاشوں اور جرائم پیشہ لوگوں میں طالب "شیطان" کے معزز خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

وہ مسکراتا ہوا میرے سامنے بیٹھ گیا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ غیرارادی طور پر مسکرا رہا ہے۔ میں غور سے اس کے چہرے کو تکنے لگا۔ وہ کچھ کھویا کھویا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس لئے میں نے زیادہ مذاق نامناسب سمجھ کر آگے کہا۔ "کہو بھئی" اتنے دن کہاں غائب رہے۔ اور آج صبح ہی صبح مجھ پر کیسی کرم فرمائی کی۔؟"

اس نے اپنی جیب سے سگریٹ کیس اور دیا سلائی نکالی اور ایک سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔ "بھئی پریم، پچھلی رات تم کو نمائش میں دیکھا تھا۔" اس نے سگریٹ کا کش لیا اور پھر کہنے لگا۔ "سچ مانو، کروڑپتی سیٹھ شیو نارائن کی بیٹی سرلا کو تمہارے ساتھ دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔"

"ہاں!" رات والے واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے میں نے کہا "مس سرلا کی میں ٹیوشن کرتا ہوں۔ کل شام جب اسے پڑھا چکا تو وہ نمائش جا رہی تھی۔ اس کے اصرار پر میں بھی اس کے ہمراہ ہولیا تھا۔"

ملازم نے کافی کی کشتی درمیانی تپائی پر لا رکھی اور میں کافی بناتا ہوا طالب کے سوال کی نوعیت پر غور کرنے لگا۔ ابھی میں کسی نتیجہ پر بھی نہ پہنچا

تھا کہ وہ اسی سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"شاپنگ کے بعد تم سرلا کے ساتھ ایک ایرانی ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے تھے وہاں سرلا نے تمہاری چائے اور کیک سے تواضع کی تھی۔ حالانکہ پڑھائی ختم کرنے پر اپنی کوٹھی ہی میں اس نے تمہارے ساتھ چائے پی تھی اور پیسٹری بھی کھائی تھی۔"

"بھئی امیروں کے چونچلے تم نہیں جانتے" میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اتنا تو کہہ دیا لیکن اس جواب پر خود مجھے اطمینان نہیں تھا۔ سرلا کی عادت سے میں بخوبی واقف تھا۔ وہ چائے بہت کم مقدار میں پیا کرتی تھی۔ پڑھائی کے بعد مجھے تو تقریباً ہر روز ہی چائے مل جایا کرتی تھی۔ لیکن سرلا شاذ و نادر ہی اس میں شریک ہوا کرتی تھی۔ واقعی یہ بات خالی از تعجب نہیں تھی کہ سرلا میری خواہش نہ ہونے پر بھی مصر تھی کہ میں اس کے ہمراہ ایرانی ریسٹورنٹ میں چل کر بیٹھوں۔

میں نے کافی کی ایک پیالی طالب کو پیش کی تو وہ بولا۔

"کیا ریسٹورنٹ میں تم نے کوئی غیر معمولی بات نہیں محسوس کی تھی؟" اس نے ادھ جلا سگریٹ ایش ٹرے کے کنارے پر رکھ دیا۔ اور کافی کی چسکی لے کر معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

گذشتہ شب کے واقعات کو یاد کرتا ہوا میں بولا۔ "ہاں درمیان ہی میں کوئی شخص سرلا کو ایک پرچہ تھما گیا تھا جسے پڑھ کر وہ مجھ سے معذرت چاہتی ہوئی باہر چلی گئی تھی۔ اور پھر کوئی پانچ سات منٹ بعد لوٹی تھی..... لیکن تم یہ سب کس لئے دریافت کر رہے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

اس بات کا مجھے بھی اعتراف ہے کہ طالب اپنے محکمہ کا ایک کامیاب افسر ہے۔ اس کا وقت بڑا قیمتی ہے وہ بے موقع یا بے مطلب کسی بات میں کبھی دلچسپی نہیں لیا کرتا۔ لیکن اس خیال کے ساتھ ہی میں کچھ خدشہ محسوس کرنے لگا تھا۔ مس سرلا کیلئے۔ سرلا بڑی معصوم اور ایک بلند کردار لڑکی ہے ...... طالب کا اس طرح سرلا کا تعاقب کرنا خالی از مصلحت نہیں ہو سکتا۔ مبادا سرلا کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے!

طالب کافی سے لطف اندوز ہوتا ہوا اپنی ہی دھن میں بولا "کل سرلا کی سالگرہ کے سلسلے میں سیٹھ نند نارائن کی کوٹھی میں شاندار تقریب منعقد ہونے والی ہے۔ بھئی پریم، تمہارے لئے یہ ذرا مشکل نہیں کہ تم ایک دعوت نامہ میرے لئے حاصل کر لو۔ میں صرف چند لمحات اس خاندان میں گذارنا چاہتا ہوں۔"

یہ سن کر میں کچھ مضطرب سا ہو گیا۔ میرے چہرے سے شائد اس کا اندازہ لگا کر طالب کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ تشفی بخش لہجے میں وہ کہنے لگا "اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں پیارے میں جانتا ہوں کہ تم سرلا کے خیر اندیش ہو۔ میں بھی نہیں چاہتا کہ یہ معصوم گڑیا کسی آگ کی لپیٹ میں آ جائے۔ بلکہ میں تو اسی لئے اس خاندان میں پہنچنا چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کو کسی آنے والے خطرے سے باخبر کر سکوں۔" طالب نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے خالی پیالی کشتی میں رکھدی اور ایش ٹرے کے کنارے سے اپنا ادھ جلا سگریٹ اٹھا کر وہ اس کا کش لیتا ہوا بولا۔ "اگر تم مجھے سرلا کے خاص دوستوں کی معلومات بھی بہم پہنچا سکو تو اس سے بھی

میرے کام میں بڑی مدد ملے گی۔"

طالب کی اس گفتگو سے میں کچھ مطمئن ہو گیا۔ اور کافی کے گھونٹ لیتا ہوا اپنی معلومات کی حد تک اسے سرلا کے دوستوں کے متعلق بتانے لگا۔ "سرلا کے خاص دوستوں میں آج کل تو ایک شرنارتھی نوجوان اشوک ماتھر کو زیادہ اہمیت حاصل ہے لیکن کوئی چار ماہ قبل جب کہ یہ اشوک ماتھر حیدرآباد میں نہیں آیا تھا، اندرجیت سے سرلا کے گہرے روابط قائم تھے۔ اگر اندرجیت روپوش نہ ہو جاتا تو ممکن تھا کہ اس سالگرہ پر سرلا سے اس کا رشتہ طے پا جاتا۔ یہ ریفیوجی نوجوان اشوک ماتھر اندرجیت کی روپوشی کے بعد ہی اس خاندان سے متعارف ہوا تھا اور قلیل ترین عرصہ میں کسی قریبی رشتہ دار کی طرح اس خاندان میں گھل مل گیا ہے۔"

کافی ختم کر کے میں نے بھی اپنی پیالی کشتی میں رکھدی۔ اور طالب کا منہ تکنے لگا۔ اب میں یہ سمجھ چکا تھا کہ طالب کی یہ ساری بھاگ دوڑ "مالا کے واقعۂ قتل" کی تفتیش کے سلسلہ میں ہو گی۔ میرے چپ ہوتے ہی طالب نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے کہا "یوں تو میں دوسرے طریقوں سے بھی سالگرہ کی اس تقریب میں شریک ہو سکتا ہوں۔ لیکن سرلا کے پروفیسر کے ساتھ جانے میں کچھ اور ہی لطف آئے گا۔ تم ضرور ایک دعوت نامہ میرے لئے لیتے آنا۔ پر بھلے آدمی کہیں وہاں میرا صحیح تعارف کرا دینے کی عقلمندی نہ برتنا۔" پھر وہ کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "فرگیوسن کالج پونہ کا پروفیسر نعمان، فارسی زبان کا ماہر۔ یاد رہے گا نا۔ پروفیسر نعمان کی حیثیت سے تم مجھے ان سے ملا سکتے ہو۔ جو بغرض تفریح حیدرآباد آیا ہے اور تمہارے ہاں ہی قیام پذیر ہے۔"

اب میں چاہتا تھا کہ مالا کے قتل کی واردات کے سلسلے میں طالب سے کچھ معلومات حاصل کروں۔ اس مقصد سے میں نے کہا۔ "لیکن یار طالب یہ تو بتاؤ کہ یہ سب سوانگ کس کے لئے رچایا جا رہا ہے۔ آخر ہم بھی تو جانیں کہ کس کی شامت آئی ہے؟"

مجھے امید تھی کہ وہ اندرجیت کی روپوشی کے معاملہ پر روشنی ڈالتا ہوا مجھے اس کیس کی تفصیل بتانے لگے گا۔ پر وہ میرے سوال کو قطعی نظر انداز کر گیا۔ گویا میرا یہ سوال کسی ناسمجھ طالب علم کے اس سوال کی حیثیت رکھتا تھا جسے نصاب سے غیر متعلق سمجھ کر استاد درگذر کر جائے اور مسکرا کر اسے بیٹھ جانے کا حکم صادر فرما دے۔

خلاف امید طالب کچھ ثانئے خاموش رہا۔ پھر اس نے اپنا سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دیا اور معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھتا ہوا بولا "نمائش جاتے ہوئے تم مس سرلا کی ڈیملر گاڑی میں گئے تھے۔ اور واپسی پر......؟" جملہ ادھورا ہی چھوڑ کر وہ اپنے چہرے کو علامت استفہام میں تبدیل کر کے میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"یہ تو صحیح ہے" میں نے واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا "واپسی میں سرلا نے اپنی کسی سہیلی کی گاڑی استعمال کی تھی"

اس دوران میں طالب نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے کوئی کاغذ کا پرزہ نکال لیا تھا۔ اس پر ایک نگاہ ڈال کر مجھے دیتا ہوا بولا۔ "اسے پڑھو"

میں نے دیکھا۔ ایک شکن آلود پرچہ تھا وہ۔ جس پر لکھا تھا۔

"سرلا مجھے تمہاری گاڑی چاہیئے۔ گاڑی کی چابی بھجوادو
میں چار مینار سگریٹ کی سٹال کے مقابل منتظر کھڑا ہوں۔
——— الف"

پرچہ کا مضمون پڑھ کر میں طالب کی صورت تکنے لگا۔ اس کے چہرے پر گہرا سکون تھا۔ اور بڑے اطمینان سے وہ کہنے لگا۔

"جب سرلا رسٹورنٹ سے نکل کر چار مینار سگریٹ سٹال کی طرف بڑھ رہی تھی تو اس کا تعاقب کیا جا رہا تھا جس کا اسے مطلق علم نہ تھا۔ اس نے اس پرچے کو مروڑ کر بے پروائی سے راستہ ہی میں ایک طرف ڈال دیا تھا۔ اسے کب کسی نے اٹھا لیا یہ بھی اس گڑیا کو پتہ نہ لگ سکا اور اس کی کار لے جانے والے "الف" کے پیچھے بھی آدمی لگا ہوا ہے۔"

"تو اس الف کا کیا مطلب ہے؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"الف سے اشوک بھی ہوتا ہے اور اندر جیت بھی۔" طالب مسکراتا ہوا بولا۔

"تو کیا تم کو یہ شبہ ہے کہ اندر جیت ہی اشوک کے روپ میں سرلا سے روابط قائم کئے ہوئے ہے؟" میں نے کسی حیرت ناک انکشاف کی توقع کرتے ہوئے طالب سے سوال کیا۔

"بھئی یقین جانو، ڈھائی تین ماہ سے میں اسی کیس کی تفتیش میں الجھا ہوا ہوں لیکن ابھی تک نہ اندر جیت کا سراغ لگا سکا ہوں اور نہ اشوک ماتھر کی گتھی سلجھا سکا ہوں۔ رات سرلا کی "ڈیلر" کے تعاقب میں گیا ہوا شخص ہی اس الف کے راز کا انکشاف کر سکے گا۔ حالانکہ اس کیس کے سلسلہ میں بمبئی ناگپور دہلی اور جانے کدھر کی خاک چھاننے کے بعد میں نے ایک طویل رپورٹ تیار کر لی ہے بہت سا مواد

حاصل کر لینے کے باوجود میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں ہنوز اسی نقطے پر کھڑا ہوں جہاں سے چلا تھا" طالب نے نا امیدی کے لہجے میں کہا۔ اور پھر سگریٹ کے دھوئیں سے مرغولے بنانے لگا۔

"اندرجیت کے متعلق تمہاری رپورٹ کیا کہتی ہے؟" میں نے مطلب پر آتے ہوئے پوچھا۔

"اندرجیت کے خلاف پولیس نے جو چارج شیٹ مرتب کیا ہے اس میں دو الزامات لگائے ہیں۔" طالب سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتا ہوا کہنے لگا "اس نے مالا کو فریب سے اپنے ویران بنگلے میں بلا کر ہلاک کر دیا۔ اور عینی گواہ سومناتھ کو قتل کر کے کار کے نیچے کچل ڈالا...... اب رہا میری رپورٹ کے آئینہ میں اندرجیت کا عکس — اس کی اس منزل پر نمائش کرتے ہوئے میں جھجک رہا ہوں کہ مبادا وہ غلط ثابت ہونے پر میری پوزیشن کو مضحکہ خیز بنا دے۔ فی الحقیقت میں خود بھی اس عکس سے مطمئن نہیں ہوں۔ ہاں ایک آس ہے سرلا کی ڈیملر کے تعاقب میں گئے ہوئے جوان کی واپسی پر میں اس عکس میں صحیح رنگ بھر سکوں گا اور سرلا کی سالگرہ کی تقریب میں شرکت کر کے بھی میں کامرانی کی شعاع پا سکتا ہوں۔"

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ طالب قریب تھا۔ اس لئے اس نے ریسیور اٹھا لیا۔ کسی کے استفسار پر وہ کہہ رہا تھا — "ہاں میں بول رہا ہوں۔ اچھا اچھا کوئی مضائقہ نہیں میں فوراً پہنچ رہا ہوں۔"

پھر ریسیور رکھ کر وہ بولا "یہاں آنے سے قبل میں اپنے مددگار کو بتا آیا تھا کہ تمہارے ہاں جا رہا ہوں۔ اب مجھے فوراً دفتر جانا ہے۔ تم پروفیسر نعمان کے نام سے دعوت نامہ حاصل کر لینا۔ کل ساتھ ہی چلیں گے۔

اچھا اب اجازت چاہتا ہوں — اس نے گم نام "الف" کا مرقومہ پرچہ مجھ سے لے کر جیب میں رکھ لیا اور چلتا بنا۔

سالگرہ کی تقریب میں پروفیسر نعمان کو سب سے تعارف حاصل ہوا۔ سرلا اور اس کے پتاجی سیٹھ شیونارائن نے اس سے مل کر بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ مگر نعمان اشوک ماتھر میں ہی زیادہ دلچسپی لیتا رہا۔ خوش کلامی سے اس نے اشوک ماتھر کے کافی حالات معلوم کر لئے۔ اشوک ماتھر پنجاب یونیورسٹی کا بی۔ کام۔ تھا۔ وہ سیٹھ شیونارائن کے دوست کا بیٹا تھا۔ اس کے پتاجی پچھلے ہنگاموں میں لاہور میں قتل ہو گئے تھے۔ مرحوم دوست کی نشانی کے ناطے سیٹھ جی اسے بہت چاہتے ہیں۔ اور سرلا بھی اب اس میں دلچسپی لینے لگی ہے۔ اور سرلا کے امتحان کے بعد دونوں کی شادی ہو جانے کا امکان ہے۔ پروفیسر نعمان کے استفسار پر اشوک ماتھر نے پنجاب میں اپنی جائداد کا بھی ذکر کیا۔ اس کا پنجابی لہجہ بات کرنے کی صفائی سے اس پر کسی قسم کا شبہ کرنے کی ذرا بھی گنجائش نہ تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی صاف گوئی سے طالب کو بھی اطمینان ہو گیا ہے۔ حضرت کا یہ پروفیسر نعمان کا روپ بھرنا اکارت ہی گیا۔

پھر ہم تحفوں کی میز کے پاس جا پہنچے۔ میں نے شرو بابو کی کہانیوں کا مکمل سیٹ سرلا کو تحفہ میں دیا۔ پروفیسر نعمان نے رباعیات عمر خیام کا ایک مجلد نسخہ پیش کیا۔ ایک سہیلی نے "زینت کی کشیدہ کاری" تحفہ میں دی۔ اور اشوک ماتھر نے سنگ مرمر کا بیش بہا "تاج محل" پیش کیا جس کے ایک مینار پر لٹکے ہوئے لیبل پر لکھا تھا۔

"آشاؤں کے مندر میں بسنے والی سرلا دیوی کو۔

اشوک ماتھر"

تقریب کے اختتام پر جب ہم گھر لوٹ رہے تھے تو طالب نے کار ہی میں کوئی چیز میری مٹھی میں تھما دی۔ میں نے ہلکی سی روشنی میں دیکھا۔ اشوک کے تحفے میں پیش کئے ہوئے تاج محل کا وہ لیبل تھا۔ وہی عبارت وہی خط "آشاؤں کے مندر میں بسنے والی سرلا دیوی کو۔ اشوک ماتھر!"

"یہ کیا ــــ یہ کیوں نوچ لائے ہو تم؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"گھبراؤمت، اسی عبارت کا ایک دوسرا لیبل اس تاج محل کے مینار پر اسی طرح لٹکا دینے کے بعد اسے حاصل کیا گیا ہے۔"

طالب پرسکون لہجے میں بولا۔ "کسی کے فرشتوں کو بھی شبہ نہ ہو سکے گا۔ یہ دیگر بات ہے کہ ایسا ہی لیبل تیار کرنے کے لئے مجھے اپنے آپ کو دس منٹ کے لئے شیونارائن جی کے باتھ روم میں بند ہونا پڑا تھا۔"

حیرت کے ساتھ ساتھ مجھ پر ہنسی کا غلبہ طاری ہو گیا۔

"تم جانتے ہو۔" سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے طالب کہنے لگا۔ "میں ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ ہوں۔ اب تین قسم کے ہینڈ رائٹنگز میرے قبضے میں ہیں۔ ایک یہ لیبل، دوسرا شہزاده الف کا سرلا کو لکھا ہوا پرچہ اور تیسرا مالا کو لکھا ہوا سونا تھ کا خط۔ اب پتہ لگ جائے گا کہ مالا کے خون میں کس نے ہاتھ رنگے ہیں؟" طالب نے کہا۔ اور میں اس کی صورت تکنے لگا۔

"تو گویا تم یہ مانتے ہو کہ مالا کو اندرجیت نے نہیں قتل کیا تھا"۔
میں نے حیرت آمیز مسرت سے پوچھا۔

"ذرا اور صبر کرو۔ کل تمہیں بتاؤں گا کہ صحیح قاتل کون ہے"۔
طالب نے بڑے تیقن سے کہا اور چھوٹے بچے کی طرح میری پیٹھ تھپکنے لگا۔
اس کے جملے کا لفظ "صحیح" غمازی کر رہا تھا۔ جس کے احساس سے میرا دل گدگدانے لگا۔ اور اندرجیت کے بارے میں کچھ امید سی ہونے لگی۔

لیکن حسبِ وعدہ، وہ ظالم دوسرے دن فیصلہ سنانے نہیں آیا۔
اس کیس میں میری دل چسپی بڑھ گئی تھی، اس لئے سرلا کے گھر جانے تک میں طالب کا انتظار کرتا رہا۔ اور جب وہ اس وقت تک بھی نہیں پہنچا تو وقت مقررہ پر میں سرلا کو پڑھانے چلا گیا۔

آج سے قبل جب بھی میں سرلا کو پڑھانے گیا تھا تو ہر دفعہ وہ اپنے مطالعہ کے کمرے میں اپنی نشست پر موجود ہوا کرتی تھی۔ مگر آج خلاف معمول اس کی نشست خالی تھی۔ اس کا انتظار کرتا ہوا میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت بھی میں اس پر اسرار کیس اور طالب کی جدوجہد ہی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اتنے میں سرلا کی ممی آیا اندر آگئی اور کہنے لگی۔

"آج بیٹا نہیں پڑھے گی"۔

"کیا کچھ طبیعت ناساز ہے؟" میں نے سوال کیا۔
"جی ہاں ۔۔ ٹھہریئے میں آپ کے آنے کی خبر کرتی ہوں"۔ آیا یہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی۔

سرلا کا یہ دستور تھا کہ جس دن اسے پڑھنا نہیں ہوتا تھا، کسی

مصروفیت کی بنا پر یا ناسازی طبع کے سبب تو وہ دو تین گھنٹے قبل ہی مجھے آنے کو منع کر دیتی تھی۔ اس لئے مجھے یہ شبہ ہوا کہ شاید یکایک طبیعت بگڑ گئی ہوگی۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ وہ معمر آیا پھر کمرے میں داخل ہوئی۔

"بٹیا آپ کو اندر بلا رہی ہے۔" آیا نے جیسے حکم نامہ سنایا۔

اور میں اس کی قیادت میں سرلا کی خواب گاہ میں جا پہنچا۔ وہ نیم دراز حالت میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"کوئی بات نہیں لیٹی رہو۔" میں نے کہا۔ اور وہ قدرے سنبھل کر بیٹھ گئی۔ آیا نے لحاف سے اس کا آدھا جسم ڈھانک دیا۔

"تشریف رکھئے" وہ ڈوبی ہوئی آواز میں بولی "معاف کیجئے گا۔ یکایک طبیعت بگڑ گئی اور میں آپ کو خبر تک نہ کر سکی۔ ناحق زحمت ہوئی آپ کو۔" اس نے بے کمانہ اضطراب سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ آیا نے ایک کرسی اس کی مسہری کے قریب لا رکھی اور میں اس پر بیٹھ گیا۔

"کیا شکایت ہے، کوئی دوائی وغیرہ بھی پی ہے یا نہیں؟" اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا جس کی رنگت انتہا درجہ زرد اور کچھ ہیبت کے آثار لئے ہوئے تھی۔ جیسے کسی خوفناک بھوت پریت کے تصور سے چھوٹے بچے کا حال ہو جاتا ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ بھلا اس ہیبت کی کیا وجہ ہو سکتی ہے سالگرہ کی جو خوشی اور شوخی اس کی آنکھوں سے چھلکنا چاہیئے تھی اس کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی "کوئی خاص تکلیف نہیں"۔ پھر بات کا پہلو بدلنے کے لئے وہ آیا سے مخاطب ہو کر کہنے لگی "کھڑی منہ کیا کیا تکتی ہو۔ پروفیسر صاحب کو چائے تو لا دو۔"

اور آیا چلی گئی۔ سرلا کی گھبراہٹ دور کرنے کی غرض سے میں نے کہا "رات کی تقریب میں شائد کچھ شب بیداری غیر معمولی طور پر کرنی پڑی ہوگی۔ ممکن ہے اسی سبب سے طبیعت خراب ہو گئی ہو۔"

اسی کمرے میں ایک بڑی میز پر گذشتہ شب ملے ہوئے تمام تحائف سجائے رکھے تھے۔ ان میں اشوک ماتھر کا پیش کردہ تاج محل نمایاں تھا۔ اس کا پیل مجھے صاف نظر آرہا تھا۔ جسے دیکھ کر مجھے طالب کے ہاتھ کی صفائی کی داد دینی پڑی۔ سرلا کا عندیہ معلوم کرنے کی نیت سے میں نے کہا۔

"سرلا! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کو ان سارے تحفوں میں کون سا تحفہ زیادہ پسند آیا۔؟"

"میری پسند!" وہ ایک طرح کی پریشانی اور کوفت چہرے پر لئے کسی سوچ میں پڑ گئی۔ شاید یہی سوچ رہی ہو کہ دل کا بھید آشکارا کرے یا نہ کرے۔

"شاید تاج محل!" میں نے پوچھا اور اسکے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا وہ تاج محل کی تعریف میں قصیدہ کہنے لگے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بر خلاف اس کے وہ کچھ مضمحل سی ہو اٹھی۔

"تمہارے چہرے کا رنگ کیوں اڑ گیا ہے سرلا؟" میں غیر ارادی طور

پر پوچھ بیٹھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ایسی نگاہوں سے مجھے تکنے لگی۔ جیسے میں نے اس کے دل کے گوشے سے اس کا کوئی راز نوچ لیا ہو۔ پھر کچھ توقف سے بولی۔

"آپ میری پسند پوچھ رہے ہیں پریم بابو۔ مجھے اس کے اظہار کا موقع تو دیجئے۔" اب اس کے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ نمودار ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے تکیے کے پاس رکھا ہوا ایک کوڈک کا لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ مجھے اس کی اس وقت کی مسکراہٹ میدان میں پچھڑے ہوئے کھلاڑی کی سی محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے لفافہ لے لیا۔ اس میں سے ایک چھوٹی سی تصویر برآمد ہوئی۔ میں نے دیکھا اور استعجاب سے کہا۔

"یہ تو ایک مفرور قاتل کی تصویر ہے سرلا۔!"

اور کبھی تصویر کو اور کبھی سرلا کو دیکھنے لگا۔ تصویر پر لکھا تھا۔

"اپنی زندگی سرلا کو ——— اندر جیت!"

"پریم بابو! کسی ملزم کو ایک دم مجرم نہیں کہا جا سکتا۔" سرلا نے ایسے انداز سے کہا جیسے کسی بے قصور بچے کو استاد سزا دے ڈالے تو وہ معصوم بچہ آنسو بہاتے ہوئے بڑی دلیری کے ساتھ سچی بات بیان کرتا ہے۔ پھر اسی لہجے میں بولی۔ "ہاں یہ تصویر ایک مفرور کی ضرور ہے۔ لیکن قاتل کی ہرگز نہیں۔ حقیقت پر چاہے کوئی کتنے ہی نقاب ڈالے لیکن وہ پوشیدہ نہیں رہ سکتی ایک دن ظاہر ہو کر ہی رہتی ہے...... اور صرف ہم تین اس حقیقت

سے واقف ہیں۔ ایک میں دوسرے خود اندر جیت اور تیسرا بھگوان!" سرلا نے حسرت ویاس سے کہا۔ اس کی آواز میں آنسو ملے ہوئے تھے پر حوصلہ بڑھا ہوا تھا۔ اس کا یہ حال دیکھ کر میں کچھ بے قرار سا ہو گیا۔ اور اس تصویر کو دیکھنے لگا۔ پڑوس کے کسی بنگلے میں ریڈیو پر ہلکی آواز میں گیت بج رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میرے مقابل اندر جیت کھڑا خود گا رہا ہو۔ سرلا بھی غور سے سن رہی تھی۔

" تو مجھ کو جس طرح سے بھی ہو آزما کے دیکھ + لیکن یہ آرزو ہے کہ اپنا بنا کے دیکھ
بیمار غم ہے تیرا تماشا بنا ہوا + دشمن بھی آکے دیکھتے ہیں تو بھی آکے دیکھ"

مخدوم کے ان اشعار کو اتنی دل سوز آواز میں نہ جانے کون گا رہا تھا۔ مجھ پر وجد کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ میں نے سرلا کی طرف دیکھا اس کا چہرہ چمکنے لگا تھا۔ جیسے وہ اپنے دل میں کوئی فیصلہ کر چکی ہو۔ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

" پریم بابو! آپ نے ابھی کہا تھا کہ میرے چہرے کی رنگت اڑی ہوئی ہے۔ یقیناً اس کا سبب معلوم کرنے کی آپ کو کرید ہو رہی ہو گی!" پھر کچھ اضمحلال سے وہ بولی " اس کا سبب ہے اندر جیت کی گرفتاری۔" اور یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نمودار ہو گئے۔

" یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔؟" میں نے استعجاب سے پوچھا۔

وہ ساری کے پلو سے آنسو پونچھتی ہوئی بولی " اصل میں اندر جیت کو میں نے ہی چھپا رکھا تھا۔ میں نے اپنی ایک سہیلی کے ہاں اسے پناہ دے رکھی تھی۔ ابھی کوئی دو گھنٹے قبل ہی میری سہیلی نے آکر مجھے بتایا کہ

سی آئی ڈی والے اُسے پکڑ کر لے گئے ہیں۔"

یہ سن کر مجھ پر بھی سکتے کا عالم طاری ہونے لگا۔ طالب کی گفتگو سے تو میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اندر جیت قاتل نہیں ہے صحیح قاتل کوئی اور ہے جس کا آج طالب مجھے نام بتانے والا تھا۔ اور سرلا کی پرحوصلہ باتوں سے بھی مجھے یقین ہو چلا تھا کہ حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ اور میرے دل کو کچھ سکون ہونے سا لگا تھا کہ کبھی تو اس حقیقت سے نقاب اٹھے گا۔ صحیح بات آشکارا ہو کر رہے گی۔ مزید انکشاف کی توقع سے، میں نے تسلی بخش لہجے میں کہا۔

" کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کو نمائش کے رسٹورنٹ سے، پرچہ لکھ کر اندر جیت ہی نے بلوایا تھا؟"

سرلا بغیر کوئی جواب دیئے مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورنے لگی۔ اس کے زرد چہرے پر فکر و تشویش کے آثار پیدا ہو گئے۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ مجھے یہ راز کیسے معلوم ہو گیا۔ مبادا وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے میں نے جلدی سے کہا۔

" اندر جیت کی رہائی کے لئے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہوں سرلا تمہارے دل کے گوشے میں ہنوز اس کے لئے وہی عزت پا کر سچ جانو سرلا مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ تم اگر کوئی بات ......"

قطع کلام کر کے وہ ایک دم بولی "جی ہاں۔ اس دن اندر جیت کو میری کار کی ضرورت تھی۔ اور اسی نے مجھے پرچہ لکھ کر بلوایا تھا۔"

"تم نے اس پرچہ کو اچھی طرح ضائع تو کر ہی دیا ہو گا؟"

میرے اس سوال پر خوف زدہ سی ہو کر وہ بولی۔ "جی نہیں میں نے پرچہ کو یوں ہی مروڑ کر پھینک دیا تھا۔ اب کیا ہوگا پریم بابو؟ میرے اندر کو بچائیے۔" اور اب کی بار وہ ضبط نہ کر سکی اور کھسک کر رونے لگی۔

"اس طرح تو تم اپنی صحت بگاڑ لو گی سرلا۔ بھلا رونے دھونے سے بھی مشکل کہیں آسان ہوا کرتی ہے۔؟ ابھی ابھی تم نے بڑے حوصلہ سے کہا تھا کہ حقیقت پر چاہے کوئی کتنے ہی نقاب ڈالے وہ پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ اسی حوصلہ کو قائم رکھو۔ جب یہ صحیح ہے کہ اندر جیت قاتل نہیں ہے تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ بھگوان اس کی ضرور سہائتا کریں گے۔"

میرے اس دلاسے سے اسے کسی قدر اطمینان ہوا اور وہ پُر اُمید نگاہوں سے تصویر کے اس اندر جیت کو دیکھنے لگی۔ جو شوخی سے مسکرا رہا تھا۔ تصویر کی اس مسکراہٹ نے بھی اس موقع پر سرلا کے حوصلے کو استوار کرنے میں کافی مدد دی۔

کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور اس تصویر کو سرلا نے پھر لفافے میں ڈال کر سرہانے رکھ لیا۔ چائے کی کشتی لئے آیا اندر آئی۔ اور ایک چھوٹی تپائی پر کشتی رکھتی ہوئی سرلا سے کہنے لگی "اشوک بابو آئے ہیں۔ میں نے انہیں دیوان خانے میں بٹھا دیا ہے۔"

"ان سے کہدو" سرلا ہلکی آواز میں بولی "پتاجی گھر میں موجود نہیں ہیں۔ اور میں اس قابل نہیں ہوں کہ وہاں جا کر بات کر سکوں۔" اس کے لہجے سے بیزاری ٹپک رہی تھی۔

جُوں تُوں چائے کے گھونٹ میں نے حلق میں اتارے اور اٹھتا ہوا

بولا "اچھا سرلا تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ میں اب اجازت چاہتا ہوں۔ ایشور تمہاری آشاؤں کو سپھل کرے۔ جب تم پڑھنے کے قابل ہو جاؤ تو مجھے فون پر بتا دینا" اور میں کمرے سے نکل گیا۔

جب میں دیوان خانے سے باہر نکلا تو اشوک ماتھر کی کار پھاٹک سے باہر نکل رہی تھی۔ میرا یہ شبہ کہ اندرجیت ہی اشوک کے بھیس میں سرلا سے روابط قائم کئے ہوئے ہے مضحکہ خیز طور پر غلط ثابت ہو چکا تھا۔

سرلا کی کوٹھی سے نکل کر میں سیدھا طالب کے ہاں جا پہنچا۔ وہ پولیس والا ہی کیا جو وقت پر گھر مل جائے! ملازم نے بتایا کہ صبح کے گئے اب تک نہیں لوٹے۔ اندرجیت کی گرفتاری کی خبر نے مجھے کچھ پریشان کر دیا تھا۔ مگر اس دن طالب کے درشن ہی نہ ہو سکے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح سب سے پہلے میں نے اخبار پڑھا۔ پر یہاں سے وہاں تک سارے اخبار میں اندرجیت کی گرفتاری کا کہیں بھی ذکر نہیں تھا۔ میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ دوسری دفعہ میں اخبار کا جائزہ لے رہا تھا کہ سرلا کے پتا سیٹھ شیونارائن جی وندناتے ہوئے میرے دیوان خانے میں داخل ہوئے اور آتے ہی مجھ پر بے تحاشا برس پڑے۔

"پریم بابو آپ نے ہمیں زبردست فریب دیا ہے۔ میں آپ کو کبھی نہیں معاف کروں گا۔ آپ نے ہمارے بھولپن اور اچھائی کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ اس شیطان سی آئی ڈی کو پروفیسر بنا کر آپ میرے ہاں لائے اور اس نمک حرام نے جس برتن میں کھایا اسی میں چھید کر ڈالا۔ اس نے میرے ہونے والے داماد کو گرفتار کرا دیا۔ آپ نے مجھے تباہ کر دیا پریم بابو۔

کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔"

وہ بپھرے ہوئے شیر کی مانند گرج رہے تھے۔ دونوں ہاتھوں کو ہوا میں نچاتے ہوئے بلند آواز میں، بلکہ چیخ چیخ کر میرے دیوان خانے کو سر پر اٹھا رہے تھے۔ ان کے رویہ سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اب دیکھتے ہی دیکھتے وہ میرا گلا گھونٹ دیں گے۔ میں انہیں شانت کرنے کی فکر میں تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ کس طرح ان کا غصہ ٹھنڈا کروں پھر کسی خیال سے میں نے انہیں اخبار دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ شاید غلط خبر ہے سیٹھ جی۔ دیکھئے اس اخبار میں اس کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے۔"

"واقعی آپ غائب دماغ پروفیسر ہیں۔" وہ چیں بہ جبیں ہو کر بولے۔ "ابھی ابھی اس کے گرفتار ہونے کی خبر بھلا اس اخبار میں جو رات ہی چھپ چکا ہوگا۔ کیونکر مل سکتی ہے؟"

سیٹھ جی کے اس جملے نے مجھے اور بھی شش و پنج میں ڈال دیا۔ سرلا نے تو مجھے کل ہی بتا دیا تھا کہ پولس نے اندرجیت کو حراست میں لے لیا ہے۔ اور سیٹھ جی فرما رہے ہیں کہ اس کی گرفتاری ابھی ابھی عمل میں آئی ہے۔ جب میری سمجھ میں کچھ نہ آسکا تو میں نے ان سے وضاحت طلب لہجے میں پوچھا۔

"کس کی گرفتاری کا ذکر فرما رہے ہیں آپ؟"

وہ پھر آگ بگولہ ہو گئے "میرے ہونے والے داماد کی گرفتاری کا۔ اشوک کی گرفتاری۔ اشوک ماتھر کی۔ اب سمجھ میں آگیا سرکار کے؟"

"کیا اشوک ماتھر بھی گرفتار ہو گیا؟" میں نے سراسیمہ ہو کر کہا۔

"تو کیا اس سے پہلے بھی اور کوئی گرفتار ہو چکا تھا؟" سیٹھ جی نے منہ بگاڑ کر پوچھا۔

"جی ہاں - اندر جیت کو کل شام گرفتار کر لیا گیا" میں نے اسی شانتی سے کہا۔

"اندر جیت ....." سیٹھ جی نے حقارت سے کہا "اسے تو ایک عرصہ پہلے ہی گرفتار ہو جانا چاہیئے تھا۔"

میں نے مزید بحث میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہا۔ اُفتاں و خیزاں ان ہی کی کار میں سیٹھ جی کو ہمراہ لئے، اسی وقت کوتوالی جا پہنچا۔

کوتوالی کے احاطے میں جب ہم کار سے اُتر رہے تھے تو ہم نے دیکھا کہ ایک سب انسپکٹر طالب کے دفتر سے باہر نکلا اور پیچھے دو جوان اشوک کو ہتھکڑیاں لگائے باہر آئے اور ہمارے سامنے سے گذر گئے۔

"اشوک!" سیٹھ جی نے دہاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا۔ جیسے ان کے جوان بیٹے کی ارتھی جا رہی ہو۔ اشوک کا چہرہ بھی ارتھی کی لاش کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے ہماری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ اور سیٹھ جی تھے کہ چھاتی پیٹ پیٹ کر رو رہے تھے۔

"شانت ہوئیے سیٹھ جی۔ آئیے میرے ہمراہ۔ ہم ابھی اشوک کو ضمانت پر چھڑا لیں گے" میں نے تسکین بخش لہجے میں کہا۔ اور انھیں طالب کے دفتر کی طرف لے جانے لگا۔

"میں اس شیطان کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا" انھوں نے ننھے بچے کی طرح مچل کر کہا۔

لیکن بغیر طالب سے ملے اشوک کی ضمانت بھی تو نہیں ہو سکتی۔" میں نے انھیں سمجھانے کے انداز میں کہا۔ اور وہ میرے ہمراہ طوعاً و کرہاً طالب کے دفتر میں چلے آئے۔ وہاں طالب کے سامنے اندر جیت سر جھکائے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُسے دیکھ کر سیٹھ جی نے منہ بگاڑ کر نفرت کا اظہار فرمایا۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی طالب نے خیر مقدم کے لہجے میں کہا۔" آؤ پریم۔ آئیے سیٹھ صاحب۔" اور ہم اندر جیت سے ذرا فاصلہ والی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اندر جیت نے ہمیں دیکھ کر مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

میری گذارش پر طالب نے واقعات کا اظہار کیا۔ اس نے ہمیں کچھ اہم کاغذات بتائے۔ دو تین ماہ میں جو مواد اس نے بمبئی، جالندھر، دہلی اور ناگپور سے حاصل کیا تھا اور اشوک ماتھر کا اقبالی بیان بھی اس نے ہمیں پڑھ کر سنایا اور حقیقت پر پڑا ہوا ناپائیدار نقاب تار تار ہو گیا۔ ان سب کا اختصار یوں ہو سکتا ہے۔

پچھلے سال شہر یار بھیو کا جو قافلہ دکن کی سمت بڑھ رہا تھا، اسی میں اشوک ماتھر، سومناتھ اور اقبال چند بھی شامل تھے۔ اقبال چند چونکہ فلمی دنیا سے دلچسپی رکھتا تھا، بمبئی چلا گیا۔ اور اشوک ماتھر اور سومناتھ ریاست حیدر آباد کی طرف چلے گئے تھے۔ غرض ناگپور تک یہ تینوں ساتھ تھے۔ ناگپور میں اشوک ماتھر اور سومناتھ کو گاڑی بدلنی تھی۔ اپنا اسباب اسٹیشن پر حفاظت میں رکھ کر وہ دونوں سیر سپاٹا کرتے رہے۔ اس دوران میں وہ گہرے دوست بن چکے تھے۔ ان میں گاڑھی چھننے لگی تھی۔ سومناتھ کے مشورے پر ناگپور کی رنڈیوں کے کوٹھوں کی بھی انھوں نے سیر کی تھی۔ اشوک نے اپنی

ساری روداد سومناتھ کو سنائی تھی۔ اس کے پتا جی لاہور کے ہنگامے میں ہلاک ہوگئے تھے۔ جو حیدرآباد کے کروڑپتی سیٹھ شیو نارائن کے گہرے دوستوں میں سے ایک تھے۔ اشوک کی طفولیت کے دنوں میں سیٹھ جی نے اس کے پتا کو یقین دلایا تھا کہ وہ اپنی بیٹی سرلا کی شادی اشوک سے کردیں گے۔ انہیں سنہری سپنوں کی تعبیر پانے کے لئے اشوک ماتھر حیدرآباد کی سمت بڑھ رہا تھا۔ لیکن اس کی تکمیل کا وقت نہ آیا۔ اشوک ناگپور کے ایک کوٹھے پر ہی ہیضہ کا شکار ہوگیا۔ اب سومناتھ تنہا رہ گیا تھا۔ اس نے اشوک کے اسباب کو اپنا لیا۔ اور دکن کی طرف روانہ ہوگیا۔

سومناتھ کو سکندرآباد میں ایک فرنیچر کی دوکان الاٹ کی گئی تھی۔ وہ بڑا تنہائی پسند واقع ہوا تھا۔ ہردم کچھ کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ اس نے پوشیدہ طور سے سیٹھ شیو نارائن اور ان کی بیٹی سرلا کو بھی دیکھا۔ لیکن ان ہی دنوں ایک دوسری حسینہ نے اس کے دل پر قبضہ کرلیا۔ اور وہ کچھ عرصہ کے لئے سرلا کو بھول بیٹھا۔ اس دن وائی ڈبلیو سی اے میں رقص و موسیقی کا ایک عظیم الشان پروگرام تھا۔ اتفاق سے ایک پڑوسی واقف کار کے اصرار پر سومناتھ بھی وہاں جا پہنچا۔ اس جلسے میں خصوصاً اندرجیت کی بہن مالا کے رقص پر حاضرین عش عش کر اٹھے۔ سومناتھ پہلی ہی ملاقات میں مالا پر فریفتہ ہوگیا۔ اور آئے دن وہ اندرجیت اور مالا سے روابط بڑھاتا ہی گیا۔

معصوم مالا شروع ہی سے رقص و موسیقی کی دلدادہ تھی۔ لیکن فلمی دنیا میں شرکت کرنے کا جنون اصل میں اسی سومناتھ نے اس کے دماغ میں بھر دیا۔

تھا۔ وہ جب بھی مالا سے ملتا اس کے حسن اور رقص کی تعریف میں قصیدے پڑھنے لگتا۔ عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہے اپنی تعریف سُن کر جھوم جانا۔ سومناتھ سے اپنے حُسن اور آرٹ کی مدح سرائی سُن کر مالا مدہوش ہو اٹھی تھی۔ سومناتھ کے جادو کا زہر اس کی رگ رگ میں سرایت کرتا گیا۔ اور وہ فلم کمپنی میں شریک ہونے کے لئے بیقرار ہو اٹھی لیکن اس کے پتا اور بھائی نے اسے ایسا غلط قدم اٹھانے سے ہمیشہ باز رکھا۔ اسی خاندان میں ایک مرتبہ سرلا سے سومناتھ کی مڈبھیڑ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ وہ بمشکل سرلا کی نظروں سے بچتا ہوا وہاں سے کھسک گیا تھا۔ اس کے اس رویّہ کا راز آگے چل کر اس کے اقبالی بیان میں عیاں ہوتا ہے۔

ان دنوں وہ صرف مالا کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں لگا تھا۔ مالا کو رام کرنے کے لئے پھر اس نے انوکھا جال بچھایا۔ اقبال چند کو چٹھی لکھ کر بمبئی سے بلوالیا۔ اور کسی نئی تیار ہونے والی فلم میں ہیروئن کا رول دینے کا جھانسا دے کر اقبال چند مالا کو بمبئی لے چلنے پر راضی ہو گیا۔ مالا نے اپنے باپ اور بھائی کی نارضامندی اور ناراضگی کا ذکر بھی اقبال چند سے کر دیا تھا۔ اقبال چند اسے اغوا کرنے کا پروگرام بنانے لگا۔ یوں تو اقبال چند سومناتھ کے بنائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے یہاں آیا تھا۔ وہ ہوٹل میں ٹھیرا ہوا تھا۔ مالا بمبئی چلنے کو تیار ہو کر جب اس کے پاس پہنچی تو اس بہانے کہ ابھی اس کا تھوڑا کام سکندرآباد میں باقی رہ گیا ہے وہ فوراً بمبئی نہ جاسکا۔ اصل میں اقبال چند خود بھی مالا کا دم بھرنے لگا تھا۔ مالا اب گھر لوٹ جانا نہیں چاہتی تھی۔ اقبال چند نے مالا کو ساتھ لئے ہوٹل سے اٹھ کر سومناتھ کے ہاں ڈیرا ڈال دیا۔ سومناتھ نے ظاہرداریوں میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

تپا اور بھائی کو اطلاع دیئے بغیر اقبال چند کے ساتھ عازم بمبئی دیکھ کر وہ مالا کو بعض طعن کرنے لگا۔ دوست کی بہن ہونے کے ناطے وہ اُسے پند و نصائح کے ڈوز بھی پلانے لگا۔ اپنی طرف سے وہ اندر جیت کو منا لینے کا مالا کو یقین دلاتا رہا۔ اسی بہانے اس نے ظاہرا اقبال چند کو روکے رکھا اور دو تین دن گذار دیئے۔ ہر روز باہر سے آکر وہ کہتا کہ اندر جیت اور اس کے تپا جی بڑے غضبناک ہو رہے ہیں۔ اور وہ انہیں راضی کر لینے کی پوری جد و جہد کر رہا ہے۔ ان باتوں سے مالا اور بھی خوف زدہ ہونے لگی تھی۔ وہ اب کسی حال میں بھی گھر لوٹنا نہیں چاہتی تھی۔ ہر دفعہ اقبال چند سے استدعا کرتی کہ وہ اسے جلد سے جلد بمبئی لے چلے۔ اس دوران میں سومناتھ بڑے خطرناک منصوبے باندھتا رہا۔ گھر میں اس کی عدم موجودگی میں اقبال چند "ری ہرسل" کے بہانے مالا کو نچا نچا کر اس کے حسن اور اداؤں سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ مالا شباب کی اس منزل میں تھی جب عورت کے حسن کی دلفریبیاں پوری طرح ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ اس پر اس کا کمال رقص اور عشوہ گری غضب ڈھاتی تھیں۔ جن سے اقبال چند کی نیت ڈانواڈول ہونے لگی۔ اور ایک دن تو وہ زیادتی ہی کر گیا ہوتا۔ وہ تو یکایک سومناتھ غصہ سے بھرا ہوا اندر آگیا اور ناکام اقبال چند شرمندہ ہو کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

یوں تو سومناتھ ہر روز ہی اندر جیت سے ملا کرتا تھا۔ ظاہرا طور پر وہ بھی اندر جیت کے ساتھ مالا کی تلاش میں سرگرداں گھوما کرتا تھا۔ ایک شام وہ اندر جیت کے پاس گیا اور اس سے استدعا کی کہ وہ اپنی بے بی آسٹن

اسے دو چار گھنٹوں کے لئے دے دے۔ اس کے کچھ مہمان آج رات آرہے ہیں۔ گھر میں اتنی جگہ بھی نہیں کہ وہ انہیں ٹھہرا سکے۔ اس بہانے اس نے اندرجیت کے سکندرآباد سٹیشن کے عقب والے بنگلہ کی چابی بھی حاصل کرلی۔ اندرجیت اس وقت گاڑی میں کہیں جارہا تھا اس کے پتاجی نے بنگلے کے اوپر سے دیکھا کہ اندرجیت اور سومناتھ گاڑی میں کہیں جارہے ہیں۔ لبرٹی سینما کے پاس اندرجیت گاڑی سے اتر گیا۔ اور بس میں سوار ہوکر اپنے کام پر چلا گیا۔ کوئی آدھی رات اندرجیت کی گاڑی لے سومناتھ اپنے گھر گیا۔ گھٹا گھنگھور گھرآئی تھی۔ اور بقول سومناتھ شراب و شباب سے لطف اندوز ہونے کا سہانا وقت تھا۔ وہ جب گھر پہونچا تو اقبال چند سو چکا تھا۔ دوسرے کمرے میں مالا بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے آغوش میں جاچکی تھی۔ سومناتھ اپنے اس بھیانک پلان کو جس کی تعمیر میں اس کا دماغ کئی دنوں سے مصروف تھا عملی جامہ پہنانے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے اسی وقت ایک چٹھی اپنے لیٹر ہیڈ پر لکھی اور کمرے کی کھڑکی سے مالا کو جگا کر اُس کے ہاتھ میں تھمادی۔ مالا جلدی جلدی اس خط کو پڑھنے لگی۔ سومناتھ نے لکھا تھا۔

" اقبال چند میرا دوست سہی پر وہ ایک رذیل اور بدچلن آدمی ہے۔ تم میرے دوست اندرجیت کی مقدس امانت ہو میں نہیں چاہتا کہ تم اپنی عصمت اور آبرو کھو کر اس پیشہ کو اختیار کرو۔ آج کل فلمی اداکارہ کے معنی مہذب طوائف کے سوا کچھ نہیں ہوتے ہیں۔ میں نے اندرجیت اور تمہارے پتاجی سے تمہیں واپس لانے کے متعلق بات کی ہے۔ تمہیں دوبارہ گھر میں لینے سے قبل وہ

ریلوے اسٹیشن کے عقب والے اپنے بنگلے میں تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ باہر اندرجیت کی کار کھڑی ہے۔ میں تمہیں ان لوگوں کے سپرد کر کے دوستی کا فرض ادا کر دوں گا۔ اس طرح میں انسانیت کی لاج رکھنا چاہتا ہوں۔ تم فوراً چلو۔ یقین جانو وہ تم پر مطلق خفا نہیں ہوں گے۔ بلکہ بخوشی تمہیں قبول کریں گے۔"

اس چٹھی کو پڑھ کر مالا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ یہ گھر سے باہر گذارے ہوئے دو چار دن اسے دو چار سالوں کے برابر معلوم ہوئے۔ پدرانہ محبت اور خواہرانہ خلوص کی تشنگی سے وہ بلبلا اٹھی۔ چٹھی اپنے پرس میں ڈال جلدی سے وہ تیار ہو کر باہر آ گئی۔ اندرجیت کی "بے بی آسٹن" کو باہر کھڑی دیکھ کر اس کی بھیا اور پتا جی سے ملنے کی کشش اور شدید ہو گئی۔ وہ گاڑی میں جا بیٹھی۔ منٹوں ہی میں گاڑی منزل مقصود پر پہنچ گئی۔ بنگلے کا پھاٹک بند پا کر مالا کو کچھ اندیشہ ہوا۔ سومناتھ نے اتر کر پھاٹک کھولا۔ اور گاڑی اندر لے جا کر جب اس نے اسے اترنے کو کہا تو مالا کسی نامعلوم خوف سے لرز سی گئی۔ بچھڑے بھائی اور باپ سے ملنے کی خوشی کی ترنگ میں راستہ بھر جس بات کو وہ محسوس نہ کر سکی تھی، اب اس کے احساس سے ہیبت زدہ سی ہو اٹھی۔ سومناتھ کے منہ سے شراب کی بھبک آ رہی تھی۔...... لیکن ایک آس تھی کہ بنگلہ اپنا ہی ہے۔ بھیا اور پتا جی اندر ہوں گے۔ وہ اپنا پرس لئے موٹر سے چھلانگ لگا کر کود پڑی۔ اور اندر جانے لگی۔ ہر سمت تاریکی کا قبضہ تھا۔ وہ واپس پھرنا ہی چاہتی تھی کہ سومناتھ نے ایک کمرے میں

بتی روشن کرکے اسے وہاں بلا لیا۔ وہ ادھر کو لپکی۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ احتیاطی تدبیر کرتی سومناتھ ایک بڑا سا چاقو لیے اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ مالا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ زبان سے کوئی لفظ نہ پھوٹا۔ گھبراہٹ کی چیخ بھی نہ نکل سکی۔ پرس ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور وہ خود لرزتی کانپتی، ڈگمگاتی ایک دیوار سے چمٹ گئی۔ موت کو سامنے کھڑی دیکھ کر مالا کی گھگھی بندھ گئی تھی۔

جب اپنے وحشی ارادے کو پورا کرنے کے لیے سومناتھ اسے مجبور کرنے لگا تو مالا کا عضو عضو کانپنے لگا۔ وہ آنسو بہاتی ہوئی اس کے قدموں پر گر پڑی۔ اور گڑگڑانے لگی۔ کہ وہ اسے تباہ نہ کرے اور انسانیت کی لاج رکھتے ہوئے اسے اس کے بھیا اور پتاجی کے پاس پہنچا دے۔ اس نے فلم ایکٹریس بننے کا ارادہ یکلخت بدل دیا۔ اس نے خواہش ظاہر کی کہ اسے بزرگ باپ کی لاڈلی بیٹی اور مخلص بھائی کی مقدس بہن بننے کے لیے اس کے گھر پہنچا دیا جائے۔ اس نے اپنا دامن پسار کر رحم کی بھیک مانگی۔ لیکن اس وحشی درندے نے اسے تباہ کرکے ہی دم لیا۔ صرف اتنے ہی پر اس نے بس نہ کی۔ پھر اخفائے راز کے خوف سے وہ اُسے ہلاک کرنے پر تل گیا۔ مالا اس کے قدموں میں لوٹ گئی۔ اور جان کی امان مانگنے لگی۔ وہ اسے یقین دلانے لگی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے لبوں کو تالا لگا دے گی۔ اس بھید پر نقاب ڈالے رہے گی۔ کسی طرح اس کے بھیا اور پتاجی کے پاس وہ اسے پہنچا دے۔ لیکن موذی کو ذرا ترس نہ آیا اور اس نے چاقو سے اس کا پیٹ چاک کر ڈالا۔ بے بس نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔۔۔۔۔۔ نہ جانے آگے دن

ایسی کتنی مالائیں سر میں فلم ایکٹرس بننے کا سودا لئے فلم کمپنی کے دوارے پہنچنے سے قبل ہی اپنی عصمت و عفت اور سب کچھ کھو دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے ماں باپ بہنوں اور بھائیوں سے ملنے کی آرزو سینے میں دبائے اس طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیتی ہیں۔ اور ان کی ہلاکت پر آنسو بہانے والا کوئی نہیں ہوتا۔

مالا سے نپٹ کر جب سومناتھ بنگلے سے فرار ہو رہا تھا تو اسے ایک پولیس افسر دکھائی دیا۔ اس نے دانستہ طور پر گاڑی کی رفتار کچھ ہلکی کر دی تاکہ وہ افسر کار کا نمبر اطمینان سے نوٹ کر سکے۔ پھر تیزی سے گاڑی دوڑاتا ہوا وہ اپنے گھر آیا۔ اب اقبال چند ایک خطرناک نقطہ بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہا تھا۔ اسے خدشہ ہوا کہ اقبال چند ضرور بھانڈا پھوڑ دے گا۔ جب وہ گھر پہنچا تو غریب الوطن اقبال چند گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ سومناتھ ایک قتل کر کے ڈھیٹ بن چکا تھا۔ اس نے بلا کسی پس و پیش کے گلا گھونٹ کر اقبال چند کو ٹھنڈا کر دیا۔ ایک وحشت اس پر سوار تھی۔ پھر بے دردی سے اس کے چہرے کو مسخ کر ڈالا۔ اور لاش کو گاڑی میں ڈال ٹینک بند جا پہنچا۔ خود نیچے اتر کر اس نے کافی بلندی سے لاش سمیت گاڑی کو کھائی میں دھکیل دیا۔ اس سے قبل وہ اپنا منی بیگ اور کچھ ذاتی کاغذات اقبال چند کی جیب میں رکھنا نہیں بھولا تھا۔

یہ بھیانک سرد اور تاریک رات اندرجیت نے اپنی تحریر کی خوابگاہ میں گزاری تھی۔ تمام رات وہ سرلا کے پاس تھا۔ علی الصبح اندرجیت کے بوڑھے باپ نے سب سے پہلے سرلا کو فون کیا۔ واقفات سے یہ خبر سرلا نے کہہ دیا کہ اندرجیت یہاں نہیں ہے۔ پھر جب اسے بتایا گیا کہ مالا

اور سومناتھ کے قتل کا الزام اندر جیت پر لگایا جا رہا ہے، اور پولس اس کی تلاش میں ہے۔ تو وہ لرزہ بر اندام ہو گئی۔ اندر جیت کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ چونکہ وہ رات بھر گھر سے غائب رہا تھا۔ اور یہ ساری رات اس نے کہاں گذاری اس کا انکشاف کرنے کے موقف میں نہیں تھا۔ پھر دونوں ہی ناتجربہ کار تھے۔ اپنی محبوبہ کی لاج بچانے کے لئے، سرلا کی عزت کے تحفظ کی خاطر اندر جیت روپوش ہو گیا۔ اسکی اس فاش غلطی نے پولس کو یقین دلا دیا کہ قاتل اندر جیت ہی ہے۔

لیکن جب سی آئی ڈی کے ہاتھ میں یہ کیس گیا تو پانسہ ہی پلٹ گیا۔ اور پھر طالب جیسے سراغرساں کے بے مثال دماغ کی معجزانہ بہنچ نے واقعی معجزہ کر کے دکھایا۔ مالا کے قتل کا الزام اندر جیت پر لگایا گیا تھا، لیکن لاش کے ڈاکٹری معائنہ نے جب یہ انکشاف کیا کہ وحشی قاتل نے اس معصوم لڑکی کو کنوارپن سے بھی عاری کر دیا تھا، تو ایسی حالت میں اندر جیت کو قاتل تصور کر لینا صریحاً مضحکہ خیز حماقت تھی۔ تفتیش کی ایک ایک منزل طے ہونے لگی۔ اندر جیت کی کار کے حادثے میں جو لاش برآمد ہوئی تھی اس کا چہرہ اس قدر مسخ ہو چکا تھا کہ پہچانا نہ جاتا تھا۔ محض لاش کی جامہ تلاشی میں ملے ہوئے منی بیگ پر کے نام اور چند ذاتی کاغذات کی بنا پر اسے سوم ناتھ کی لاش سمجھ لیا گیا تھا۔ پھر طالب نے سومناتھ کے گھر کی تلاشی لی۔ اقبال چند کا سوٹ کیس بھی اس کے ہاتھ لگا۔ لاش کے جسم پر کے کپڑے اور اقبال چند کے سوٹ کیس میں کے کپڑوں کی لمبائی چوڑائی اور کٹ بیونت یکساں تھی۔ سومناتھ کی الماری میں ملے ہوئے کپڑوں میں اور لاش کے کپڑوں میں کوئی مشابہت نہیں تھی۔ لاش ایک قد آور

آدمی کی تھی۔ اور سوم ناتھ کی خانہ تلاشی میں ملے ہوئے کپڑے اس بات کی شہادت پیش کر رہے تھے کہ انہیں لاش سے کوئی مطلب نہیں۔ طالب نے بمبئی کا دورہ کیا اور اقبال چند کے دھوبی نے لاش کے کپڑے پہچان لئے۔ اس دھوبی کے نشان ان کپڑوں پر موجود تھے۔

پھر یکایک اشوک ماتھر کی حیدرآباد میں آمد نے سی آئی ڈی کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔ یہ معاملہ اب حد سے زیادہ پیچیدہ ہونے لگا تھا۔ اندرجیت کی روپوشی بھی ایک معمہ تھی۔ مصنوعی اشوک کمار کے پاس بی کام کی سند بھی موجود تھی۔ کچھ ایسے کاغذات بھی تھے کہ بزرگ شیو نارائن بھی فریب کھا گئے۔ انھوں نے تو محض سند اور چند دستاویزات دیکھ کر ہی اسے اپنے مرحوم دوست کا بیٹا تصور فرما لیا تھا۔ اور دوست سے کئے ہوئے عہد کو نبھانے کیلئے سرلا کی پسند کا انتظار کرنے لگے تھے۔ لیکن سرلا اپنے محبوب کو کیونکر فراموش کر سکتی تھی۔ اندرجیت اس کی سہیلی کے ہاں رہا کرتا تھا۔ اور وہ تقریباً ہر روز ہی اس سے ملا کرتی تھی۔ جس روز نمائش میں اندرجیت نے چٹھی لکھ کر کار حاصل کی تھی، اسی شب سی آئی ڈی نے اس کا ٹھکانا معلوم کر لیا تھا۔

اشوک ماتھر کی حیدرآباد میں آمد کے بعد طالب کو جالندھر اور دلی کے ریفیوجی کیمپوں کی خاک چھاننی پڑی۔ جہاں سے ہوتے ہوئے اشوک ماتھر اقبال چند اور سوم ناتھ دکن کی سمت روانہ ہوئے تھے۔ ناگپور سے اشوک ماتھر کے قضا کر جانے کا سرٹیفکٹ مل جانے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی۔ اور اس نقلی اشوک ماتھر کی گتھی کچھ کچھ سلجھنے لگی۔ اور سرلا کی

سالگرہ کی تقریب میں شامل ہو کر طالب نے بڑی آسانی سے اشوک ماتھر کے چہرے پر پڑے ہوئے مصنوعی نقاب کو تار تار کر ڈالا۔ اشوک ماتھر کے مرلا کو تحفہ میں پیش کئے ہوئے تاج محل پر کا بیل بڑا کارآمد ثابت ہوا۔ اس نے ساری قلعی کھول دی اور اصل حقیقت ظاہر ہو گئی۔ اس بیل کا رینڈرنگ بعینہٖ مالا کے پرس میں ملی ہوئی سومناتھ کی چٹھی کا سا تھا۔ اور اس چکر کی کل گھمانے والے مہاشے کا سراغ مل گیا۔

سالگرہ کے دوسرے ہی دن طالب نے مرلا کی سہیلی کے ہاں سے اندرجیت کو برآمد کر لیا اور اسے لئے گھومتا رہا۔ خفیہ طور سے اس نے اندرجیت کو اس کے نو وارد رقیب اشوک ماتھر کے بھی درشن کرا دیئے۔ اور اندرجیت نے پہچان لیا کہ وہ سومناتھ ہی ہے۔ اس کی دوستی کا دم بھرنے والا سومناتھ۔ معصوم مالا کا عاشق سومناتھ۔ دوستی اور انسانیت کی لاج رکھنے کا سوانگ رچانے والا درندہ قاتل سومناتھ!

پھر کیا تھا؟ دوسری ہی صبح سومناتھ کو ہتھکڑی لگا دی گئی۔ پہلے تو اس نے شور غوغا کیا کہ اس کا نام اشوک ماتھر ہے اپنی کام کی سند اور دستاویزات کا بھی حوالہ دینے لگا۔ اور اس نے اپنے ہونے والے سسر سیٹھ شیو نارائن جی کو ضمانت کیلئے طلب کیا۔ اسے پولس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے پر گھمنڈ تھا۔ وہ یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ اب کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ اسے یقین تھا کہ یہ کوئی مائی کا لال ثابت نہیں کر سکے گا کہ وہ سومناتھ ہے۔ لیکن جب طالب نے اندرجیت کو اس کے مقابل لا کھڑا کیا تو سومناتھ کی سٹی گم ہو گئی۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی جیسے یکایک فالج گر گیا ہو۔ پھر اس

نے ذرا بھی باز پرس نہ کی۔ نہ کوئی جرح کی۔ خاموشی سے ان کے ہمراہ کوتوالی چلا گیا اور اس کے ہونے والے شسر چھاتی پیٹتے رہ گئے۔

اور اب سومناتھ اقبال جرم کر چکا تھا۔ اپنی گرفتاری کا سبب اس نے اپنی قلیل سی غفلت شعاری ظاہر کی۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو چکا تھا کہ اندرجیت نے خودکشی کر لی ہوگی یا ریاست کی حدود پار کر گیا ہوگا۔ ورنہ اس نے اُسے بھی ٹھکانے لگا دینے میں دریغ نہ کیا ہوتا۔ اپنے بیان میں سومناتھ نے مستقبل قریب میں اٹھنے والے خطرناک قدم کے متعلق بھی صاف صاف لکھوا دینے کی ایمانداری برتی تھی۔ سرلا سے شادی ہو چکنے کے بعد سب سے پہلا مبارک کام جو وہ کرنے والا تھا، وہ تھا سیٹھ شیو نارائن جی کو ہلاک کرنا۔ لیکن اس تیسرے قتل کیلئے اس کے ہاتھ اُٹھنے سے قبل ہی جکڑ دیئے گئے تھے اور وہ اپنے صحیح مقام پر پہنچا دیا گیا تھا۔ اور تعجب کہ سیٹھ شیو نارائن جی اپنے ہونے والے قاتل کی رہائی کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ لیکن سی۔ آئی۔ ڈی تو عوام کی محافظ ہے۔ بھلا وہ ایک موذی درندے کو آزاد کیونکر چھوڑ دیتی؟ وہ اپنا فرض خوب سمجھتی ہے۔

یہ واقعات معلوم ہونے پر سیٹھ شیو نارائن کے تمام گلے شکوے دور ہو گئے۔ اور انھوں نے بے تحاشا آگے بڑھ کر "شیطان" کو چھاتی سے لگا لیا اور چھوٹے بچے کی طرح پیار کرنے لگے۔ اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی تھیں۔ انھوں نے میرا ہاتھ ہلکے سے دبایا لیکن بڑی دیر تک وہ مجھ سے بات نہ کر سکے۔ اور ان ہی آنسوؤں کی لڑیوں میں سے انھوں نے پھر اندرجیت کی طرف دیکھا۔ اب اُن کی نگاہوں میں بجائے نفرت

اور حقارت کے، مسکراہٹ اور پیار بھرا ہوا تھا۔ اور آنکھیں رنج و حسرت کے بجائے فرحت و شادمانی کے آنسو لنڈھا رہی تھیں۔

کہانی "ہیروئن" کے متعلق

محترمی:-

پی۔ من باسی کے افسانے "ہیروئن" (شمع دسمبر ۱۹۵۳ء) میں ملک کی اُن سینکڑوں سرپھری نوجوان لڑکیوں کی داستان جھلکتی ہے جو فلم ایکٹریس بننے کے شوق میں گھر سے بھاگ جاتی ہیں۔ اور پھر لالی کی طرح ذلیل ہوتی ہیں یا کسی قہوہ خانے کی کھلی آغوش میں پناہ پاتی ہیں......

"ہیروئن" اور اس جیسے دوسرے افسانے پیش کر کے آپ فلمی زندگی پر چڑھا ہوا ملمع اُتار رہے ہیں تاکہ اس کی کھوٹ ظاہر ہو جائے اور نوجوان لڑکیوں کی آنکھیں اس کی چمک سے خیرہ نہ ہو سکیں۔ (شمع دہلی فروری ۱۹۵۴ء) ایس۔ پی۔ بھاٹیہ (کانپور)

"سکے کے دو پہلو" کے بارے میں

من باسی جی!

شمع میں آپ کی کہانی "سکے کے دو پہلو" پڑھی۔ بہت متاثر ہوا۔ کتنا اچھا ہو اگر آپ اس کہانی کو ڈرامہ کے روپ میں بدل کر اسٹیج کرانے کے لئے پیش کر دیں۔

پی۔ بھٹ (نئی دہلی)

محبت کرو اور نباہ ہو تو پوچھوں!

"سکّے کے دو پہلو"

میں شامیانہ میں کرسیوں کی تیسری قطار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اگلی دو قطاروں میں چند نشستیں خالی چھوٹ گئی تھیں، اور پچھلی قطاروں میں ابھی مہمانوں کے آنے اور بیٹھنے کا سلسلہ شروع ہی تھا۔ یہ انیس فاطمہ کی سالگرہ کا جلسہ تھا۔ دکن کے گلستانِ ادب میں جو پھول کھل رہے ہیں، اُن میں اِس ننھّی کلی کا بھی شمار ہونے لگا تھا۔ یہ نوعمر ادیبہ ایک نوخیز افسانہ نگار تھی۔ مقامی ادبی رسائل میں تو انیسہ کی دو تین ہی کہانیاں چھپی تھیں، لیکن اپنے کالج میگزین میں وہ خوب لکھتی رہی تھی اور معاون مدیرہ کے فرائض بھی انجام دیتی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ انیسہ کا گھریلو ماحول نئی روشنی کا تھا یا دقیانوسی کلچر میں وہ پروان چڑھی تھی۔ بس میں اِس ننھّی ادیبہ سے اس قدر ہی واقف تھا کہ یہ کالج کمپنا ایک ہونہار مصنفہ ہے، اور آج نہیں تو کل ادبی دنیا اُس کا لوہا ماننے لگے گی۔ اور یہ بات بھی پروفیسر سنہا نے دورانِ تعارف میں مجھے بتائی تھی ــــ انیسہ سے پہلی مرتبہ میں سنہا جی کے ہاں ملا تھا۔ دوسری ملاقات انیسہ نے خود میرے مکان پر آکر مجھ سے کی تھی۔ اپنا ایک افسانہ اُس نے نظرِ ثانی کے لئے مجھے دیا تھا، جو مجھے بہت پسند آیا تھا۔

اور میں نے اُس کی خوب حوصلہ افزائی کی تھی۔ اور تیسری دفعہ وہ مجھ سے پرسوں ملی جبکہ اپنے جنم دِن کی تقریب میں شرکت کے لئے اُس نے مجھے دعوت نامہ دیا تھا۔ اور آج اس شامیانہ میں آکر بیٹھنے سے قبل میں انیسہ سے چوتھی مرتبہ ملا تھا۔ پھاٹک پر اُس نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا اور وہ مجھے شامیانہ تک پہنچانے آئی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اولین صف میں صوفہ پر بیٹھوں لیکن تیسری قطار میں پروفیسر سنہا کو براجمان دیکھ کر میں انہیں کے پاس بیٹھ گیا تھا اور انیسہ مسکراتی ہوئی، پھاٹک پر دوسرے مہمانوں کا استقبال کرنے لوٹ گئی تھی سنہا جی سے خیر و عافیت پوچھا ہوا پھاٹک پر دستیاب شدہ پروگرام کا پرچہ میں پڑھنے لگا۔

سامنے اسٹیج پر پردہ کھنچا ہوا تھا۔ اور پس پردہ سازوں کے ہلکے سُر اور گھنگروؤں کی جھنکار کی مدھر ترنگیں اُٹھ رہی تھیں۔ پروگرام کے مطابق جو گیت اور رقص پیش کئے جانے والے تھے یہ شاید اُن کی تمہید تھی میں پروگرام کے پرچہ پر نظریں دوڑانے لگا۔

اندرون شامیانہ

۱۔ قومی ترانہ —— سکول کی بچیاں۔
۲۔ گیت —— شاہد ہاشمی۔
۳۔ رقص —— کالج کی لڑکیاں۔
۴۔ تعارفی تقریر —— پروفیسر سنہا۔

۵- ضیافت — (طرز انگریزی)

۶- شکریہ — شاہد ہاشمی۔

پروگرام کی دوسری اور چھٹی مد پر میری نگاہ تیرنے لگی۔

(۲) گیت — شاہد ہاشمی اور (۶) شکریہ - شاہد ہاشمی

"شاہد ہاشمی"!

یُوں تو یہ نام بڑا میٹھا ہے۔ لیکن میری زبان کو یہ بڑا کڑوا اور کانوں کو از حد ترش معلوم ہوتا ہے۔ اس نام کو دہراتے ہوئے میری زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ اس نام کو سُن کر میرے کان جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔ اس نام پر نظر پڑتے ہی میری آنکھیں جلنے لگ جاتی ہیں اور میرا سر چکرانے لگتا ہے اس میں ذرا شک نہیں کہ شاہد ہاشمی، حیدرآباد کا ایک نامور شاعر ہے۔ اُس کے مدھر گیت ملک کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ جہاں کہیں بھی اس کا ذکر چھڑ جاتا ہے، لوگ بڑے احترام سے اُس کا نام لیتے ہیں، اور اس کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتے ہیں۔ لیکن اُس کے نام سے مجھے سخت نفرت ہے، کبھی نہ ختم ہونے والی نفرت!

پروگرام کا پرچہ تہہ کر کے میں نے جیب میں رکھ لیا۔ اور مسٹر سنہا سے مخاطب ہو کر بولا۔

"بھئی، آج تو ڈبل دعوت ہے۔ پیٹ بھر کر بھوجن کھائیں گے اور آپ کی مزیدار تقریر بھی سُنیں گے۔"

پروفیسر سنہا مسکرانے لگے اور بولے۔ "بھئی، البتہ ایک ہونہار

بچی ہے۔ وہ اور شاہد مُصر ہو گئے کہ اس ساعتِ سعید پر میں کوئی تقریر کروں۔ بس انکار نہ کر سکا۔"

سہاجی پھر ہنس پڑے۔ لیکن شاہد ہاشمی کا نام سُن کر میرے کانوں میں جیسے سوئیاں چبھنے لگیں۔

اِسی سمے انیسہ ایک لڑکی کو ساتھ لئے شامیانہ میں آئی۔ وہ جھک جھک کر اس لڑکی سے باتیں کر رہی تھی۔ اور وہ لڑکی آنکھوں پر ٹھنڈی عینک لگائے مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ اندر آرہی تھی۔ لیکن نو وارد لڑکی کی مسکراہٹ میں حزن و ملال کی حلاوت تھی اور اس کے چلنے کے ڈھب سے وہ کچھ بیمار سی دکھائی دے رہی تھی۔ میں ان دونوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ شاید انیسہ کی نہایت بے تکلف سہیلی تھی۔ میں نے اُسے ایک بار دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔

"انیتا!"

ہاں۔ انیتا ہی تھی وہ۔ اُس نے آنکھوں پر ٹھنڈی عینک لگا رکھی تھی۔ اس لئے میں اُسے فوراً نہ پہچان سکا۔ انیسہ نے اُسے پہلی قطار کے صوفہ پر بٹھایا اور خود بھی اس کے پاس بیٹھ گئی۔ گو میں تیسری قطار میں تھا پھر بھی مجھ میں اور ان دو لڑکیوں میں کوئی زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ اپنی نشست پر سے میں اُنھیں اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ مجھے انیتا کے بال رُوکھے نظر آرہے تھے۔ اُس نے معمولی قسم کی سفید ساری پہن رکھی تھی حالانکہ شامیانہ میں اس وقت جتنی بھی خواتین بیٹھی تھیں اُن سب کے ملبوسات کا ٹھاٹ باٹ دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں۔ پر انیتا کا اس سمے کا روپ

دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے میک اَپ میں ذرا بھی وقت صرف نہیں کیا ہوگا۔

اب دیکھیے نا اُسی کے پہلو میں بیٹھی ہوئی انیسہ کو، وہ تو اس وقت کسی موڈرن فلم کی فیشن ایبل ہیروئن بنی بیٹھی تھی ۔ میں اینیتا کی طرف پھر دیکھنے لگا۔ وہ آنکھوں سے ٹھنڈی عینک اُتارے بغیر پروگرام کا پرچہ پڑھتی ہوئی انیسہ سے ہولے ہولے کچھ پُوچھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ رنگت زرد پڑ چکی تھی۔

"یہ اینیتا اور وہ شاہد ہاشمی"!

دنیا میں اگر میں نے کسی سے نفرت کی ہے تو وہ یہی دو ہیں۔ اینیتا کی جانب سے میرے دل میں منافرت کا جذبہ پیدا کرنے کا سبب بھی یہی شاعر صاحب بنے تھے۔

اینیتا ۔ یہ وہی اینیتا ہے جس پر شاہد ہاشمی کے باعث قاتلانہ حملہ کرنے کے الزام میں میرے دوست ڈاکٹر راجو کو گرفتار کیا گیا تھا۔ اس پر اقدام قتل کا مقدمہ چلا، اور عدالت نے اُسے دس سال قید با مشقت کی سزا سنادی تھی۔ ابھی تو صرف ایک سال گذرا ہے۔ پورے نو سال اُس غریب کو کال کوٹھری میں کاٹنے ہیں۔

یہ وہی اینیتا ہے جس پر راجو نے جراحی کے ایک تیز نشتر سے حملہ کیا تھا۔ اُس نے ایک کاری ضرب لگائی تھی پر اُتنے ہی میں اینیتا خون میں نہائی گھر سے باہر بھاگ کھڑی ہوئی تھی اور راجو دیوانہ وار اول فول بکتا ہوا اس کے تعاقب میں دوڑا تھا۔ لیکن ہمسایہ والوں نے بیچ بچاؤ کر کے

انیتا کو بچا لیا تھا۔ اور راجو حوالات میں بند کر دیا گیا تھا۔

یہ واقعہ اُن دنوں پیش آیا تھا جب میں حیدرآباد سے باہر دورے پر گیا ہوا تھا۔ دورے سے واپسی پر مجھے چند دوستوں نے جب یہ خبر سنائی تو مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اخبارات کے کالم شہادت دے رہے تھے۔ راجو پر اقدام قتل کا مقدمہ چلایا جا رہا تھا اور اخبارات کو ایک نیا چٹپٹا موضوع مل گیا تھا۔ حیدرآباد کا یہ نوجوان شہرت یافتہ ڈاکٹر مقدمہ کی ہر پیشی پر ہتھکڑیاں پہنے، قاتل کی حیثیت سے مجرموں کے کٹہرے میں پیش کیا جاتا تھا اور اس روز عدالت میں ایسی بھیڑ ہوتی کہ تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی تھی۔

بیچارہ راجو!

مجھے وہ دن یاد آیا جب راجو نے پہلی مرتبہ مجھ سے انیتا کا ذکر کیا تھا۔

میری ڈاڑھ میں شدید درد ہو رہا تھا اور میں دوائی لینے راجو کی ڈسپنسری گیا تھا۔ راجو آپریشن تھیٹر میں اس قدر مصروف تھا کہ مجھے بڑی دیر تک اُس کے درشن ہی نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر مہدی نے، جو اُن دنوں راجو کے اسسٹنٹ کے فرائض انجام دیتے تھے، مجھ پر نظر پڑتے ہی مجھے اپنے پاس بُلا لیا تھا۔ دوائی وغیرہ سے نپٹنے کے بعد جب میں جانے لگا تھا تو راجو بھی آپریشن تھیٹر سے باہر نکل آیا اور تیزی سے میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"پریم! تجھ سے ذرا باتیں کرنی ہیں۔ تو دیوان خانہ میں میرا

انتظار کریں دس منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔ کھانا ساتھ کھائیں گے۔ بھاگ مت جانا۔" اس نے جلدی جلدی کہا اور پھر ڈاکٹر مہدی کو مجھے بنگلے میں پہنچانے کی ہدایت کر کے دوبارہ آپریشن تھیٹر میں چلا گیا۔

ڈاکٹر مہدی کام سے فارغ ہو چکے تھے۔ ہم دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے ڈاکٹر راجہ کے بنگلے میں جا پہنچے۔ ڈسپنسری ہی سے لگا ہوا راجو کا رہائشی بنگلہ تھا۔ دیوان خانہ میں پہنچنے پر ڈاکٹر مہدی بولے۔

"پریم بابو! میں بتاؤں ڈاکٹر راجو آپ سے کس سلسلہ میں بات کریں گے؟"

میں سوالیہ نگاہوں سے اُن کو دیکھنے لگا۔

وہ بولے "آج ایک پکھیرو ڈاکٹر کے ہتھے چڑھا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اماں پکھیرو نہیں سمجھتے۔" ڈاکٹر مہدی میری لاعلمی پر متعجب ہو کر بولے۔ "ایک حسین دوشیزہ نے آج ڈاکٹر پہ سحر کر دیا ہے۔" انھوں نے وضاحت کی۔

"اچھا!" میں نے کہا اور مزید انکشاف کی توقع میں ڈاکٹر مہدی کا مونہہ تکنے لگا۔ اور ڈاکٹر مہدی نے "حسین دوشیزہ کے سحر" کی یوں تشریح کی تھی۔

ڈاکٹر مہدی صبح مریضوں سے نبٹ رہے تھے کہ ایک خوبصورت لڑکی کے ورود نے ان کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیا۔ راجو اس وقت تک بنگلے ہی میں تھا۔ زنانہ اور مردانہ مریضوں کی علیحدہ علیحدہ لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ لڑکی بجائے قطار میں شریک ہونے کے ایک بینچ پہ خاموش بیٹھ رہی تھی۔ حالانکہ اُس کے بعد آئی ہوئی عورتیں قطار کی طوالت

بڑھاتی جا رہی تھیں۔ ڈاکٹر مہدی باری باری سے ایک مریض اور ایک مریضہ کو دیکھ کر جلدی جلدی نسخے لکھ رہے تھے۔ اس دوران میں بار بار اُن کی نگاہ اس نو وارد اجنبی لڑکی پر پڑ جایا کرتی تھی۔ آخر انہوں نے اُس لڑکی سے پوچھ ہی لیا۔

"آپ کیا چاہتی ہیں۔؟"

وہ ہلکی آواز میں بولی۔ "مجھے ڈاکٹر راجو سے ملنا ہے۔"

ڈاکٹر مہدی اپنا کام کرتے رہے۔ اور پھر جب راجو آیا تو بجائے اس کے کہ اس لڑکی کی طرف متوجہ ہوتا سیدھا اپنے دفتر میں جا بیٹھا۔ ڈاکٹر مہدی نے اندازہ لگایا کہ یہ لڑکی ڈاکٹر راجو سے غیر متعارف معلوم ہوتی ہے۔ وہ خود اگر اس وقت سُرخ مصری ٹوپی پہنے ہوئے نہ ہوتے تو ممکن تھا وہ لڑکی اُن ہی کو راجو سمجھ بیٹھی ہوتی۔ پھر انہوں نے اُس لڑکی کو یاد دِلایا کہ ڈاکٹر راجو تشریف لے آئے ہیں، اپنا کارڈ اندر بھجوا دو۔

اس لڑکی نے ایک پرچہ لکھ کر ڈاکٹر مہدی کو دیا۔ مہدی نے طائرانہ نظر پرچہ پر ڈال کر چپراسی کے ذریعہ پرچہ اندر بھجوا دیا۔ پرچے کا مضمون تھا۔

"میں آپ سے تنہائی میں ملنا چاہتی ہوں۔

انیتا۔"

اور چند ہی منٹوں میں چپراسی لڑکی کو اندر لے گیا۔

ڈاکٹر مہدی کام بھی کر رہے تھے اور راجو کے دروازہ پر نظریں بھی جمائے ہوئے تھے۔ کوئی پانچ منٹ بعد راجو اُس لڑکی کو ساتھ لئے بنگلے میں چلا گیا۔ پھر تقریباً ایک گھنٹہ بعد وہ لڑکی رخصت ہوئی تھی۔ اور راجو واپس

آیا تو "حسن چشتی" کا یہ شعر گنگناتا ہوا ۔

تری نگاہِ کرم ہے تو پھر کمی کیا ہے + تیرے نثار مجھے فکرِ زندگی کیا ہے

راجو کے اس غیر معمولی موڈ سے ڈاکٹر جعدی سمجھے کہ آج اس نے کوئی شکار پھانسا ہے۔ لیکن جہاں تک میرا خیال تھا میں اس نقطہ پر جعدی سے متفق نہیں ہوا۔ کیونکہ راجو کو میں ایک طویل مدت سے جانتا ہوں وہ لڑکیوں کو پھانسنے پھنسانے کے مرض میں ابھی مبتلا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس کے مزاج میں اس مرض کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اس کے برعکس وہ ایک بلند کردار کا مالک تھا۔

میں ابھی جعدی کی بات پر غور ہی کر رہا تھا کہ راجو ہاتھ میں اسٹیتھیکوپ (STETHOSCOPE) لئے

بہت بلند مقام حیات ہے ہمدم
زمانہ ساز نگاہوں کو آگہی کیا ہے (حسن چشتی)

ہلکی آواز میں گنگناتا ہوا آدھمکا۔ واقعی وہ حد درجہ مسرور نظر آرہا تھا۔ اُس نے آتے ہی سب سے پہلے جعدی کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ

"معاف کیجئے ڈاکٹر جعدی! ڈسپنسری میں مریضوں کی بھیڑ ہو رہی ہے اور بھئی، آج میں کام نہ کر سکوں گا، آپ مزید دو گھنٹے اوور ٹائم کیجئے"

اور جب جعدی جا چکا تو راجو کہنے لگا "یار پریم، آج میں تیری کہانیوں کا ہیرو بن گیا ہوں!

اور پھر اُس نے ایک ایک بات مجھے پوری تفصیل سے بتائی۔

میرا یہ معمول تھا کہ میں اپنا ہر افسانہ اشاعت سے قبل راجو کو سنایا کرتا تھا۔ بقول راجو، میری کہانیاں اس قدر جاذب توجہ ہوا کرتی تھیں

کہ وہ انہیں سن کر حد درجہ متاثر ہوا کرتا تھا۔ اپنی اکثر کہانیوں میں سماج کی شکار بھولی بھالی لڑکیوں کو میں نے سہارا دینے کی کوشش کی ہے ہیروئن معصوم دوشیزہ کسی آوارہ کی ہوس کاری کا شکار ہو گئی محض اپنی بے بسی کے کارن۔ اور پھر وہ بوالہوس اس ابلا کو فریب دیکر نو دو گیارہ ہو گیا۔ مظلوم لڑکی خودکشی کرنے نکلی کہ اتفاقاً افسانہ کے ہیرو سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ اور میرے مجسم ایثار دلیر ہیرو نے باوجود ہیروئن کی زندگی گناہ آلود ہونے کے اسے اپنا لیا اور اپنا جیون اس کے لئے وقف کر دیا۔ اس طرح ایک معصوم زندگی بچا لینے کا کارن بنا۔۔ راجو میری ان کہانیوں کے بلند حوصلہ ہیرو کی قربانی اور پیش قدمی سے کافی متاثر ہوا کرتا تھا۔۔ اور اس دن وہ خود میری نئی کہانی کا ہیرو بن گیا تھا۔

ڈاکٹر نندا جس حسین لڑکی کا ذکر فرما چکے تھے وہ میرے نئے افسانہ کی ہیروئن بنی تھی۔ راجو نے بتایا کہ وہ لڑکی میری افسانوی ہیروئن کی طرح بے وفا عاشق کے فریب کا شکار ہوئی تھی۔ لیکن قدرے سمجھدار واقع ہوئی تھی جو اس نے خودکشی کرنے کا ارادہ نہیں کیا بلکہ "عاشق جانباز" اسے حوالات سونپ گئے تھے اس بار کو ہلکا کرنے کے لئے وہ ڈاکٹر راجو کی ہمدردانہ اعانت حاصل کرنے آئی تھی۔ راجو نے اس کی روداد بڑے غور سے سنی۔۔ اس دوران میں اس کی آنکھوں میں میری افسانوی ہیروئن کی معصوم شکل گھوم گئی جس کی بے بسی سے وہ کافی متاثر ہوا۔ لگے ہاتھوں راجو کو ہیرو بننے کا شوق چرایا۔ اور جس نے اس لڑکی پر اپنا ارادہ ظاہر کر دیا۔ لڑکی پہلے تو حیران رہ گئی۔ بعد میں اس نے اظہار شرم کرتے ہوئے راجو کی تجویز مان لی۔

اور یہ انوکھی بات سن کر تو اس کی حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا کہ یہ غیر معمولی ہیرو، اپنی ہیروئن کے پیٹ میں پروان چڑھنے والے ناجائز بچے کو قبل از تولید ہلاک کرنے پر آمادہ تو ہوا ہی نہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ عوام کی نظروں میں وہ اُسے اپنا بچہ ظاہر کرنے پر مستعد ہو گیا۔

شامیانہ مہمانوں سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ سامنے کا پردہ اُٹھا اور میٹھے سُروں میں ننھی ننھی بچیاں، اپنی رس بھری آواز میں قومی ترانہ سنانے لگیں۔ میں احتراماً کھڑا تو ہو گیا لیکن میری نظر اسٹیج سے ہٹ کر مرجھائے ہوئے پھول سی انیتا پر جا ٹھہری اور میں اپنے ماضی میں کھو گیا۔

میری آنکھوں میں وہ دن پلٹ آیا جب انیتا اور راجو کا بیاہ ہوا تھا۔ انیتا کے حمل کا تیسرا مہینہ تھا۔۔ راجو کی سہاگ رات — اس شب دیجور کا واقعہ بس میرے افسانہ کے اس زندہ ہیرو راجو ہی سے سُنتے تو بہتر تھا۔ میں کیا بتاؤں ان ہیرو اور ہیروئن کے شبِ وصال کے بارے میں؟ وہ عیش کی راتیں، غریب راجو نے کیسے اضطراب میں کاٹیں، اس کا اندازہ صرف وہی کر سکتا ہے جس کی شادی کسی دائم المریض لڑکی سے کر دی گئی ہو، یا جس کی عروسہ سہاگ رات خطرے کی سرخ جھنڈی لئے نمودار ہو۔

خیر سے، راجو تو ڈاکٹر ہی تھا۔ حاملہ عورت کی نگہداشت کس طرح کی جائے وہ بہتر جانتا تھا۔ اس نے اس معاملہ میں پوری پوری خبرداری برتی۔ اُسے یقین تھا کہ شادی کے چھٹے ہی مہینے مسز راجو کو زچہ خانہ جانا پڑے گا۔ اور سماج کی نظروں میں یہ بات اس کے لئے ذلت کا باعث

ہو گی۔ اس ظاہرا تذلیل سے بچنے کے لئے راجو نے ایک اسکیم بنائی۔ اور ایک شب مجھے انیتا کے ساتھ گاڑی میں سوار کرا کے پونہ بھجوا دیا اور ہدایت کر دی کہ شادی کے دس ماہ بعد بچہ کی تولدی کا میں اُسے تار دُوں۔ اس عرصہ تک انیتا کے ساتھ پونہ ہی میں رہوں۔

ہمارے پونہ چلے جانے کے بعد راجو نے اس بات کی تشہیر کر دی کہ مسز راجو میکے گئی ہیں۔ پونہ میں "لیڈی ڈاکٹر وھڑ پڑے" کی زیرِ نگرانی مسز راجو کی زچگی ہوئی اور چار ماہ بعد ہم نے راجو کو بذریعہ تار اطلاع دی کہ "فرزند مبارک ہو"۔ راجو نے بھی ظاہرداریوں میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ اُس نے مٹھائیاں تقسیم کرائیں، چراغاں کرایا اور فرزند ارجمند کے لئے نام تجویز ہونے لگے۔ اس دوران میں، پونہ رہ کر جتنی کہانیاں میں نے لکھی تھیں، اُن میں سے ہر کہانی راجو کے ایثار و قربانی کا صحیح مرقع تھی۔ لیکن ہمارے نقادوں نے کھلم کھلا میری کہانیوں پر تنقیدی نشتر چلانے شروع کر دئے تھے۔ مثلاً ––– " ایسا بے غیرت ہیرو، کم از کم بھارت کی پوتر بھومی پر پیدا نہیں ہو سکتا۔ پریم بابو کو چاہیئے کہ وہ ہیرو ہیروئن کے نام انگریزی استعمال کیا کریں۔ اور اپنی ڈھکوسلا بازیوں میں ماحول بھی بیرون ہند کا پیش کیا کریں۔ ورنہ ایسی خلاف فطرت کہانیاں صاحب موصوف جیسے اُبھرتے ہوئے افسانہ نگار کی شہرت کو ٹھیس لگانے کا سبب بن جائیں گی ––" مجھے اپنے محسن نقادوں پر ہنسی آتی تھی۔ اُنہیں کیا پتہ تھا کہ میری ان کہانیوں کے ہیرو ہیروئن بقیدِ حیات ہیں۔ اُن کے نام بھارتی ہیں اور بھارت کی پوتر بھومی ہی پر وہ پیدا ہوئے اور بھارتی

تہذیب و تمدن میں پھلے پھولے ہیں اور بھارتی ماحول ہی میں سانس لے رہے ہیں۔

مسز راجو، اپنے نومولود بچے کو لئے راجو کے ساتھ حیدرآباد چلی گئیں اور میں نے کوئی پندرہ دن کے بعد پونہ کو خیرباد کہا۔ لیکن وہ بدنصیب طفلِ ناجائز بہت تھوڑی عمر لے کر آیا تھا۔ میں نے جس دن حیدرآباد میں قدم رکھا وہ فوت ہو چکا تھا۔

پھر مجھے وہ زمانہ یاد آیا جب انیتا اور راجو صحیح معنوں میں بیوی اور شوہر کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ انیتا دیوانہ وار راجو سے پیار کرتی تھی اور راجو بھی مجسّم محبت بنا ہوا تھا۔ اپنے افسانوں کے ان زندہ ہیرو ہیروئن کو دیکھ کر میں باغ باغ ہو جاتا تھا۔ بیچارے مہدی کو ڈسپنسری میں زیادہ ڈیوٹی دینی پڑنے لگی تھی۔ راجو تو بس اہم کیس دیکھا کرتا تھا۔ چند لمحوں کے لئے ڈسپنسری میں آتا جوں توں ایک آدھ آپریشن کیا اور بھاگا بنگلے میں روپوش ہو جاتا تھا۔ کبھی گنڈی پیٹھ کی پک نک ہوتی، کبھی نظام ساگر یا گولکنڈہ کی سیر کے پروگرام بنتے۔ کتھ حسین ساگر پر تو دونوں ہر شام تفریح کے لئے جاتے تھے۔ غرض انیتا کے ناز اٹھانے میں راجو کا وہ زمانہ بہت رہا تھا۔

پونہ کے میرے پچھلے قیام میں مہالکشمی سینے ٹون والوں نے میری ایک کہانی خرید لی تھی۔ اب انہوں نے اس کے مکالمے مجھ ہی سے لکھوانے ضروری سمجھے۔ اور مجھے پھر پونہ جانا پڑا اور مسلسل چھ ماہ تک میں پونہ میں رہا۔ جب میں پونہ گیا تھا تو راجو اور انیتا کو مسرت اور انبساط

کے گہوارے میں جھولتا ہوا چھوڑ گیا تھا۔ پر جس روز میں پونہ سے حیدرآباد واپس لوٹا تو معاملہ ہی دگرگوں تھا۔ بھلا میں ایکدم کیسے یقین کر لیتا؟ مجھے بتایا گیا کہ راجو پر اقدام قتل کا مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔

"ڈاکٹر راجو اور قتل۔!" غرض کے دو متضاد چیزوں کو یکجا کیا جا رہا تھا۔

"جی ہاں!" سنانے والے نے کہا۔ "اور وہ بھی اپنی بیوی کو قتل کرنے کا اقدام!!" راوی نے مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورتے ہوئے بتایا تھا۔

وہ ننھی ننھی کلیاں قومی ترانے کی خوشبو سے شامیانہ کو معطر کر کے چلی گئیں۔ سب کے ساتھ میں بھی اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اب اسٹیج پر ایک بھنورا بھنبھنانے لگا تھا۔

شاہد ہاشمی اپنی نظم سنا رہا تھا۔ جو اس نے انیس فاطمہ کی سالگرہ کے موقع پر ہدیۂ تہنیت کے طور پر لکھی تھی۔ وہ جھوم جھوم کر نظم سنا رہا تھا اور سارا شامیانہ ڈول رہا تھا۔ پروفیسر سنہا بھی شاہد کی آواز کے زیروبم پر اپنی انگلیوں سے کرسی کے ہتھے کو ٹھوک رہے تھے۔ میری نظر اگلی قطار والے صوفہ پر جا پڑی۔ وہاں انیسہ اور انیتا دونوں بھی گویا اس شاعر کے کلام جاویداں سے وجد میں آ رہی تھیں۔ لیکن وہ شاعر صاحب تھے کہ بس انیسہ ہی کو گھورے جا رہے تھے۔ ہاں! اب بیچاری انیتا میں رکھا ہی کیا تھا؟ وہ تو ایک خزاں آلودہ پودے کے مانند تھی۔ زرد

رنگت کی ایک دائم المریض لڑکی ــــ اور انیسہ تو اس کے مقابلے میں ایک نوخیز کلی کی مانند کھلنے والی پُرشباب چنچل دوشیزہ! جس پر شاعر صاحب نچھاور ہوئے جا رہے تھے۔ اپنی اس دفت پیہ نظم میں انہوں نے اس معصوم انیسہ کو تارے چاند سورج اور جانے کس کس سے تشبیہ دے ڈالی تھی۔ انیتا کا جیون تباہ کرکے وہ شاہد اب معصوم انیسہ کو اپنی محبوبہ بنائے ہوئے تھے۔ لیکن بھولا بھرے والی انیتا بھی اُن کا گیت سُن کر وجد میں آکر جھوم رہی تھی۔ دونوں لڑکیاں آپس میں ہونٹوں گالوں آنکھوں اور ہنستی ہوئی باتیں کرتی ہوئیں، اُس گستاخ شاعر کا حوصلہ بڑھا رہی تھیں گویا اس چمن زار میں ہر سو پھولوں کا انبار تھا۔ نام کو نہ خار تھا۔ فضا خلوص سے معمور تھی، رقابت کوسوں دُور تھی ــــ لیکن ..... لیکن ایک نیام میں یہ دو تلواریں ــــ!

شاہد ہاشمی نے نظم ختم کی اور تالیوں کی گونج میں اسٹیج سے اُتر گیا۔ پردہ گر پڑا۔ شاہد اسٹیج سے سیدھا اُن دونوں کے پاس آگیا۔ اُسے آتا دیکھ کر انیسہ اپنی نشست سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور شاہد صوفہ پر انیتا کے پاس بیٹھ گیا۔ انیسہ مسکراتی ہوئی اُن دونوں سے رخصت ہو کر شاید رقص کے انتظام کے لئے پردہ اُٹھا کر اسٹیج پر چلی گئی۔

جب تو تالیوں کی جھنکار ہی سے بجا اُٹھا تھا۔ اور اب شاہد ہاشمی کو انیتا کے پہلو میں بیٹھا دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ طبیعت چاہنے لگی کہ اب یہاں سے اُٹھ کر بھاگ جاؤں۔ اتنے میں پروفیسر

رسنہا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ بھلا آدمی کہہ رہا تھا۔

"پریم بابو! حد کر دی اس شاعر نے!! واقعی ملک شاہد ہاشمی پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔"

مجھے اور بھی غصہ آ گیا۔ ایک کڑوا گھونٹ نگل کر بولا۔

"بھئی واہ! کیا کہنے ۔۔"

میری آنکھیں پھر شاہد اور انیتا کو گھورنے لگیں۔

وہ لمبا تڑنگا، خوبرو نوجوان نہایت بے شرمی سے مسکراتا ہوا اس لڑکی سے باتیں کر رہا تھا۔ اور وہ بے حیا چھوکری بھی ۔۔

میرے دل میں ان دونوں کی جانب سے منافرت کا جذبہ اور بھی بڑھ گیا۔ ان ہی دو پاپیوں کے باعث میرا دوست راجو آج سنٹرل جیل میں پڑا اسڑ رہا تھا۔

مجھے وہ دن یاد آیا جب مقدمہ چلنے کے دوران میں راجو سے میں ملنے گیا تھا۔ بڑی کوشش اور تگ و دو کے بعد ملزم سے ملنے کی اجازت ملی تھی۔ مجھے اپنے مقابل کھڑا دیکھ کر راجو بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرج پڑا تھا۔

"میں نے اپنی بیوی کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ تم ہو، تمہارا ادب ہے۔ اس اقدام قتل کے جرم میں مجھے گرفتار کر لیا گیا ہے، مجھ پر مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ اور ممکن ہے مجھے پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ اس کا سبب تم ہو پریم ۔۔ تمہاری کہانیوں نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا۔ تمہارے لغو افسانے پڑھ پڑھ کر مجھ میں اس فاحشہ سے ہمدردی کا

جذبہ پیدا ہو گیا تھا اور اُسی جذبہ سے مغلوب ہو کر میں نے اس قطامہ کی مدد کی تھی، اُسے سہارا دیا تھا، اس سے شادی کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ تمہارا افسانوی ہیرو بن کر یہ ذلّت کا طوق پہن لیا تھا۔ میں نے اس برتن میں کھانے کی کوشش کی تھی، جسے کتّا پہلے ہی چاٹ چکا تھا۔ پھر دوبارا اس کتّے نے اس میں مونہہ ڈالا تو میں نے دیوانہ وار برتن ہی توڑ دینے کی کوشش کی۔ حیف کہ کتّا بھاگ کھڑا ہوا ـــــ کاش کہ دونوں ہی ختم ہو جاتے ـــــ"

زور کی گھنٹی بجی اور پردہ اُٹھ گیا۔ انیس فاطمہ کی تین حسین سہیلیاں اندر کے اکھاڑے کی اپسرائیں بنی رقص کرتی ہوئیں اسٹیج پر نمودار ہوئیں۔ لیکن میری طبیعت اب شامیانہ میں نہیں لگ رہی تھی، جہاں راجو کا بتایا ہوا کتّا پھر اُس برتن کو سونگھ رہا تھا۔ میرے بے گناہ دوست کی بدچلن بیوی کو وہ پاپی پہلو میں بٹھائے رقص سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میرے تصوّرات مجھے پھر ماضی میں گھسیٹ لے گئے۔

یہ وہی انیتا اور شاہد تھے جن کی بدکرداری کا تذکرہ راجو نے اُس ملاقات میں مجھ سے کیا تھا۔

میرے پونہ چلے جانے کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا کہ راجو کو اپنی پیاری بیوی پر شبہ ہونے لگا تھا۔ اور پھر اُس کی بے وفائی اور بدچلنی کے ثبوت مل گئے تھے۔ ایک دن انیتا اپنی کسی سہیلی کے ہاں گئی

ہوئی تھی اور کسی الماری کی کنجی کی تلاش میں راجہ انیتا کے کمرے کی چھان بین کر رہا تھا کہ ایک چھوٹے سے بکس سے چند محبت نامے اور ایک تصویر برآمد ہوئی۔ ایک نہایت وجیہہ شکیل نوجوان کی دلکش فوٹو تھی وہ۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔

"شاہد ہاشمی۔"

اسی شاہد نے وہ محبت نامے انگریزی میں انیتا کو لکھے تھے جن میں سے چند خطوں پر راجہ کی شادی کے بعد کی تاریخیں درج تھیں۔ اور شاہد ہاشمی کے ہر خط کی عبارت محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اپنے آخری خط میں ان شاعر صاحب نے رقم فرمایا تھا۔

"کسی دن جب تمہارے مکان میں کوئی نہ ہو مجھے پرچہ بھیج کر اطلاع دو۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔ یا اپنی کسی رازدار سہیلی کے ہاں ملنے کا انتظام کرو۔ تمہارے سر کی قسم اب تمہارے بغیر جینا دوبھر ہو رہا ہے۔"

ان پریم پتروں کو پڑھ کر راجہ غصہ میں دیوانہ ہو گیا۔ انیتا نے تو اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے ناقابلِ فراموش ایثار اور قابلِ صد احترام قربانی کی قدر کرے گی۔ اور بڑی معصومیت سے راجہ کو وہ یقین دلا چکی تھی کہ وہ اس قدیمی عاشق کو بھلا چکی ہے اور یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ آج کل کہاں ہے۔ مگر یہاں تو بیّن ثبوت موجود تھا کہ وہ سانپ کا بچہ اس فاحشہ سے ہنوز تعلق قائم کئے ہوئے ہے۔ گویا انیتا راجہ جیسے ایک اُلّو کو پھانس کر اپنا اُلّو سیدھا کر رہی تھی۔ اب راجہ ان دونوں کو

اکٹھے دیکھنے کی خاطر گھر سے باہر رہ کر انہیں موقعے دینے لگا۔ کبھی وہ انیتا سے کہہ دیتا کہ آج ایک اہم آپریشن کے لئے اُسے قریب کے موضع جانا ہے، وہ رات بھر وہیں رہے گا" کل صبح واپسی ہوگی۔ اور پوری رات بنگلے کے آس پاس چھپ کر گزار دیتا۔ اس طرح دو تین دفعہ اس نے جال بچھایا' لیکن بنگلے میں کوئی آتا جاتا دکھائی نہ دیا۔ یہ زمانہ راجو نے بڑے ہی کرب و اضطراب میں گزارا۔ البتہ اب وہ انیتا سے بدظن ہو چکا تھا اور مسلسل ٹوہ میں لگا ہوا تھا۔ اور پھر ایک شب اُسے زندہ ثبوت مل گیا......

اس دفعہ وہ بنگلے سے تھوڑے ہی فاصلہ پر دبکا بیٹھا تھا کہ نصف شب گذر جانے پر اس نے دیکھا' ایک نوجوان اُس کے بنگلے کے احاطہ کی دیوار کے پاس رکشے سے اترا اور رکشے والے کو رخصت کر کے بجلی کے کھمبے کے قریب آکر جیسے کچھ سوچنے لگا۔ وہ احتیاطاً چاروں سمت مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ بلدیہ کے قمقمہ کی مدھم روشنی میں بھی راجو نے اُسے پہچان لیا۔ وہ وہی نوجوان تھا جس کی دلکش تصویر' ان پریم پتروں کے ساتھ انیتا کے خاص تکیے میں پوشیدہ تھی۔ بالکل وہی لمبا تڑنگا شاہد ہاشمی!

راجو کا خون کھولنے لگا۔ پھر شاہد آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا راجو کے پھاٹک میں داخل ہو گیا۔ راجو اپنی ساری طاقت آنکھوں میں اکٹھی کر کے دیکھنے لگا۔ صدر دروازہ پر پہنچ کر شاہد نے ہلکے کنڈی کھٹکھٹائی۔ برآمدہ کا بلب روشن ہو گیا۔ اور دروازہ کھول کر انیتا نے بڑی خندہ پیشانی سے اس نوجوان کا استقبال کیا۔ وہ مجسم مسرت نظر

آرہی تھی۔ وہ نوجوان بھی مسکراتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ اور پھر دروازہ بند ہوگیا — اس سے زیادہ زندہ ثبوت اور کیا چاہیئے تھا؟ شوہر کی عدم موجودگی میں، نصف شب گذر جانے پر اپنے پرانے عاشق سے گلچھرے اُڑانے والی بے وفا ناگن کو اُس نے ختم کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ اور ایسے موقع کے لئے جیب میں چھپائے رکھا ہوا آپریشن کا تیز مہلک نشتر نکال کر راجو بنگلہ میں داخل ہوگیا۔ اُس نے صدر دروازہ کھٹکھٹایا — بڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور انیتا تنہا باہر نکلی۔ خلاف اُمید اپنے شوہر کو دروازہ پر پاکر بھونچکا سی رہ گئی۔ راجو نے بغیر کسی پس و پیش کے اس پر حملہ کر دیا۔ اُس نے اُسے کاری ضرب لگائی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ چیختی چلاتی گھر سے باہر بھاگ کھڑی ہوئی۔ راجو پر انتقام کا بھوت سوار تھا۔ وہ اُسے زندہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے تعاقب کیا۔ لیکن انیتا کی دلدوز چیخ و پکار سے ہمسایہ والے جاگ اُٹھے تھے۔ انھوں نے بیچ بچاؤ کرکے اُسے بچا لیا — اور آج بیچارہ راجو جیل میں چکی پیس رہا ہے۔ اور اس کی بدچلن بیوی چند دن اسپتال میں گذار کر بھلی چنگی ہوگئی اور اب موج اُڑا رہی ہے۔

راجو نے یہ زبردست غلطی کی تھی کہ عدالت میں اُس نے انیتا کے اقدامِ قتل کی وجہ افشا نہ کی تھی، اور نہ ہی اُس نے اپنے بچاؤ میں کچھ کہنا ضروری سمجھا تھا۔ اس نے صرف یہی بیان دیا تھا کہ "میں نے قتل کرنے کی نیت سے اپنی بیوی پر حملہ کیا تھا، آپ چاہیں تو مجھے پھانسی دے دیجئے —" اُس کے اِس ادھورے بیان سے انیتا اور شاہد کا معاشقہ طشت از بام نہ ہو سکا تھا۔ ورنہ کیا آج یہ دونوں، اس طرح

عام محفلوں میں پہلو بہ پہلو بیٹھ سکتے تھے۔

میری نظر پھر انیتا پر — اپنے افسانوں کی ہیروئن انیتا پر جا ٹھہری۔ لیکن یہ لڑکی میری کہانیوں کی ہیروئن کیوں کر ہوسکتی ہے؟ اس ناگن نے تو میرے ہیرو کو ڈس لیا تھا۔ میری ہیروئن تو بڑی نیک چلن اور نہایت معصوم ہوا کرتی ہے۔ جو ہیرو اُسے کیچڑ اور گندگی سے نکال کر سر چڑھاتا ہے، وہ اُس پر اپنی جان تک قربان کر دیتی ہے — اور یہ انیتا —!!

مجھے ایک قابل نقّاد کا خیال آگیا، جس نے میری کہانیوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا — "پریم بابو کی کہانیاں ہوائی قلعوں کے مترادف ہوتی ہیں۔ اُن میں زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کی بُو باس تک نہیں ہوتی۔ پریم بابو ہر پھول کو کنول سمجھتے ہیں۔ اُنہیں شائد پتہ ہی نہیں کہ پھولوں میں خاردار گلاب کا بھی شمار ہے۔"

کیا واقعی میری کہانیوں پر چلایا ہوا یہ تنقیدی نشتر واجبی تھا؟ میرا من ماننے کو تیار نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن یہ انیتا اور شاہد کی زندہ مثال جو میرے سامنے موجود تھی — پھولوں میں پوشیدہ کانٹا — ہریاول میں چھپا ہوا سانپ، جس نے میرے ہیرو کو ڈس لیا تھا۔ ذرا شک نہیں، یہ زرد رنگت کی چھوکری میری ادبی کارگذاریوں پر کلنک کا ٹیکا تھی۔

میں سوچ بچار میں کچھ ایسا غلطاں و پیچاں ہو گیا تھا کہ رقص کس وقت ختم ہوا مجھے محسوس ہی نہ ہوسکا۔ پروفیسر سنہا کے اسٹیج پر نمودار ہوتے ہی تالیوں نے شامیانہ سر پر اٹھا لیا۔ میں پھر سنہا جی کی تقریر سننے لگا۔

انہوں نے حاضرین سے انیس فاطمہ کا تعارف کراتے ہوئے اُس کے خاندانی حالات سنائیں، جنہیں میں پہلی ہی مرتبہ سُن رہا تھا۔

انیسہ پروفیسر سنہا کے ایک قدامت پرست امیر مسلم دوست کی اکلوتی دختر تھی۔ اس پر حد درجہ پابندیاں عائد ہونے کے باوجود اُس نے بی۔ اے تک تعلیم پائی۔ اُسے کسی سے ملنے جلنے تک کی اجازت نہ تھی۔ انیسہ کے خاندانی حالات پر مختصر تبصرہ کرنے کے بعد سنہاجی انیسہ اور شاہد ہاشمی کی دوستی پر مزاحیہ رنگ چڑھانے لگے۔ اُنہوں نے بیان کیا کہ ایک عرصہ سے شاہد ہاشمی کے گیت انیس فاطمہ کو پسند تھے۔ انیسہ اور شاہد کی محبت کا آغاز ان ہی گیتوں سے ہوا۔ پہلے انیسہ نے شاہد کے گیت گائے اور پھر وہ شاہد ہی کا راگ الاپنے لگی۔ ایک دن اچانک دونوں کی ملاقات ہوگئی اور وہ ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ اس کے بعد شاہد ہاشمی کے ہر گیت اور نظم میں انیس فاطمہ کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ آہستہ آہستہ اس دوستی پر محبت کی گل کاری ہوتی گئی۔ لیکن قدامت پرست خاندان کی دوشیزہ کے لئے اپنے محبوب سے ملنا ایک ٹیڑھا سوال تھا۔ آگے چل کر اُن کی محبت نے کاغذی جامہ زیب تن کر لیا اور ان میں سلسلۂ مراسلت جاری ہوگیا۔ خط و کتابت میں بھی بڑی احتیاط برتی جاتی تھی۔ شاہد بجائے اُردو کے انیسہ کو انگریزی میں خط لکھنے لگا۔ غریب انیسہ پھر اپنے محبوب کے خط گھر کے پتہ پر بھی نہ منگوا سکتی تھی۔ ایک رازدار سہیلی کے پتہ پر اس کی ڈاک آنے لگی۔ اور پریمی کے جانب سے آئے ہوئے پریم پتر بھی اسی سہیلی کے پاس محفوظ رہنے لگے۔

پھر سنہاجی نے فلسفۂ محبت اور عشق صادق کی تشریح کرنے کے بعد اپنی تقریر کے اختتام میں کہا۔

" بہر حال اب ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہو رہی ہے کہ انیس فاطمہ کا عشق صادق' کامیاب صورت میں منظر عام پر آ گیا ہے۔ اور آج وہ دکن کے مایۂ ناز شاعر شاہد ہاشمی کی رفیقۂ حیات ہیں۔"

تالیوں کی طویل جھنکار سنائی دی اور اس کے بعد ممکن ہے سنہاجی نے اور بھی کچھ فرمایا ہو لیکن میں تو یہ سن کر ہی حیران رہ گیا کہ انیسہ اس غنڈے شاعر کی بیوی بن چکی ہے۔ جس نے انیتا جیسی بیا ہیا لڑکی کا جیون تباہ کیا تھا۔ میرا دماغ متفرق خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔ اور میں کچھ ایسا کھو سا گیا تھا کہ مجھے اس وقت ہوش آیا جب سنہاجی میرے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے اور شامیانہ قریب قریب خالی ہو چکا تھا۔ مہمان بھوجن کے لئے کوٹھی کے ہال کی طرف لپک رہے تھے۔ سنہاجی میرا شانہ ہلا کر کہہ رہے تھے۔

" پریم بابو! شاید میری تقریر ہی سے آپ کا پیٹ بھر گیا ہے جو ابھی تک یہیں ڈٹے بیٹھے ہیں۔ اب کیا چل پان کا ارادہ نہیں ہے؟"

اور میں کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا اُن کے ساتھ ہو لیا۔ میرے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ قدم من من کے پڑ رہے تھے۔

دیوان خانہ کے صدر دروازے پر انیس فاطمہ اور شاہد ہاشمی نے مجھے اور سنہاجی کو اور مہمانوں کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انیسہ' شاہد کا مجھ سے تعارف کرانے لگی۔

"آپ سے ملیے۔ میرے رفیق زندگی شاہد ہاشمی!" پھر وہ میرا تعارف کراتی ہوئی بولی: "اور آپ ہیں پریم بابو، میرے پسندیدہ کہانی نویس جن کا میں آپ سے بارہا ذکر کر چکی ہوں۔" اور وہ شاہد پر اپنی شیریں مسکراہٹیں نچھاور کرنے لگی۔

"آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔" شاہد دوست نواز آنکھوں سے مجھے دیکھتا ہوا ہاتھ جوڑنے لگا۔

میں نے بھی رسماً نمستے کیا اور دیوان خانہ میں گھس پڑا۔

اس معصوم انیس فاطمہ کو کیا معلوم کہ یہ شاعر صاحب شادی سے پہلے ایک معصوم دوشیزہ کی زندگی تباہ کر چکے تھے۔ انھوں نے اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ بعد میں اُس کے آباد گھر کو اُجاڑا۔ اگر یہ بھید بھولی انیسہ پر عیاں ہو جائے تو ساری خوشی کڑواہٹ میں بدل جائے گی......

لیکن تعجب تھا کہ بے وقوف انیتا نے اپنی تباہی کا راز انیسہ سے کیوں چھپائے رکھا تھا۔ برعکس اس کے وہ ہنوز ان دونوں سے اب تک خلوص قائم کئے ہوئے تھی۔

دیوان خانہ میں انگریزی طرز پر کھانا چُنا گیا تھا۔ میزوں کی دو لمبی قطاریں لذیذ، پُرتکلف کھانوں سے مرصع تھیں۔ دو چار کرسیوں کے علاوہ ساری نشستیں گھر چکی تھیں۔ سنہا جی کے پاس میں آخیر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ کھانے چُنے ہوئے تھے، لیکن اس سے کوئی چیز میری طبیعت کو نہ بھائی۔ سنہا جی خوب ڈٹ کر کھاتے رہے۔ ساتھ ہی مجھے اصرار کرتے رہے۔ شاہد اور انیسہ نے بھی دو تین بار آ کر مجھے شکم سیر

ہو کر کھانے کی استدعا کی۔

تحفے تحائف کے پروگرام کے بعد شاہد ہاشمی نے مہمانوں کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا۔ اور تقریب برخاست ہوتے پر انیس فاطمہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئی۔ پروفیسر سنہا دیگر مہمانوں کے ساتھ رخصت ہو چکے تھے۔ لان پر کچھ کرسیاں ڈلوا کر شاہد اپنے چند بے تکلف دوستوں سے گپ شپ ہانک رہا تھا۔ انیسہ اپنے کمرے میں ایک صوفہ پر مجھے بٹھا کر "کالج میگزین" میں شائع شدہ اپنی کہانیوں کے تراشے مجھے دکھانے لگی۔ وہ اپنے افسانوں کے دو مجموعے شائع کرانا چاہتی تھی۔ اُس نے خواہش ظاہر کی کہ اس کے ایک مجموعہ پر مقدمہ میں لکھوں۔ انتساب کا صفحہ اس نے تراشوں کے ساتھ منسلک کر دیا تھا۔ میں اُسے غور سے پڑھنے لگا۔

"اپنی جان سے زیادہ پیاری سکھی انیتا کے نام ــــ"

"کیا انیتا جا چکی ــــ؟" میں نے مجموعہ کی ورق گردانی کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں! میری خواب گاہ میں لیٹی ہوئی ہے۔ کچھ طبیعت ناساز ہو گئی ہے اس کی۔" ایک جگہ اور انتساب کا صفحہ لگا ہوا تھا۔ اُسے دکھاتی ہوئی انیسہ بولی۔

"یہاں سے دوسرے مجموعہ کا آغاز ہوتا ہے۔"

میں وہ انتساب پڑھنے لگا۔

"میرے پسندیدہ شاعر شاہد ہاشمی کے نام ــــ"

یہ پڑھ کر میرے لبوں پر منافرت کی لہر نمودار ہو گئی، جو شائد انیسہ کی نظروں سے چھپ نہ سکی۔

"کیوں ــــ؟ کیا یہ انتساب کا رنگ آپ کو پسند نہیں؟" وہ پوچھ بیٹھی۔

"تم نے ان دونوں کو پھر اکٹھا کر دیا ۔۔" میری زبان سے نکل گیا۔
میرے اس بے معنی جملہ کو سن کر انیسہ میری صورت تکنے لگی۔ مجھے خیال ہوا اس موقع پر اس کی مسرت میں تلخی گھولنا بجا نہ ہوگا۔ کوئی وضاحت کرنے کے بجائے پھر بھی میں پوچھ بیٹھا۔

"کیا تم ان دونوں کی دوستی سے واقف ہو؟"

"ان دونوں کی دوستی ۔۔ کیا مطلب؟" وہ حیرانگی سے پوچھنے لگی۔
مجھے انیس فاطمہ کی معصومیت پر ترس آنے لگا۔ یہ پگلی شاید انیتا اور شاہد کے ناپاک تعلقات کے بارے میں مطلق نہیں جانتی۔ مجھے کرید ہوئی اور میں نے کہہ ہی ڈالا۔

"انیس! کیا تم یہ جانتی ہو کہ بیاہ سے قبل تمہاری اس سہیلی سے کچھ لغزش ہو گئی تھی۔؟"

"جی ہاں! میں جانتی ہوں۔ ایک امیر اوباش لڑکا اسے فریب دے گیا اور پھر اس بدمعاش نے اس سے طوطا چشمی اختیار کر لی تھی۔۔"

"اور تم سے یہ بھی پوشیدہ نہ ہوگا کہ راجو نے کتنی بڑی قربانی دی تھی" میں نے کہا اور انیسہ کی بڑی بڑی معصوم آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"جی ہاں! یہ بھی مجھے معلوم ہے۔۔"

"کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اس فریب کار اوباش لڑکے نے دوبارہ انیتا کی زندگی میں نہیں جھانکا۔؟"

"بالکل! اس بدکردار نے پھر کبھی اپنی سیاہ صورت نہیں دکھائی۔" انیسہ نے کہا اور میرا منہ تکنے لگی۔ اس کی لاعلمی اور معصومیت پر مجھے رحم آنے لگا۔

"کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ ڈاکٹر راجو نے انیتا پر قاتلانہ حملہ کیوں کیا تھا؟"

وہ ایک آہِ سرد کے ساتھ بولی۔ "کچھ نہ پوچھیے پریم بابو! واقعی انیتا بڑی بدنصیب واقع ہوئی ہے۔ اس کے شوہر نے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اسے بدچلن سمجھ لیا اور ختم کر دینا چاہا۔"

"غلط فہمی۔!" میں نے طنز سے کہا۔

"جی ہاں۔ صرف غلط فہمی" انیسہ نے اسی ڈھٹائی سے کہا اور اُس واردات پر روشنی ڈالنے لگی۔ "اُس دن ڈاکٹر صاحب کسی قرب و جوار کے موضع آپریشن کرنے گئے تھے۔ شاہد صاحب مجھ سے ملنے کو بے قرار ہو رہے تھے۔ میرے گھر کا ماحول کچھ ایسا تھا اور مجھ پر کچھ اس قدر پابندیاں تھیں کہ میں ظاہراطور پر یا اپنے گھر پر شاہد صاحب سے نہ مل سکتی تھی۔ اور یہ سب حالات انیتا پر خوب روشن تھے۔ ہم دونوں کے اضطراب کو بھانپ کر اُس نے شوہر کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھانا چاہا اور مجھے اور شاہد صاحب کو اطلاع دیدی۔ میں تو سرِ شام ہی انیتا کے بنگلہ پر پہنچ گئی تھی۔ ہمیں شاہد صاحب کا بڑی دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ وہ بڑی رات گئے آئے۔ اور اچانک اُسی وقت ڈاکٹر صاحب بھی لوٹ آئے۔ شاید اُنہوں نے شاہد صاحب کو کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ ان کی غیر موجودگی میں شاہد صاحب کو انیتا نے بلوایا تھا اور شاید یہی اس کا پرانا یار بھی ہے۔ بغیر کسی سوچ بچار کے اُنہوں نے انیتا پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ اس وقت کچھ ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ ہم معاملہ کو سمجھ ہی نہ سکے تھے۔ ان کے دروازہ کھٹکھٹاتے ہی میں اور شاہد صاحب عقبی دروازہ سے نکل گئے تھے۔ انیتا کو میری

بدنامی کا زیادہ خیال تھا، بلکہ اسی نے ہمیں بھاگ جانے پر مجبور کیا تھا۔"

انیس فاطمہ نے عجیب داستان سنائی اور میں سکتہ میں آگیا۔ لیکن میرے ترکش میں ابھی ایک تیر اور موجود تھا۔

"لیکن وہ شاہد کی ایک تصویر جو انیتا کے قبضے میں تھی، اور وہ محبت نامے جو اس نے انیتا کے نام لکھے تھے جنھیں ایک چھوٹے بکسے میں وہ محفوظ رکھا کرتی تھی.... ان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔" میں نے انیسہ کو قائل کرنے کے لئے دوسرا تیر بھی استعمال کر ڈالا۔ کیونکہ یہی چیزیں تھیں جنہوں نے غریب راجو کو انیتا سے بدگمان کر دیا تھا۔

انیسہ قدرے مسکراتی ہوئی بولی۔ "پروفیسر منہاجی نے، اپنی مختصر سی تقریر میں ہماری محبت کے متعلق جو ارشاد فرمایا وہ شاید آپ نے غور سے نہیں سنا!"

میں انیسہ کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔

کچھ تامل کے بعد وہ بولی "ٹھیرئیے میں دو منٹ میں آتی ہوں۔"

اور وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں منہاجی کی اس چٹ پٹی تقریر پر غور کرنے لگا۔ ہاں انھوں نے "پریم پتروں" کا کچھ ذکر تو کیا تھا۔ لیکن انیتا کو لکھے ہوئے پریم پتروں کا انیسہ سے کیا تعلق؟ میں اسی خیال میں ٹہلتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔ شاہد ہاشمی کے دوست جا چکے تھے۔ لان پر ساری کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ غور و فکر کرتا ہوا میں وہیں برآمدہ میں ٹہلنے لگا۔ ملحقہ کمرے کے دروازہ پر دلفریب ریشمی پردہ پڑا ہوا تھا۔ نہ جانے میرے قدم اس پردے کے پاس کیوں رک گئے۔ مجھے سنائی دیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے انیتا بہن ــــ؟"

"ٹھیک ہوں شاہد بھیا۔ آپ مجھے تانگہ منگوا دیجئے میں اب جانا چاہتی ہوں۔۔"

"سچ جانو بہن، مجھے بڑا دُکھ ہوتا ہے تمہیں اس حالت میں دیکھ کر۔"

"چنتا نہ کرو بھیا، ایشور والی ہے ــ۔"

مجھے برآمدہ میں قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں پھر انیسہ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اور چند ہی لمحوں میں انیسہ ایک خوبصورت صندوقچی لئے اندر آ گئی۔ وہ میرے پاس ہی صوفہ پر آ بیٹھی اور اُس نے اس صندوقچی کے سارے خطوط میرے سامنے بکھیر دئے۔ اُن خطوں میں شاعر، شاہد ہاشمی کی ایک دلکش تصویر بھی تھی۔ میں نے ایک ایک چٹھی دیکھی۔ یہ وہی پریم پتر تھے جنہوں نے ڈاکٹر راجہ کو انیتا سے بدظن کر دیا تھا۔ ہر خط انگریزی میں شاہد نے اپنی دلنواز محبوبہ انیسہ کو لکھا تھا۔ ہر چٹھی کا آغاز Darling Aneesa ڈارلنگ انیسہ سے ہوتا تھا۔ میرا بھولا دوست راجو جس کی آنکھوں پر اُس وقت شبہات کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ Darling Aneesa ڈارلنگ انیسہ کو بھی Darling Aneeta (ڈارلنگ انیتا) ہی پڑھ گیا۔

میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ گویا میرے ترکش کے سارے تیر میرے ہی دماغ میں پیوست ہو گئے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ روح تلملا اٹھی۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ انیسہ شاید اپنی صندوقچی لئے جا چکی تھی۔ اسی وقت شاہد ہاشمی اور انیتا اندر آ گئے۔

"میں جا رہی ہوں انیس!" انیتا نے ہلکی آواز میں کہا اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی بولی "اوہ، پریم بابو! آپ ...." اور میرے قریب آ گئی۔

میں احتراماً صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بیزاری جسے میں کبھی نہ ختم ہونے والی نفرت سے تعبیر کرتا تھا بالکل مٹ چکی تھی۔ میری آنکھیں بے بسی کے آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔

"تشریف رکھئے" میرے سامنے کے صوفہ پر انیتا بیٹھتی ہوئی بولی "بہت دنوں بعد آپ کے درشن ہوئے پریم بابو" گلوگیر آواز میں اس نے کہا۔ اُس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر نور برس رہا تھا۔ ہاتھ میں کا پیاں اور ٹھنڈی عینک اُس نے پاس ہی صوفے پر رکھ دی تھیں۔ میں نے شاہد ہاشمی کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور انیتا سے کہنے لگا۔

"ہاں بھابی! آپ تو جانتی ہی ہیں۔ پونہ کے مہا لکشمی سینے ٹون والوں نے میری ایک کہانی فلمانے کے لئے لی تھی۔ اسی سلسلے میں طویل عرصہ تک مجھے پونہ ہی میں رہنا پڑا۔"

اب انیس فاطمہ بھی واپس آ گئی تھی۔ اُسے دیکھتی ہوئی انیتا بولی۔ "اچھا اب اجازت چاہتی ہوں" پھر صوفہ سے اُٹھتی ہوئی مجھ سے کہنے لگی۔ "کسی دن آئیے گا پریم بابو! آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

"تانگہ آ گیا ہے۔" ملازم نے آکر اطلاع دی۔

"اچھا!" انیتا سب کو ہاتھ جوڑتی ہوئی بولی۔

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اگر آپ کا کوئی ہرج نہ ہو تو میں آپ کو گھر تک چھوڑ دوں۔"

"مجھے بڑی مسرت ہوگی" زیر لب مسکراتی ہوئی انیتا ہلکی آواز میں بولی۔

مقدمہ لکھنے کی غرض سے افسانوں کا ایک مجموعہ ساتھ لیے' میں اُن دو محبت کے متوالوں سے رخصت ہوا اور انیتا بھابی کے ہمراہ تانگہ میں سوار ہوگیا۔

ان کے بنگلے کے احاطہ میں جب تانگہ رُکا تو کرایہ ادا کرنے کی غرض سے انیتا نے پرس سے دس کا نوٹ نکال کر تانگے والے کی طرف بڑھا دیا۔

"ریزگاری نہیں ہے میم صاحب" تانگہ والا عاجزی سے بولا "آپ ٹوٹے بارہ آنے ہی دے دیجئے۔"

میں نے اپنی جیب ٹٹولی۔ ایک روپیہ کا نوٹ نکل آیا جو میں نے تانگے والے کو دے دیا۔ اُس نے اپنی میلی کچیلی جیب سے ایک چونی نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔

میں اُس چونی کو دیکھتے ہوئے انیتا بھابی کے ساتھ بنگلے میں داخل ہوگیا۔

سکۂ عثمانیہ کی چونی!

اس چونی کے ایک پہلو پر دکن کی عظیم الشان عمارت "چار مینار" کی تصویر بنی ہوئی تھی اور دوسرے پہلو پر صرف "چار آنے" لکھا ہوا تھا۔ میں اس سکہ کو ہیر پھیر کو دیکھنے لگا۔ اور میرا دماغ خیالات کی عجیب و غریب پگڈنڈیوں سے گذرنے لگا۔

ایک پہلو پر صرف "چار آنے" اور دوسرے پہلو پر دو پریمیوں کی پریم یادگار' ہزاروں روپے کی عالیشان عمارت "چار مینار"!

میرے من نے کہا۔

ایک رخ، راجو کا معمولی سا شبہ، محض غلط فہمی —— اور دوسرے رخ، دس سال قید با مشقت، معصوم انیتا کا کاٹے نہ کٹنے والا پہاڑ سا جیون...... سکے کے دو پہلو —— !!!

بی من باسی کی دیگر کتابیں

بارہ دری	(ناول)	.. .. ..	قیمت فی جلد تین روپے
گنڈیریاں	(")	.. .. "	چار روپے
پسند اپنی اپنی	(")	.. .. "	تین روپے
زیب و زینت	(")	.. .. "	ڈھائی روپے
کیچڑ میں	(")	.. .. "	دو روپے
بد ہضمی	(")	.. .. "	چار روپے
مجبوبۂ دلنشیں	(")	.. .. "	پانچ روپے

شرو ساہتہ سدن ۲-۲-۳۷۲ سلطان بازار
حیدرآباد دکن-۱